20 عادتیں
جو آپ کو فربہ بناتی ہیں

کیوں کراتے ہو
میری شادی؟
طنز و مزاح سے بھرپور

جون 2013ء

اُردو ڈائجسٹ

/urdudigest.pk

82000
عورتوں کی زندگی
کیسے بدل کر
رکھ دی؟

تبدیلی کی تڑپ رکھنے والے نوجوانوں کیلئے رول ماڈل

روشانے ظفر

مزید اس شمارے میں

ہیڈ کانسٹیبل کا بیٹا انڈر ورلڈ کا بے تاج بادشاہ کیسے بنا؟

وزیر بننے کیلئے کسی نے کروڑ تو کسی نے دو کروڑ کی آفر کی
نگران وزیراعلیٰ بلوچستان کا انکشاف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

مہر خوشی سے دو

اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے ڈالو۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ تم کو چھوڑ دیں تو اسے ذوق وشوق سے کھاؤO (النساء:4:4)

تو جن عورتوں سے تم فائدہ حاصل کرو ان کا مہر جو مقرر کیا ہوا ادا کر دو اور اگر مقرر کرنے کے بعد آپس کی رضامندی سے مہر میں کمی بیشی کر لو تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہےO (النساء:4:24)

رسول ﷺ کا فرمان

مہر حسب توفیق مقرر کیا جائے

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ سے ایک صحابی نے عرض کیا کہ میں فلاں عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارے پاس (مہر دینے کے لیے) کچھ ہے؟'' اس نے عرض کیا: بخدا یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے گھر میں جا کر دیکھو خواہ لوہے کی انگوٹھی ہی مل جائے۔'' وہ گھر گیا اور واپس آ کر کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ لوہے کی انگوٹھی بھی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا اس قرآن کے عوض جو تمھیں یاد ہے (اور جو نکاح کے بعد تم اسے سکھاؤ گے) میں تمھیں اس سے نکاح کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔''

(صحیح بخاری کتاب 66۔ باب 22: مسلم کتاب النکاح۔ باب 12)

اُردو ڈائجسٹ

www.urdudigest.pk

جون 2013ء
رجب المرجب 1434ھ
جلد نمبر 53 شمارہ نمبر 6

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
مینیجنگ ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر: اختر عباس editor@urdu-digest.com
مجلسِ تحریر: حافظ افروغ حسن ، سید عاصم محمود ، صغیرہ بانو شیریں
نوید اسلام صدیقی، سلمٰی اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
تخلیق و تزئین: محمد شبیر، رائعہ رضا کمپوزر: اشرف سکندر
پروف خواں: کلیم اللہ فاروقی معاونین: غلام سجاد، حنا انور

مارکیٹنگ / اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ	ذکی اعجاز قریشی	0300-8460093
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ	احمد فیاض	0324 4255178
لاہور	ندیم حامد	0300-4242620
گجرات / گوجرانوالہ	احسان اللہ بٹ	0300-9620294

سالانہ خریداری

خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے

subscription@urdu-digest.com فون: +92-42-37589957

اردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

330 روپے کی شاندار بچت کے ساتھ

پاکستان 1080 کے بجائے 750 روپے میں

بیرونِ ملک 50 امریکی ڈالر

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731

قیمت 90 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے جسارت پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

تبدیلی کیسے آئے؟

الیکشن کا مرحلہ تو ختم ہوگیا۔ ان انتخابات میں عوام نے اپنے ووٹ کے ذریعے تمام جماعتوں اور راہنماؤں کو واضح پیغام پہنچا دیا ہے کہ عوام خصوصاً پڑھے لکھے اور باشعور افراد جاگ رہے ہیں اور تبدیلی کے عمل کا بخوبی جائزہ لے رہے ہیں۔ نہ تو انھیں مزید بیوقوف بنایا جاسکتا ہے، نہ ہی وہ زیادہ دیر تک تبدیلی کے عمل کے شروع ہونے کا انتظار کریں گے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو انتہائی تیزی مگر حکمت سے مسائل کو حل کرنا ہوگا۔ لیکن........!

کیا ہم عوام خصوصاً تعلیم یافتہ افراد کی ذمہ داری صرف ووٹ ڈالنے کی حد تک تھی؟ اس دفعہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں نے بھی وطنِ عزیز میں تبدیلی کے لئے فنڈ ریزنگ کی اور بہت سے ڈاکٹرز، انجینئرز اور کاروباری افراد تو اپنا قیمتی وقت اور سرمایہ لگا کر وطنِ عزیز پہنچے اور اپنی پسندیدہ جماعتوں کی انتخابی مہم میں کئی ہفتوں تک بھرپور شرکت کی لیکن کیا اب عوام کی ذمہ داری صرف اور صرف منتخب حکومتوں کی کارکردگی پر نگاہ رکھنا، تنقید کرنا اور لاحاصل بحث و مباحثہ میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا ہے اور اگر خدانخواستہ چند ماہ بعد مرضی کے نتائج ظاہر نہ ہوئے تو احتجاج، ٹائر جلانا، سڑکیں بلاک کرنا اور جلسے جلسوں میں شامل ہوکر پھر نئے انتخابات یا فوج کو دعوت دینا ہی ہماری منزل ہے؟

جو جذبہ میں نے 11 مئی کے دن پولنگ اسٹیشنز پر دیکھا بلکہ دنیا نے دیکھا، اُسی جذبے سے اپنے اختلافات بھلا کر اب ایک قوم بن کر دکھانا ہوگا اور اپنے اپنے حصہ کی شمع جلانا ہوگی۔ مسائل اتنے گھمبیر ہیں جو صرف اور صرف تعلیم اور فنی صلاحیتوں میں اضافے پر توجہ دینے سے ہی حل ہوں گے۔ تعلیم کے لیے گھر گھر، گلی گلی اور فیکٹری فیکٹری مہم چلانا ہوگی۔ اپنے آس پاس کے افراد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا اور انھیں ہنرمند بنانا ہوگا۔ شہریوں کو اپنے ذمہ واجب الادا ٹیکس پوری دیانت داری سے ادا کرنا ہوگا تبھی ہم حکومتوں کو جواب دہ ٹھہرا سکتے ہیں۔ اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ رب کائنات نے پاکستان کو ان گنت نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ ان میں دنیا کی زرخیز ترین زمین، بہترین موسم، پھل، فصلیں اور قابل ترین افراد جس میں انجینئرز، ڈاکٹرز اور سائنس دان سب شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ترک دوستوں کے مطابق پاکستان میں ترکی سے تین گنا زیادہ ترقی کا پوٹینشل موجود ہے۔ ترکی کی برآمدات 155 ارب ڈالر اور ہماری 25 ارب ڈالر ہیں جو کہ 465 ارب ڈالر ہونی چاہئیں۔

چاروں صوبوں خصوصاً خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے کئی شہروں میں اللہ کے فضل و کرم سے ہمارے باغات میں لاکھوں ٹنوں کے حساب سے لذیذ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ ایک منصوبے کے تحت اگر ان باغات کی مناسب دیکھ بھال، کولڈ چین کی فراہمی جدید پیکنگ ہاؤسز کا قیام اور ایگری بیس صنعتوں کا قیام عمل میں لایا جائے تو نہ صرف چند ماہ کی قلیل مدت میں لاکھوں لوگوں کو روزگار ملے گا بلکہ ملک کی برآمدات میں چند ماہ کی قلیل مدت میں کئی گنا اضافہ بھی ممکن بنایا جاسکتا ہے۔

لاکھوں نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنا یقیناً حکومت کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ بیروزگار نوجوانوں کو صرف قرضہ جات کی فراہمی سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ بلکہ نجی شعبہ کے کامیاب اور پورا ٹیکس ادا کرنے والے افراد اور بیرونِ ملک اچھی شہرت رکھنے والی کاروباری شخصیات اور OPEN (Organization of Pakistani Entrepreneurs of North America) جیسی تنظیموں کی مدد سے یہ کام بڑے احسن انداز سے سرانجام دیا جاسکتا ہے۔ ان سب کو یکجا ہوکر ایک اسٹریٹیجی کے تحت مختلف شعبہ جات جن میں ترقی کا پوٹینشل موجود ہے، کی نشاندہی کرنا ہوگی۔ ان شعبہ جات کے لیے مطلوب انسانی وسائل کی ہنگامی بنیادوں پر ٹریننگ کر کے انھیں اس قابل بنانا ہوگا کہ وہ جدید تقاضوں اور مارکیٹ کے مطابق کارخانوں میں کم لاگت پر مصنوعات تیار کرسکیں۔ ابتداء میں انہی کاروباری شخصیات اور اداروں کو آگے بڑھ کر ان منتخب شعبہ جات میں سرمایہ کاری کرنا ہوگی اور نو وارد انٹرپرینیورز کی سرپرستی کر کے ایک مقام تک لانے میں بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا۔ ان شعبہ جات کی اشیا کی برآمدات کے لیے امریکا، یورپ، انڈیا، چائنا اور سعودی عرب میں مارکیٹنگ کے لیے پروفیشنلز کی خدمات حاصل کرنا ہوں گی اور سب سے بڑھ کر اس منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لیے حکومتوں کو "کاروبار دوست" پالیسیاں بنانے پر مجبور کرنا ہوگا۔ بقول احمد فراز

شکوہ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

طیب اعجاز قریشی

tayyab.aijaz@urdu-digest.com

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اٹھائیے

کوّر سٹوری

49

روشانے ظفر

ایک لڑکی جس نے 82 ہزار عورتوں کی مایوسی بھری زندگی میں اُمید کی کھڑکی کھول دی

تحریر و ملاقات: اختر عباس

ہر کوئی وزیر بننا چاہتا تھا

ایک نے کروڑ تو دوسرے نے دو کروڑ کی آفر کر دی

بلوچستان کے نگران وزیراعلیٰ نواب غوث بخش باروزئی کا سنسنی خیز انکشاف

27

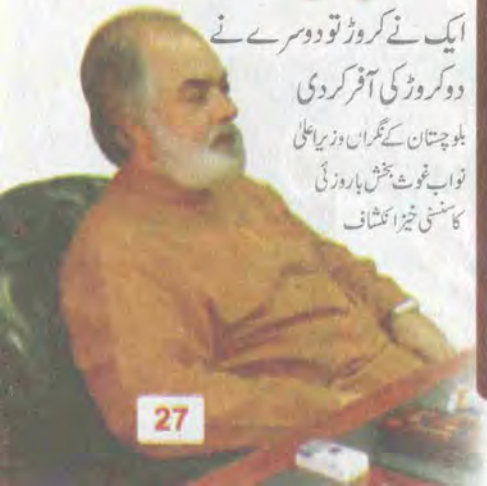

جون2013ء

فہرست

چونکا دینے والے واقعات، چشم کشا حقائق

اقتدار کے ایوانوں میں کیا ہوتا رہا

267
عمیر محمود

را اور موساد کے خفیہ فنڈز کی کہانی

موساد کے لیے محفوظ گھر

محمد فاروق قریشی
257

صحت

طبّی ٹوٹکے
بیماریوں سے بچانے والے 7

آپ کی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے
ناشتہ کس قدر ضروری ہے
جنید اکرم
77

20 عادتیں
جو آپ کو فربہ بناتی ہیں
ڈاکٹر نصیر علی
5

اردو ادب

مہرو

ایک ویران گھر کی ویرانی کا ماجرا
اس نے ایک دل کی دنیا ہی ویران
کر ڈالی تھی
وقار احمد ملک
203

ادھورا سپنا

نیند کی دہلیز پہ بیٹھے ایک سپنے کا ماجرا اسے
ایک ادھورے سپنے نے نگل لیا تھا
عاکف آزاد
217

طنز و مزاح

سوزشِ جگر سے سوزِ جگر تک
مبشر الحق عباسی

ایک حکیم صاحب اور ان کے دوستوں کا پُر لطف احوال
119

کیوں کراتے ہو میری شادی؟

شادی جیسے فروعی معاملے کی تحقیق میں
اُلجھے ایک نوجوان کا دلچسپ قصہ
عمیر محمود
94

تحقیق

ماں کے بدن میں بچے کے زندہ خلیے

ماں بیٹے کے روحانی رشتے کا ذکر
عبدالہادی سید
85

تعلیمی دنیا میں سب سے زیادہ اسکالرشپ اسی شعبے کو ملتے ہیں

نیچرل سائنسز
یوسف الماس
(بانی ایجوویژن اسلام آباد)

150

22000 طلبہ و طالبات

غزہ یونیورسٹی کے کلچر نے حیران کر دیا
14 دن مصر و فلسطین میں
225

انتخابات ۲۰۱۳ء کے اہم پیغامات
ہم کہاں کھڑے ہیں

مستقبل کے منظرنامے کا تجزیہ۔ الطاف حسن قریشی کے قلم سے
16

ہیڈ کانسٹیبل کا بیٹا انڈر ورلڈ کا بے تاج بادشاہ کیسے بنا؟

معظم علی
108

فہرست
جون 2013ء

اداریہ
15 کچھ اپنی زبان میں — الطاف حسن قریشی

اسلامی زندگی کی کہکشاں
33 میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو — یاسمین حمید
ایسی باتیں جو اگر دل میں رہتیں تو ہم ان کی تاثیر سے محروم رہ جاتے
38 حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ — خالد محمد خالد/ارشاد الرحمٰن
اُمتِ مسلمہ کے چار بڑے فیصلہ سازوں میں سے ایک کی داستان
45 فرانسیسی موسیقار کا انوکھا واقعہ — ڈاکٹر محمود احمد غازی
فنِ موسیقی کی شُدبُد رکھنے والے ایک نومسلم کا حیرت انگیز قصہ

طب و صحت
273 صحت نہیں وزن کم کریں — نوشین ناز
زیادہ پانی پینے کے فوائد

طنز و مزاح
87 بے تاب کی بے تابیاں — اعتبار ساجد
خوفناک کہانیاں لکھنے والے ایک خوفزدہ مصنف کا ماجرا

شکاریات
97 جنگلی مینڈھے کا شکار — صبا شفیق
شکار کے لیے ضبط، حوصلہ اور صبر کا کس قدر امتحان ہوتا ہے

فیچرز
260 خبر بنانے والی کبھی خود بھی خبر بنتی ہے — حنا انور
ملک کے مؤثر و موقر اخبارات کی لیڈی رپورٹرز/ایڈیٹرز سے گفتگو
90 پسند اپنی اپنی — محمد فاروق قریشی
حد سے بڑھی انفرادیت اور پسند ناپسند کے پیمانوں کا تذکرہ
103 دھتکارے ہوئے انسانوں کی مسیحا — عبدالہادی
قریب المرگ مریضوں کے لیے مہربان
106 نیڈ کیلی — فتح نیاز
کیا آزادی پسندوں سے نفرت کبھی غاصبوں کا وتیرہ ہوتی ہے
128 توالو — عالیہ احمد
صفحۂ ہستی سے مٹتے بدقسمت ملک کا تذکرہ
132 گوروں کے دیس میں — ساجدہ غلام محمد
جہاں اپنے پیارے بہت یاد آتے ہیں
147 قیدیوں کی تعلیم و تربیت — حبیب اللہ مجاہد
ملزم سے مجرم کیسے بنتے ہیں؟
151 بوڑھے جاپانی نے معافی مانگ لی — ماہا فرمینڈو
ایک سری لنکن ڈاکٹر کی سچی کہانی
153 ملازمین کی کارکردگی — ماجد جہانگیر
مالکان اور مینیجرز کے لیے خصوصی تحفہ
157 آسیب بیتی — محمد انار خان
ایک فاریسٹ آفیسر کی زندگی کے سنسنی خیز واقعات
265 آرٹسٹ نے ڈالر واپس کر دیئے — رضوان علی شاہ
دیانت داری کا سبق آموز قصہ

سیر و سیاحت
137 الخبر — حمیرا لیاقت
سعودی عرب کے مشرقی کنارے کا سفر

اُردو ادب
161 دور کی آواز — منشا یاد
ایک گرہستن کی آواز کا ماجرا
174 مشرقی لڑکی — حسن رزاقی
ایک معصوم لڑکی کا ماجرا جس کے پَر نکلنا ابھی باقی تھے
177 عیوب — اختر عباس
ایک بیٹے کا ماجرا، جسے اپنی ماں کے سوال سے خوف آتا تھا
182 احسان علی — ممتاز مفتی
زندگی سے مذاق کرنے والے ایک رنگین مزاج کی کہانی
193 بہروپیا — محمد اسلم ہنگورا
ایک بن بلائے مہمان کا قصہ
197 جھتے پیر اُتھے خیر — نوید اسلام صدیقی
بیٹے کا قصہ اسے اپنی ماں ہی ایک کہانی لگتی تھی
209 اروڑ کا مست — سراج چنا
ایک مست کا قصہ جو ہوش مندوں کو سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیتا تھا
222 حادثہ ایک دم نہیں ہوتا — توقیر عائشہ
ماؤں کے ادھورے ارمان کا تذکرہ

باتیں نئی تحریریں نئی
241 دیوارِ زنداں — ابوالفضل محمود
کھلی فضاؤں اور کھلے در و دیوار سے ڈرے ہوئے لوگوں کا تذکرہ
244 دو بھائی — شکیل احمد
سائیکلوں کی مرمت کرنے والے دو بھائیوں کی سچی داستان
246 بیک بینچرز — نجیب عمر
ایک استاد کی سوچ کی تبدیلی کا ماجرا
249 پیلے رنگ — احمد نعیم چشتی
پیلے رنگ کی خصوصیات
252 کسٹرڈ خود بنا لینا — غزالہ محمود
ایک فوجی آفیسر کی دلہن کا ماجرا

مستقل سلسلے اور کالم
قصہ کوئز (غلام سجاد)، بوجھیں تو جانیں (ادارہ)
چمنِ خیال (خطوط)، دردِ دل پہ دستک (اختر عباس)

قومی شعور کی عظیم فتح!

سخت کٹھن حالات میں پاکستان کے طول و عرض میں عام انتخابات کا انعقاد کسی طور ایک سیاسی معجزے سے کم نہیں۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ تواتر سے اِس تاثر کو ہوا دے رہا تھا کہ انتخابی عمل خون خرابے میں سبوتاژ ہو جائے گا۔ گیارہ مئی جوں جوں قریب آتا گیا' دہشت گردوں اور بلوچستان میں علیحدگی پسندوں نے سیاست دانوں' اُمیدواروں اور سیاسی کارکنوں پر حملے تیز کر دیے' تاہم اہلِ عزم چٹان کی طرح کھڑے اور جانوں پر کھیل کر جمہوری عمل کی حفاظت کرتے رہے۔ سیاسی جماعتوں' میڈیا اور سول سوسائٹی کی شبانہ روز مساعی سے ووٹروں کا ٹرن آؤٹ ۵۳ فی صد سے تجاوز کر گیا جو نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ بدنظمی اور دھاندلی کی گوناگوں شکایات کے باوجود تمام سیاسی جماعتوں نے انتخابی نتائج تسلیم کر لیے ہیں اور سسٹم کو چلتے رہنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔ اِس قومی شعور کی آبیاری میں جن اداروں اور شخصیتوں نے ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا' ہم اُنہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

جناب میاں نواز شریف کی مدبرانہ قیادت میں پاکستان مسلم لیگ نون قومی اسمبلی میں ایک آرام دہ اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اِس خیرہ کن کامیابی میں جناب میاں شہباز شریف کی اعلیٰ کارکردگی کا بڑا حصہ ہے جو پنجاب میں وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے عوام کی فلاح و بہبود کے عظیم کارنامے سرانجام دیتے رہے۔ ہم اِس جماعت کی اعلیٰ قیادت اور اُس کے مخلص کارکنوں کو اِس تاریخی فتح پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اُمید رکھتے ہیں کہ اُن کا آنے والا دورِ حکومت ہمارے اہلِ وطن کے لیے سلامتی' ترقی اور خوشحالی کا عہد ثابت ہوگا جس میں قانون کی حکمرانی اور میرٹ کی پاسداری اور انصاف کی فراہمی کا پورا پورا اہتمام کیا جائے گا اور بھارت اور امریکہ سے تعلّقات کو فروغ دینے میں بڑی احتیاط اور پورے توازن سے کام لیا جائے گا۔

ہم جناب عمران خاں کی سیاسی فتوحات پر اُنہیں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں کہ وہ پہلی ہی جست میں دوسری بڑی اور نہایت فعال پارلیمانی پارٹی کے سربراہ کے طور پر اُبھرے ہیں اور صوبہ خیبر پختون خواہ میں حکومت سازی کی پوزیشن میں آ گئے ہیں۔ اُنہوں نے نوجوانوں کے اندر تبدیلی کا جو صور پھونکا ہے' اُس نے کراچی کی سیاسی ماہیت کی تبدیلی کا عمل حیرت انگیز طور پر تیز کر دیا ہے۔ ہم اُن کی جلد صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں اور اُن سے محترمہ زہرہ شاہد حسین کی شہادت پر تعزیت کے ساتھ مطالبہ کرتے ہیں کہ ساٹھ سالہ معزز اور سیاسی طور پر متحرک خاتون کے قاتلوں کا سراغ لگایا جائے جن کا تعلق کسی بے رحم اور سفاک مافیا سے ہو سکتا ہے۔ کراچی اور حیدر آباد کے عوام اُن خوش نصیب ساعتوں کے انتظار میں ہیں جب عمران خاں اور دوسری مزاحمت کار جماعتوں کے ہاتھوں سیاسی فسطائیت کا بت پاش پاش ہوگا اور اُنہیں اپنی رائے آزادانہ استعمال کرنے کی آزادی نصیب ہوگی۔

انتخابات ۲۰۱۳ء کے اہم پیغامات

قوم نے سخت آزمائشوں کے دوران انتخابی عمل مکمل کرلیا ہے اور چند روز میں ایک مستحکم حکومت بھی وجود میں آجائے گی۔ میاں نواز شریف کے اب تک جو میلانات سامنے آئے ہیں، وہ خوش آئند اور ایقان افروز ہیں، مگر درپیش چیلنج بہت گھمبیر اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اُن سے نمٹنے کے لیے سیاسی بصیرت، وسیع تر مشاورت اور ظرف کی وسعت اور حد درجہ اعتدال و توازن سے کام لینا اور تازہ خون کو قومی معاملات میں اہم مقام دینا اور سول ملٹری تعلقات میں توازن قائم رکھنا ہوگا۔

مستقبل کے منظرنامے کا تجزیہ۔ الطاف حسن قریشی کے قلم سے

انتخابات جس انداز میں ہوئے، اُس نے الیکشن کمیشن اور نگراں حکومتوں کے بارے میں بڑے بڑے سوالات اُٹھا دیے ہیں جن کا تسلی بخش جواب تلاش کرنا لازم آتا جارہا ہے، البتہ بیشتر سیاست دانوں کے مابین یہ اتفاقِ رائے پیدا ہوگیا ہے کہ دھاندلی اور بے قاعدگی کے ازالے کے لیے جو میکانزم سسٹم کے اندر موجود ہے، اُسے بروئے کار لایا جائے اور اُن مسائل کی طرف پوری توجہ دی جائے جو عوام کو بہت ساری اذیتوں میں مبتلا رکھے ہوئے اور ملکی معیشت کو اپنے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں۔ ہم اِس مثبت اور صحت مند سوچ کی قدر کرتے ہوئے الیکشن کمیشن اور نگراں حکومتوں کے معاملات میں پائی جانے والی بنیادی خرابیاں بعد میں زیرِ بحث لائیں گے جن کا تعلق ہمارے آئین سے ہے اور اُن پر آزادانہ قومی مباحثہ مناسب وقت پر شروع کیا جانا بہت ضروری ہوگا۔ فی الحال حکومت سازی کا مرحلہ درپیش ہے جو بظاہر اِس لیے آسان دکھائی دیتا ہے کہ ایک جماعت کو واضح اکثریت حاصل ہے جو ایک بہت بڑی سیاسی طاقت بھی ہے اور بہت بڑی ذمے داری بھی۔ ماضی کے تجربات سے ہمیں یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ وفاقی کابینہ جس قدر وسیع البنیاد ہوگی، اِسی قدر اِس کی رِٹ کا احترام کیا جائے گا۔ ہمارا حُسنِ ظن ہے کہ جناب میاں نواز شریف وفاقی کابینہ کا حجم بیس کے لگ بھگ رکھیں گے اور اِس میں پرانے چہروں کے علاوہ تازہ دم اور تخلیقی ذہن کے افراد بھی شامل کریں گے۔ اِس کے علاوہ سندھ سے فنکشنل لیگ کی نمائندگی بھی ناگزیر معلوم ہوتی ہے تاکہ سندھ کا حصہ وفاقی کابینہ میں خاصا مؤثر نظر آئے۔ بلوچستان سے مسلم لیگ نون کے علاوہ پختونخواہ ملی عوامی پارٹی

اور نیشنل پارٹی نے اِس کے ساتھ غیر مشروط سیاسی اتحاد بھی کرلیا ہے۔ کارکردگی کی بنیاد پر سردار ثناء اللہ زہری وزیرِاعلیٰ بننے کے حق دار ٹھہرتے ہیں، مگر وہ شاید اتحادی پارٹیوں کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ اِس کے علاوہ اُنہوں نے اپنے بیٹے، بھائی اور بھتیجے پر قاتلانہ حملے میں ہلاکت پر سردار اختر مینگل، اُن کے بھائی جاوید مینگل اور اُن کے سسر نواب خیر بخش مری کے خلاف ایف آئی آر درج کرادی ہے جس نے سیاسی صورت حال میں بڑی پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں۔ مسلم لیگ کے اندر اِس منصب کے لیے جناب نوابزادہ چنگیز مری کی قد آور شخصیت بھی موجود ہے۔ وہ بلوچوں کے سب سے بڑے قبیلے ''مری'' کے نواب خیر بخش مری کے سب سے بڑے بیٹے ہیں اور پاکستان کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی رکھتے ہیں۔ اُن کا چھوٹا بھائی حربیار مری اُس گروہ میں شامل ہے جو بیرونی طاقتوں کی مدد سے علیحدگی کی تحریک چلا رہا اور صوبے میں خوف و ہراس پھیلا رہا ہے۔ نوابزادہ چنگیز مری اگر صوبے کے وزیرِاعلیٰ منتخب کر لیے جاتے ہیں، تو اُن کے لیے مری قبیلے کے عمائدین سے حکومت کی بات منوا لینا اور اُسے قومی دھارے کی سیاست میں لے آنا قدرے آسان ہوگا، مگر اُن کا عوام کے ساتھ ملنا جلنا خاصا کم ہے۔ جناب جان محمد جمالی بھی مسلم لیگ نون میں شمولیت اختیار کر چکے ہیں۔ وہ بلوچستان کے وزیرِاعلیٰ بھی رہے اور سینیٹ کے ڈپٹی چیئرمین بھی، لیکن اُن کا انتخاب اِس لیے دشوار ہوگا کہ وہ طویل عرصے تک قاف لیگ سے وابستہ رہے ہیں۔ قرائن بتاتے ہیں کہ مسلم لیگ نون کی قیادت کو پارٹی کے اندرونی اختلافات پر قابو پانا کچھ سہل نہ ہوگا۔ وسیع تر قومی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ کو حکومت بنانے کی دعوت دی جائے جن کی پارٹی کو پختونخواہ ملی عوامی پارٹی کی بھی حمایت حاصل ہے اور اُس نے مکران کی بلوچ بیلٹ میں انتخابی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ڈاکٹر بلوچ نواب ہیں نہ سردار، اُن کا تعلق تعلیم یافتہ متوسط طبقے سے ہے۔ صوبے میں اُن کے لیے بہت احترام پایا جاتا ہے اور اُنہوں نے گزشتہ پانچ برسوں میں سیاسی عمل کو بڑی طاقت فراہم کی ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ سیاسی قائدین بالغ نظری کا ثبوت دیں گے اور قبائلی سردار اپنی اپنی اَنا کے خول میں بند رہنے کے بجائے سیاسی حکمتِ عملی سے کام لیں گے۔ مسلم لیگ نون کی قیادت کے لیے یہ بہت بڑا امتحان ہوگا کیونکہ صوبائی اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی ہونے کی حیثیت سے وہ اپنا قائد ایوان لانے کی خواہش مند ہوگی جبکہ سیاسی مبصرین کی نظر میں ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ کا انتخاب زیادہ بہتر ہوگا۔

☆☆☆

پاکستان کی تیسری بڑی پارلیمانی پارٹی تحریکِ انصاف کو بھی خیبر پختونخواہ میں ایک بڑی آزمائش کا سامنا ہے۔ ہم نے گزشتہ شمارے میں جناب عمران خاں کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ قومی اسمبلی میں تیس پینتیس نشستیں لے سکیں گے۔ یہ بھی تحریر کیا تھا کہ وہ اُمیدواروں کے ناموں کا اعلان کرنے کے بعد جس گرداب میں پھنس گئے تھے، اُس سے باہر نکل آئے ہیں اور اُن کے نامزد اُمیدوار بڑی بے جگری سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہمارا یہ تجزیہ بھی تھا کہ اُن کے بیشتر اُمیدوار پہلی بار انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں اور اُنہیں حکومت چلانے کا تجربہ بہت کم ہے۔ اِس ناتجربے کاری کے مضر اثرات خیبر پختونخواہ میں نظر آ رہے ہیں اور تحریکِ انصاف کو اپنے وزیرِاعلیٰ کے انتخاب میں دشواری کا سامنا ہے۔ اصولاً صوبائی صدر اِس منصب کے حق دار ہیں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ ناتجربے کاری کی وجہ سے حکومت چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ کامیاب اُمیدواروں میں سے جن صاحب کو وزارت چلانے کا تجربہ ہے، وہ پرویز خٹک ہیں جو ڈاکٹر عارف الٰہی کو شکست دے کر پارٹی کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے۔ اِس سے قبل اُنہوں نے خیبر پختونخواہ میں صوبائی صدارت کا بھی انتخاب لڑا تھا، لیکن اسد قیصر سے شکست کھا گئے،

کیونکہ وہ پارٹی میں ناپسند کیے جاتے تھے۔ وہ پہلی بار جب پیپلز پارٹی چھوڑ کر تحریکِ انصاف میں شامل ہونے کے لیے اسلام آباد آئے' تو اُن کے خلاف کارکنوں اور جماعت کے پرانے ارکان کی طرف سے شدید احتجاج ہوا تھا۔ شنید یہ ہے کہ وہ دولت کی فراوانی سے سیکرٹری جنرل کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ جناب عمران خاں نے اُنہیں وزارتِ اعلیٰ کے لیے نامزد کیا ہے جس کے خلاف جماعت کے اندر شدید ردِعمل پایا جاتا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے خاں صاحب کو یقیناً یہ احساس ہو چکا ہوگا کہ اُمیدواروں کے انتخاب میں تجربے کار افراد اور نئے خون کا امتزاج ازبس ضروری تھا۔

تحریکِ انصاف کو زندگی میں پہلی بار ایک صوبے میں حکومت سازی کا موقع مل رہا ہے اور جناب عمران خاں کی جانب سے اعلان ہوا ہے کہ وہ ایک مثالی حکومت قائم کر کے دکھائیں گے۔ یہ مثالی حکومت محض خواہشوں اور تمناؤں سے قائم نہیں ہو سکے گی' اس کے لیے غیر معمولی تحمل' تدبر اور جاں فشانی سے کام کرنا ہوگا۔ خوش قسمتی سے حکومت سازی میں تحریکِ انصاف کو جماعت اسلامی اور قومی وطن پارٹی کا تعاون حاصل ہے' اِس لیے مناسب ہوگا کہ اِن جماعتوں میں سے ایک ایسے شخص کو اسپیکر منتخب کیا جائے جو اسمبلی کے معاملات اور کاروبارِ حکومت چلانے کی نزاکتوں سے پوری طرح باخبر ہو' ورنہ ایوان مچھلی منڈی بنا رہے گا اور حکومت کے انتہائی سنجیدہ امور بھی کھیل تماشا بن کے رہ جائیں گے۔ تحریکِ انصاف کی ناتجربے کاری کو مولانا فضل الرحمن کی سیاسی ذہانت اور عملی فراست سے بھی ایک مستقل خطرہ لاحق رہے گا جو عمران خاں کو ناکام بنانے کے علانیہ عزائم رکھتے ہیں۔ ایسے میں اُنہیں احتجاجی سیاست سے کنارہ کش ہو کر اِن مواقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے جو اُنہیں انتخابات کے نتیجے میں حاصل ہوئے ہیں۔ وہ قومی اسمبلی میں ایک خاصی مؤثر طاقت کے طور پر اُبھرے ہیں۔ غالباً پنجاب اسمبلی میں اُن کا نامزد شخص اپوزیشن لیڈر کے طور پر کام کرے گا۔ اُنہیں کراچی میں ساڑھے سات لاکھ کے لگ بھگ ووٹ ملے ہیں اور ایم کیو ایم کے مدِ مقابل نوجوانوں کی ایک پُرجوش اور پُرعزم فوج منظم ہوتی جا رہی ہے۔ پہلی ہی جست میں اِس قدر حیرت انگیز سیاسی فتوحات بلاشبہ اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے' تاہم اِس عظیم کامیابی کے بعد اُنہیں قسطائی رجحانات و میلانات سے مکمل طور پر اجتناب کرنے کے علاوہ اپنے کارکنوں اور حامیوں کو جمہوری آداب سکھانا ہوں گے۔ لفٹر سے گرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ایک نئی زندگی عطا کی ہے جس پر ہم اُنہیں مبارک باد پیش کرتے اور یہ احساس دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ تکبّر انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے اور عاجزی کی صفت اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

☆☆☆

عمران خاں صوبہ خیبر پختونخواہ میں ایک مخلوط حکومت بنانے پر مجبور اور تحریکِ انصاف کے بیشتر ارکانِ اسمبلی نوآموز ہیں جبکہ یہ صوبہ اسٹریٹیجک اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ فاٹا جو اِس کے ساتھ ملحق ہے' وہاں پاکستانی طالبان نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اُن کے تربیتی کیمپ بھی زیادہ تر اسی علاقے میں ہیں۔ جنوبی اور شمالی وزیرستان میں فوج کو دہشت گردوں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا ہے اور وہ بے مثال قربانیاں دے کر وطنِ عزیز کی سرحدوں کی حفاظت کر رہی ہے۔ ڈرون حملے بھی زیادہ تر شمالی اور جنوبی وزیرستان میں جاری ہیں جن میں بے گناہ شہری بھی ہلاک اور زخمی ہو رہے ہیں۔ دہشت گردی کے خاتمے اور ڈرون حملوں کی روک تھام کے لیے امریکہ اور طالبان سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے وفاقی اور صوبائی حکومت اور فوج کو ایک "صفحے" پر ہونا ہوگا۔ اس کے علاوہ اے این پی کی طرف سے کرپشن کے ہولناک اثرات ختم کرنے کے لیے بڑی محنت درکار ہوگی۔ سوال پیدا

ہوتا ہے کیا کہ عمران خاں تنہا اِس قدر بوجھ اُٹھا سکیں گے۔ مرکز میں اُن کا اثر و رسوخ بہت کم ہوگا اور صوبے میں اُنہیں ایک تجربے کار سیاسی ٹیم دستیاب نہیں ہوگی' چنانچہ یہ امر واضح ہے کہ خیبر پختونخواہ میں قیامِ امن اور معاشی ترقی کے لیے مرکز کا تعاون بڑی اہمیت کا حامل ہوگا۔ خوشی کی بات ہے کہ طالبان سے مذاکرات اور ڈرون حملوں کی روک تھام کے حوالے سے جناب نواز شریف اور جناب عمران خاں کے خیالات بڑی حد تک یکساں ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے لیے اور جمہوری نظام کے استحکام کے لیے خیر سگالی کے جذبات رکھتے ہیں' مگر یہ ساری باتیں اقتدار میں آنے سے پہلے کی ہیں اور اُمید یہی کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے الفاظ اور کومٹ منٹ کا پورا خیال رکھیں گے۔

غور طلب نکتہ یہ ہے کہ تحریکِ انصاف کی حکومت کن کن شعبوں میں اچھی کارکردگی دکھا سکے گی۔ بیشتر انتظامی امور میں وہ بیوروکریسی پر انحصار کرے گی۔ اگر وہ سرکاری افسروں کی ایک اچھی ٹیم تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی اور اُسے ضابطوں کے تحت آزادی سے فرائض سرانجام دینے کی اجازت دی گئی' تو عوام کے مسائل حل ہونے کی ایک مضبوط بنیاد میسر آ جائے گی۔ آزاد تجزیہ نگاروں کی رائے میں خیبر پختونخواہ کی سول انتظامیہ اور پولیس دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بڑی ذمے دار' انصاف پسند اور جمہوری مزاج کی حامل ہے۔ دہشت گردی کے خلاف اعلیٰ پولیس افسروں اور جوانوں نے بڑی بہادری اور جاں نثاری کا مظاہرہ کیا ہے اور وہاں کے عام شہری اعلیٰ سے اعلیٰ سول افسر تک پروٹوکول کے بغیر پہنچ سکتے اور بے تکلفی سے اپنی بات کہہ سکتے ہیں۔ نئی حکومت کو کرپشن پر قابو پانے اور ایم پی ایز اور وزرائے کرام کو اپنی حدود میں رکھنے کے لیے جماعت اسلامی کے داخلی احتساب کی طرز پر ایک نظام نافذ کرنا ہوگا۔ اس جماعت کے وزیر جب ایم ایم اے کی حکومت میں برسرِ اقتدار آئے' تو اُنہوں نے دیانت داری اور فرض شناسی کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا تھا اور اُن کے خلاف کسی قسم کی بے ضابطگی اور بدعنوانی کی شکایت سننے میں نہیں آئی تھی۔ کیا عمران خاں پہلی بار ایوانِ حکومت میں داخل ہونے والے ارکانِ اسمبلی پر نہایت کڑا احتسابی نظام نافذ کر سکیں گے' اِس کا جواب آنے والا وقت ہی دے سکے گا۔ وہ گزشتہ ایک عشرے سے ایک شفاف سیاسی کلچر کی جو نوید سناتے آئے ہیں' اُس سے توقع بندھتی ہے کہ وہ کرپشن کو برداشت نہیں کریں گے' مگر اُن کے لیے اُن کے وزیرِ اعلیٰ ایک بڑی آزمائش ثابت ہو سکتے ہیں جن کا ماضی اس معاملے میں خاصا داغ دار بتایا جاتا ہے۔

☆☆☆

صوبے میں قیامِ امن ایک انتہائی سنگین مسئلہ ہے جس کے باعث بیرونی سرمایہ کاری رک گئی ہے اور سیاحت پر بہت منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اِس ناخوشگوار صورتِ حال میں بہتری لانے کے لیے عمران خاں کو مرکز کے تعاون سے ایک اقتصادی حکمتِ عملی وضع کرنا ہوگی اور ڈیولپمنٹ کے لیے فوج کے ساتھ بھی اشتراکِ عمل درکار ہوگا۔ اگر تحریکِ انصاف کی حکومت نے بے سمجھی یا ناتجربے کاری میں ایک بھی ایسا بیان داغ دیا' یا کوئی ایسا قدم اُٹھا لیا جو مرکزی حکومت اور عالمی برادری میں سراسیمگی پھیلانے کا باعث بن جائے' تو اُس کے لیے شدید مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ طالبان سے مذاکرات کا سفر طویل بھی ہے اور بے حد کٹھن بھی اور اُن کے بہت گہرے مضمرات بھی ہیں جن کی تفہیم اور معاملات کی بجاآوری کے لیے اعلیٰ ترین سیاسی' خارجی اور دفاعی قیادتوں سے رابطے ضروری ہوں گے۔ اِس اعتبار سے صوبائی حکومت کو بڑی احتیاط سے کام لینا اور اپنے سیاسی وزن کو تولتے رہنا ہوگا۔ قومی سلامتی کے اہم اداروں کو سب سے زیادہ تشویش یہی ہے کہ صوبہ جس قدر اسٹریٹجک اہمیت کا حامل ہے' صوبائی حکومت اُسی قدر نوآموز اور ضرورت سے زیادہ پُرجوش دکھائی دیتی ہے جو غیر ضروری مسائل کو دعوت دے سکتی ہے' تاہم زیادہ تر سیاسی دانش وروں کا حُسنِ ظن یہ ہے کہ عمران خاں سوچ

سمجھ کر قدم اُٹھائیں گے اور صورتِ حال کی نوعیت کے مطابق لائحہ عمل وضع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُن کا خواب یکساں نظامِ تعلیم کا نفاذ ہے جس کا تجربہ وہ خیبر پختونخواہ میں بڑی یک سوئی کے ساتھ کر سکتے ہیں جہاں تعلیم کا معیار نسبتاً بہتر ہے' مگر انہیں اقتدار میں آنے کے بعد اِس اچھی خواہش کی تکمیل کے امکانات کا حقیقت پسندی سے جائزہ لینا ہوگا۔ یہاں پبلک ادارے بھی ہیں اور پرائیویٹ بھی اور دینی مدارس کا ایک جال بھی بچھا ہوا ہے جن میں سے زیادہ تر دیوبندی مکتبۂ فکر کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان تینوں نظام ہائے تعلیم کو ایک دوسرے کے قریب لانا' اُن کے اندر اعلیٰ معیار قائم کرنا اور ان میں یکساں نظامِ تعلیم نافذ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا کیونکہ مختلف حلقوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا بھی امکان ہے' تاہم ایک پُرعزم قیادت مشکلات پر قابو پا سکتی ہے اور وسیع تر مشاورت اور مکمل ہوم ورک کے بعد ایک تدریجی عمل شروع کیا جا سکتا ہے۔

انصاف کی فراہمی عمران خاں کا دوسرا بڑا خواب ہے جس کی عملی تعبیر کے لیے اُنہیں پورا انتظامی' اقتصادی اور سماجی ڈھانچہ اجتماعی عدل کے اصولوں پر استوار کرنا ہوگا۔ اس کا آغاز اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ مراعات یافتہ طبقے پر عام آدمی کو ترجیح دی جائے اور سب سے زیادہ اس کی ضرورتوں کا خیال رکھا جائے۔ میرٹ کا نظام قائم ہوتے ہی عام شہری کی حالت سدھرنا شروع ہو جائے گی کیونکہ وہ ذہین' محنتی اور جفاکش ہے۔ اچھی حکمرانی سے مفادات کے حصار ٹوٹتے اور عوام کی حکمرانی کے سنگِ میل تعمیر ہوتے جائیں گے۔ گزشتہ پانچ برسوں کا سب سے بڑا المیہ ڈیلیوری سسٹم کا مکمل کولیپس (collapse) تھا۔ اگر اِسے جدید سائنٹیفک بنیادوں پر استوار کر دیا جائے' تو زندگی کے ہر شعبے کا اضمحلال توانائی میں تبدیل ہو جائے گا اور معیشت برگ و بار لانے لگے گی۔ یہ عظیم کام وسائل کے دیانت دارانہ اور دانش مندانہ استعمال سے سرانجام پا سکتا اور دوسرے صوبوں کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال بن سکتا ہے۔ جناب عمران خاں اس صوبے کی جفاکش افرادی قوت کے ذریعے بھی ایک سماجی انقلاب لا سکتے اور دریاؤں سے بڑی توانائی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ انجینئروں اور پروفیشنلز کے ذریعے ایسے منصوبوں پر فوری طور پر کام شروع کر سکتے ہیں جو توانائی کی قلت دور کرنے میں فوری طور پر مددگار ثابت ہو سکتے ہیں' اس کے لیے مرکز کے ساتھ اچھے روابط قائم رکھنا ضروری ہوگا۔

☆☆☆

سندھ میں حکومت سازی کا معاملہ بھی قدرے پیچیدہ نظر آتا ہے۔ جناب صدر زرداری اپنے منہ بولے بھائی اویس مظفر عرف ٹپی کو وزیرِاعلیٰ بنانے کی منصوبہ بندی کر چکے تھے اور اُنہوں نے چینی وزیرِاعظم کے اعزاز میں دیے گئے ظہرانے کے موقع پر بڑے اہتمام سے اپنے منہ بولے بھائی کا تعارف جناب میاں نواز شریف سے کرایا تھا' مگر جب بلاول ہاؤس لاہور میں اُنہوں نے پارٹی کے سرکردہ افراد سے اِس مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا' تو اُنہیں مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ پنجاب' خیبر پختونخواہ اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی عبرت ناک شکست نے اُن کی سیاسی طاقت پر کاری ضرب لگائی ہے اور اُنہیں پہلی بار اپنی ناتوانی کا احساس ہوا ہے' چنانچہ وہ سینیٹر رضا ربانی کو جنہیں وہ ناپسند کرتے رہے' اُنہیں اپنے معاون کے طور پر ساتھ لے کر آئے' تاہم ٹپی کے حق میں فضا ہموار نہ ہو سکی۔ پیپلز پارٹی کے وہ افراد جو اپنی سیاسی طاقت سے انتخابات جیت کر آئے ہیں' اُنہوں نے ایک مبینہ مجرم شخص کو اپنا وزیرِاعلیٰ قبول کرنے کے بارے میں شدید تذبذب کا اظہار کیا ہے۔ یہ صاحب جن کو وزیرِاعلیٰ بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں' بے نظیر بھٹو کے دور میں غالباً بطور ایس ڈی ایم تعینات ہوئے تھے۔ اخباری رپورٹ کے مطابق اُنہوں نے لوٹ مار کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے اور اُن کے خلاف سنگین نوعیت کے مقدمات دائر ہوئے اور اُنہیں پاکستان سے فرار ہو کر دبئی جانا پڑا۔ بعد میں این آر او کے تحت اُن کے

خلاف مقدمات واپس لے لیے گئے اور جناب زرداری کے صدر منتخب ہونے پر وہ کراچی آ گئے اور وزیرِاعلیٰ سید قائم علی شاہ کے نام پر حکومتِ سندھ کے معاملات چلانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ زمینوں کے انتقال اور قبضوں کا پورا کاروبار اُن کے سپرد تھا اور اعلیٰ سرکاری ملازمتیں فروخت کرنے میں وہ محترمہ فریال تالپور کے ہم نشیں تھے۔ یہ عجب معاملہ ہے کہ زیرِ زمین کام کرنے والوں میں بلا کی پھرتی' تیز طراری اور حاضر دماغی پائی جاتی ہے اور وہ لوگوں کو شیشے میں اُتارنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ انہی ''خوبیوں'' اور دولت کی فراوانی سے وہ صوبائی اسمبلی میں منتخب ہو چکے ہیں جو ہمارے سیاسی کلچر کے لیے کسی وقت بھی ایک ٹائم بم ثابت ہو سکتے ہیں۔ اب غالباً یہ فیصلہ ہوا ہے کہ سن رسیدہ سید قائم علی شاہ کے سر پر وزارتِ علیا کا ہما بٹھا دیا جائے اور ماضی کی طرح اصل معاملات جناب اویس مظفر اور محترمہ فریال تالپور کے ہاتھ ہی میں رہیں' لیکن اب اس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ حالات میں ایک جوہری تبدیلی آ چکی ہے۔ سندھ میں نون لیگ کو فنکشنل مسلم لیگ کا تعاون حاصل ہو چکا ہے اور ارباب غلام رحیم کی جماعت بھی اُس کے اندر مدغم ہو گئی ہے' پیپلز پارٹی مرکز میں اقتدار سے محروم ہے اور تحریکِ انصاف نے کراچی میں اپنے وجود کا احساس دلا دیا ہے جبکہ ایم کیو ایم ایک داخلی بحران سے دوچار ہے۔

میاں نواز شریف تھرکول کو کوئلے کی ڈیولپمنٹ میں بہت بڑی سرمایہ کاری کا منصوبہ تیار کر چکے ہیں اور وہ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد غالباً سندھ کا دورہ کریں گے اور ڈاکٹر مبارک ثمر مند کی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے سندھ پر غیر معمولی توجہ دیں گے۔ اس کام کے لیے اُنہیں ایک تجربے کار اور جواں ہمت وزیرِاعلیٰ درکار ہوگا جو صوبے میں امن و امان بھی قائم رکھ سکے اور ترقیاتی منصوبوں میں ہاتھ بٹا سکے۔ بظاہر سید قائم علی شاہ یہ بارِ گراں نہیں اُٹھا سکیں گے' اس کے علاوہ اِس بار ایم کیو ایم اُن کے لیے دردِ سر بنی رہے گی۔ الطاف بھائی گزشتہ دو ہفتوں سے جو ڈرامے کر رہے ہیں' وہ آنے والے حالات کی خبر دے رہے ہیں۔ اُنہوں نے پہلے کراچی کو علیحدہ کر دینے کی بات کی' پھر ٹی وی اینکر پرسن پر بہت برسے اور اُنہیں بہت ڈرایا دھمکایا اور اپنے کارکنوں کو اُنہیں ''ٹھوک'' دینے کے لیے بھی اُکسایا۔ پھر ایک دن رابطہ کمیٹی کے ارکان کی کارکنوں کے ہاتھوں پٹائی کا ڈراما رچایا اور بعد میں ان کارکنوں کی طرف سے معذرتیں پیش کرنے کا حربہ اختیار کیا گیا۔ ان تمام جھمیلوں میں وہ حماد صدیقی کو پاکستان سے فرار کرانے میں کامیاب ہو گئے جو مبینہ طور پر بڑے بڑے جرائم کے ماسٹر مائنڈ سمجھے جاتے ہیں۔ الطاف بھائی ان دنوں مسلسل دباؤ میں ہیں جس میں لحظہ بہ لحظہ شدت آتی جا رہی ہے۔ اِس دفعہ اُنہیں سب سے بڑا خطرہ برطانیہ میں آباد پاکستانی کمیونٹی سے ہے جو ''قائدِ تحریک'' کی شرانگیز حرکتوں پر سراپا احتجاج بنی ہوئی ہے اور میٹروپولیٹن پولیس پر فوری کارروائی کے لیے ہر جائز طریقے سے دباؤ ڈال رہی ہے۔ ہزاروں ٹیلی فون اعلیٰ افسروں کو براہِ راست کیے جا چکے ہیں اور ایس ایم ایس کا سلسلہ بھی دراز ہوتا جا رہا ہے۔

☆☆☆

الطاف بھائی ان دنوں چاروں اطراف سے خطرات محسوس کر رہے ہیں۔ ایک خطرہ ستمبر ۲۰۱۰ء سے منڈلا رہا ہے جب ڈاکٹر عمران فاروق موت کی نیند سلا دیے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس قاتلوں تک پہنچ گئی تھی' مگر پیپلز پارٹی کی حکومت اِس امر کی کوشش کرتی رہی کہ راز فاش نہ ہونے پائے' مبادا ایم کیو ایم کی قیادت زیرِ دام آ جائے۔ اُس حکومت کے ختم ہو جانے سے کسی بھی وقت تحقیقات کی رپورٹ منظرِ عام پر آ سکتی ہے' کیونکہ ایم آئی سکس اِس رپورٹ کو مزید

التوا میں نہیں ڈال سکے گی۔ دوسرا خطرہ اِس دستاویز سے ہے جو عمران خاں منی لانڈرنگ کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے لندن لے کر گئے تھے جس سے ثابت ہوتا تھا کہ الطاف بھائی نے کروڑوں کی منی لانڈرنگ کی ہے۔ اِس کیس کی تحقیقات میں حصہ لینے سے پاکستان کی مرکزی حکومت نے انکار کر دیا تھا۔ اب اس کیس کے دوبارہ کھل جانے کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ تیسرا خطرہ انتخابات کے نتائج سے پیدا ہوا ہے جن میں مسلم لیگ نون مضبوط اکثریت سے قومی اسمبلی میں آئی ہے اور اُسے ایم کیو ایم کو اپنے ساتھ ملانے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ بلیک میلنگ کی شیطانی طاقت سے محروم ہو چکی ہے۔ چوتھا خطرہ ایم کیو ایم کی قیادت کو اپنے اِس امیج سے ہے کہ وہ بھتہ خور' لینڈ مافیا' جرائم پیشہ' موقع پرست اور فسطائی مزاج کے ایک خونخوار گروپ سے تعلق رکھتی ہے اور بوریوں میں بند لاشیں اُس کے سیاسی کلچر کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اِس تاثر کو زائل کرنے کے لیے الطاف بھائی نے رابطہ کمیٹیوں کو تحلیل کرنے کا ڈراما رچایا اور اپنی مخصومیت کا راگ الاپا ہے اور لوٹ مار اور بھتہ خوری اور اسلحے کے استعمال کی ذمے داری بعض افراد پر ڈال دی ہے' حالانکہ ایک دنیا جانتی ہے کہ لندن میں وسیع و عریض دفاتر کے اخراجات بھتہ خوری سے جمع شدہ رقوم ہی سے چلتے ہیں اور ساری بہار اُنہی کے دم قدم سے قائم ہے۔ ایم کیو ایم کو اپنے ''مفتوحہ علاقوں'' میں خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ کھاتی پیتی بستیوں کے پُرجوش اور پُرعزم نوجوان اپنے مینڈیٹ کی حفاظت میں منظم ہوتے جا رہے ہیں۔ اُنہوں نے ساڑھے سات لاکھ کے لگ بھگ ووٹ حاصل کیے ہیں اور کچھ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایم کیو ایم سے بندوق چھین کر ہی دم لیں گے جس کی طاقت سے بلیٹ پر ٹھپے لگائے جاتے رہے ہیں۔ محترمہ زہرہ شاہد حسین کی شہادت سے نوجوانوں کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا ہے اور اِس بہیمانہ قتل کے خلاف امریکہ اور برطانیہ میں بھی مظاہرے پھیلتے جا رہے ہیں۔

دریں حالات داخلی طور پر ٹوٹ پھوٹ کی شکار ایم کیو ایم پیپلز پارٹی کا ہاتھ بٹانے کے بجائے اِس کی مشکلات میں اضافے کا باعث ہوگی۔ جناب نواز شریف نے اعلان کیا ہے کہ وہ سندھ میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم سے تعاون کریں گے۔ اِس اعلان میں تدبر کا اظہار بھی ہے اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کا عزم بھی' تاہم سندھ حکومت کو روایتی سہل نگاری اور کمیشن خوری سے باہر نکلنا اور جدید سماجی اور سیاسی تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا ہوگا۔ سندھ میں توانائی کے بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں جن کو استعمال میں لانے کے لیے کثیر مقدار میں اندرونی اور بیرونی سرمایہ کاری درکار ہوگی۔ اِس کے لیے صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو آپس میں تعاون کے رشتے مضبوط کرنا اور ترقیاتی عمل میں پوری تیاری کے ساتھ حصے دار بننا ہوگا۔ اِس کے لیے چند روز میں ایک سبک رفتار' سیاسی بصیرت سے معمور اور دیانت دار ٹیم کی ضرورت ہوگی جس کا سربراہ جوان جذبوں سے سرشار ہو۔ بنیادی اہمیت مسلم لیگ نون اور پیپلز پارٹی کے درمیان مفاہمت اور عملی تعاون کو حاصل ہے تاکہ مواقع کے جو دریچے کھلنے والے ہیں' اُن سے عوام زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہو سکیں اور صوبے میں تعمیر و ترقی کے چشمے اُبلنے لگیں۔ مرکز اور صوبے میں تعاون کا دائرہ جس قدر وسیع ہوگا' اسی قدر سندھ میں ایک نئی زندگی اور ایک نئے مستقبل کے امکانات روشن ہوتے جائیں گے اور ایم کیو ایم کی سیاست کے مضر اثرات محدود ہوتے جائیں گے۔

☆☆☆

پنجاب میں مسلم لیگ نون کی حکومت تقریباً دو تہائی اکثریت سے تشکیل پانے جا رہی ہے جس کے سربراہ جناب شہباز

شریف ہوں گے۔ اُن کی لگن اور ویژن کی تعریف چینی وزیراعظم نے ظہرانے میں کی ہے اور پاکستان کے اندر اُن کی خوبیوں کے معترف کروڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے اللہ کے فضل و کرم سے اپنے صوبے کے باسیوں کو دہشت گردی سے محفوظ رکھا' اُن کے لیے معیاری سڑکوں اور شاہراؤں کا ایک جال بچھایا اور جنوبی پنجاب میں کسانوں کی فلاح و بہبود کے بہت فلاحی کام کیے۔ اُن کی دھن اور لگن کا یہ عالم تھا کہ اُنہوں نے گیارہ مہینے کی قلیل مدت میں ریپڈ بس سروس کا ایک معجزہ تخلیق کیا جس کی تعمیر پر چار پانچ سال لگ سکتے تھے۔ سیاسی تجزیہ نگار اِس امر پر متفق ہیں کہ مسلم لیگ نون کی شاندار فتح میں جناب شہباز شریف کی اعلیٰ کارکردگی کا حصہ بہت زیادہ ہے' تاہم آنے والے دنوں میں اُنہیں فتح مندیوں کے نشے میں دھت رہنے کے بجائے اپنے رب کا شکر بجالانا اور عاجزی سے کام لینا ہوگا۔ اُنہیں اپنی قیادت میں ایک ایسی ٹیم تیار کرنا ہوگی جو اپنے طور پر ذمے داریاں سنبھال سکے اور اپنے اپنے شعبوں میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی استعداد بھی حاصل کرتی جائے۔ پارلیمانی نظام کے اندر تربیتی مراحل سے گزرنے کے بڑے مواقع موجود ہیں۔ کابینہ کی رکنیت سے پہلے جو ارکانِ اسمبلی پارلیمانی سیکرٹری مقرر کیے جاتے ہیں جو محکمے کی طرف سے سوالات کے جواب تیار کرتے' مسائل کی گہرائی میں اُترتے اور قانون سازی کا تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ہر ایوان میں کمیٹیاں منتخب کی جاتی ہیں جن میں ہر بل کا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جاتا اور اہم ایشوز پر سفارشات تیار کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی درجنوں افراد تربیت کے مختلف مراحل سے گزرتے ہیں۔ اِس کے بعد کابینہ کے اجلاسوں میں فیصلہ سازی کی تربیت ملتی ہے۔ اِس طرح ہر وزیر اپنے محکمے یا ڈویژن کا انچارج ہوتا ہے اور کابینہ کے فیصلوں کی روشنی میں وزارت کے معاملات چلاتا ہے۔ اُسے بیوروکریسی کی اعانت حاصل ہوتی ہے اور وزیراعلیٰ اِس کی کارکردگی پر نگاہ رکھتے اور ضرورت کے وقت راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ارکانِ اسمبلی کے ساتھ مسلسل مشاورت سے حکومت کے سربراہ کی سیاسی طاقت اور اعتماد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ گزشتہ پانچ برسوں میں جناب شہباز شریف مختلف اسباب سے کابینہ' اپنے وزراء اور ارکانِ اسمبلی کو قرار واقعی اہمیت نہیں دے سکے' اور سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے زیادہ تر جونیئر بیوروکریسی پر انحصار کرتے رہے۔ بدلے ہوئے حالات میں اُنہیں ارکانِ اسمبلی کی تربیت بھی کرنا ہوگی اور کابینہ کے ایک مستحکم نظام کو فروغ دینا ہوگا۔ کابینہ میں پنجاب کے ہر ڈویژن سے قابل اور دیانت دار افراد شامل کر کے اُنہیں آزادی اور ذمے داری سے کام کرنے کا اہل بنانا ہوگا۔ اِس طرح پانچ برس کی مدت میں سینکڑوں ارکانِ اسمبلی قانون سازی اور حکومت چلانے کی صلاحیت حاصل کر سکتے ہیں۔

مرکز اور صوبوں میں الگ الگ جماعتوں کی حکومتیں قائم ہونے سے جہاں رنگا رنگی اور تنوع کا خوشگوار احساس اُبھرتا ہے' وہاں یہ دھڑکا بھی لگا رہے گا کہ مرکز اور صوبوں کے درمیان محاذ آرائی کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔ اِس پہلو سے مرکز کی ذمے داریوں میں خاطر خواہ اضافے کا امکان ہے۔ اُسے صوبوں کے ساتھ رابطے مضبوط رکھنے کے لیے ایک واضح پالیسی اور ایک قابلِ اعتماد میکانزم وضع کرنا ہوگا۔ اٹھارویں آئینی ترمیم نے صوبوں کو بڑی حد تک خود مختار بنا دیا ہے' باون فی صد وسائل منتقل کر دیے ہیں اور اُنہیں اپنی بجلی پیدا کرنے کے اختیار بھی دے دیے ہیں۔ اِس اعتبار سے صوبائی وزرائے اعلیٰ کی پوزیشن بڑی مضبوط ہے' تاہم قومی سطح پر اُن کے مرکز کے ساتھ اچھے تعلقات اُن کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں یقینی طور پر مددگار ثابت ہوں گے اور ملکی ترقی کے اہداف بھی بلند تر ہوتے جائیں گے۔ بلوچستان میں افہام و تفہیم کے نتیجے میں جو حکومت قائم ہوگی' وہ مرکزی حکومت کے ساتھ مفاہمت اور تعاون کا راستہ اختیار کرے گی کیونکہ مسلم لیگ نون دونوں حکومتوں میں شامل ہوگی۔ اُن کا

مرکز کے ساتھ ردیہ تعاون اور وسیع تر مفاہمت پرستی کا ہوگا۔ خیبر پختونخواہ میں تحریکِ انصاف کی حکومت بھی مرکز گریز پالیسی اختیار نہیں کرے گی۔ اسی طرح توقع ہے کہ سندھ کی حکومت بھی مرکز کے لیے مسائل پیدا کرنے سے اجتناب کرے گی' کیونکہ وزیر اعظم میاں نواز شریف نے سندھ کے سیاست دانوں کو خیر سگالی اور اُن کے صوبے میں وسیع بنیادوں پر سرمایہ کاری کا پیغام بھیجا ہے۔

☆☆☆

قومی اسمبلی میں تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق مسلم لیگ نون کو سادہ اکثریت حاصل ہوگئی ہے اور جناب نواز شریف تیسری بار وزارتِ عظمیٰ کا حلف اُٹھانے والے ہیں۔ پنجاب میں اسی جماعت کو تقریباً دو تہائی اکثریت کی سند مل گئی ہے اور جناب شہباز شریف ایک بار پھر وزیر اعلیٰ منتخب کر لیے جائیں گے۔ ہم دونوں بھائیوں کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دوسرے حکمرانوں کو بھی جو تینوں صوبوں کا نظم و نسق سنبھالنے والے ہیں۔ نئے پارلیمانی سال کا آغاز اچھے جذبات اور نئے عزائم کے ساتھ ہو رہا ہے جن کی تکمیل کے لیے ہم ربِ دوجہاں کی بارگاہ میں سربسجود ہیں اور گڑگڑا کر دعا مانگ رہے ہیں کہ عوام لوڈ شیڈنگ کے جس عذاب میں جھلس رہے ہیں' اللہ تعالیٰ اس سے جلد از جلد نجات دلائیں' اہلِ وطن کو دہشت گردی کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھیں اور پاکستان کو نظریاتی' معاشی اور معاشرتی طور پر دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائیں! حالات بڑے سازگار ہیں اور اب یہ قیادت کی صلاحیت اور دیانت پر منحصر ہے کہ وہ اپنے اہلِ وطن کے مستقبل کی صورت گری کس انداز میں کرنا چاہتی ہے اور وقت کی طاقت کو اپنے حق میں کیونکر بروئے کار لا سکتی ہے۔ ہم پُرامید ہیں کہ ماضی کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی' خوشی اور خوشحالی کا ایک نیا دور طلوع ہوگا جس میں عوام اپنے ملک بے کراں کے حقیقی مالک ہوں گے۔ اس منزل مراد تک پہنچنے کے لیے سیاسی قائدین کے ساتھ ساتھ سول سوسائٹی کو بھی متحرک' فرض شناس اور ایثار پیشہ رہنا اور وسعتِ قلبی کا ثبوت دینا ہوگا کہ غفلت کی ایک گھڑی ہمیں صدیوں پیچھے لے جا سکتی ہے۔

ہمارے ملک اور قوم کو کیا کیا چیلنج درپیش ہیں' وہ بچے بچے کو معلوم ہے جو ٹھوس اقدامات کا تقاضا کر رہے ہیں۔ ہم ایک مدت سے سنتے آرہے ہیں کہ مسلم لیگ نون کے ورکنگ گروپس ہر شعبے میں اصلاحات نافذ کرنے کی منصوبہ بندی کر چکے ہیں اور انہیں پروفیشنلز کی راہنمائی اور تعاون بھی حاصل ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے' تو ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ حکومت کا ہر قدم صحیح سمت میں اُٹھے گا اور عوام کو جلد ریلیف ملنا شروع ہو جائے گا۔ انتخابی نتائج کے بعد عالمی اور علاقائی لیڈروں نے جس والہانہ انداز میں جناب نواز شریف کا خیر مقدم کیا ہے اور اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے' وہ پاکستان کے لیے نیک فال بھی ہے اور اس امر کا بین ثبوت بھی کہ جناب نواز شریف عالمی برادری میں ایک عظیم لیڈر کے طور پر اُبھرے ہیں جن میں شائستگی بھی ہے' بالغ نظری بھی اور جمہوریت کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی بھی۔ وہ گزشتہ پانچ برسوں کے اندر عوام تک پہنچنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور جہاں انہیں حکومت چلانے کا موقع ملا' وہاں پے درپے معجزے تخلیق ہوتے رہے اور اسی لیے پنجاب میں ن لیگ بہت ہر دلعزیز جماعت کے طور پر اُبھری ہے اور اس نے بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں بھی راستے بنائے ہیں اور سندھ میں بھی اس کا وجود محسوس ہونے لگا ہے۔ شروع کے مرحلے میں جناب نواز شریف کو وفاقی کابینہ کی تشکیل اور دوسرے اداروں کی ترتیب نو سے تمام صوبوں کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ مسلم لیگ نون ایک قومی جماعت ہے جو وفاق کی ہر اکائی کا پنجاب سے زیادہ خیال رکھتی ہے۔ وزیر اعظم سیکرٹریٹ میں جائیں یا وفاقی سیکرٹریٹ میں تو ہر صوبے سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ افسر وہاں موجود ہوں۔

اس ضمن میں ہماری تجویز یہ ہوگی کہ اس بار صدرِ مملکت بلوچستان سے منتخب کیے جائیں اور قومی اسمبلی کا اسپیکر یا ڈپٹی اسپیکر چھوٹے صوبوں سے لیا جائے۔ وفاقی اعلیٰ بیوروکریسی میں بلوچستان اور خیبر پختونخواہ کا حصہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ علامتی قدم جو نیک نیتی اور حُسنِ تدبیر سے اُٹھائے جائیں گے' وہ قومی یک جہتی کو فروغ دیں گے اور پنجاب کے تسلط کے غلط پروپیگنڈے کا نہایت مؤثر توڑ ثابت ہوں گے۔ عوامی تاثر یہ ہے کہ مسلم لیگ نون کی قیادت کو ایم کیو ایم سے فاصلے رکھنا اور اُس کے ساتھ معاہدے کرنے سے باز رہنا چاہیے۔ سیاسی طور پر اُسے ''مصروف رکھنا'' ایک حد تک جائز ہوگا' مگر اُسے اعتماد کی سند عطا کرنا بہت بڑی سیاسی غلطی قرار پائے گی' کیونکہ اُسے ایک بار بھرشرافت کی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ اسی طرح مولانا فضل الرحمٰن سے الگ تھلگ رہنے کے بھی مشورے دیے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

عام انتخابات میں دھاندلی کے خلاف آج بھی آوازیں اُٹھ رہی ہیں اور مختلف جماعتیں احتجاج بھی کر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ کیا ہوا' ایک ایسا موضوع ہے جو گہری تحقیق و تفتیش کا تقاضا کرتا ہے۔ باتیں طرح طرح کی سننے اور پڑھنے میں آرہی ہیں جو زیادہ تر سطحی تاثرات پر مبنی معلوم ہوتی ہیں۔ ہم اس نازک اور حساس معاملے پر تفصیل سے لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے' مگر آنکھ میں تکلیف ہو جانے کے باعث ہمارے لیے مزید لکھنا دشوار ہو گیا ہے۔ ہماری نظر میں عام انتخابات کے نتائج نے تین بڑے پیغام دیے ہیں۔ ایک یہ کہ عوام شہروں اور قصبوں میں سیاسی طور پر بہت بیدار ہو چکے ہیں اور ملکی معاملات میں اُن کی دلچسپی حیرت انگیز طور پر بڑھتی جا رہی ہے۔ جناب عمران خاں اس اعتبار سے قوم کے محسن ہیں کہ اُنہوں نے کھاتے پیتے گھرانوں کے بے پروا لڑکوں اور خواتین میں پولنگ اسٹیشنوں کی طرف جوق در جوق آنے کا صور پھونکا اور انہیں مینڈیٹ کی حفاظت کا گہرا شعور عطا کیا۔ یہ اسی جوش و خروش کا کرشمہ تھا کہ نون لیگ کے نوجوان بھی پوری طرح سرگرم ہوئے اور یوں ٹرن آؤٹ پہلی بار شہروں میں ۶۰ اور ۷۰ فی صد تک اور اوسطاً ۵۴ فی صد تک پہنچ گیا۔ یہ باشعور نوجوان اب جمہوریت کی حفاظت کریں گے۔ دوسرا پیغام ہمیں انتخابات سے یہ ملا ہے کہ عوام اب اُسی حکومت کا ساتھ دیں گے جو اچھی حکمرانی کا اعلیٰ معیار قائم کرے گی اور اُس کا ڈلیوری سسٹم جدید تقاضوں کے مطابق ہوگا۔ انتخابات میں عوام نے بڑے بڑے بُرج اُلٹ دیے ہیں' لغاری' گیلانی' چیمے' چٹھے' وٹو' راجے اور بڑے بڑے نامی گرامی شکست سے دوچار ہوئے ہیں۔ آنے والے وقتوں میں سیاسی نعروں اور شہادت کی داستانوں سے کام نہیں چلے گا۔ تیسرا پیغام یہ ہے کہ نگراں حکومتوں کے نظام اور الیکشن کمیشن کی ہیئت ترکیبی کے پورے فلسفے پر خطِ تنسیخ کھینچ دینا ہوگا۔

میں اس دعا پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے نئے حکمرانوں کو اُن غلطیوں سے محفوظ رکھے جن سے ملک اور جمہوریت کو بے پناہ نقصان پہنچا اور ایسے کام کرنے کی توفیق عطا کرے جو عوام کی بھلائی اور اسلام کی سربلندی کے باعث ہوں! ہماری یہ بھی آرزو ہے کہ سیاسی جماعتوں کے دروازے تازہ افکار' تازہ دم اور جمہوری آداب سے بہرہ ور نوجوانوں کے لیے کھلے رہیں اور پیرانِ تسمہ پا کی اجارہ داریاں ختم ہو جائیں' کیونکہ بہت ساری اجارہ داریاں انتخابات نے ختم کر دی ہیں اور جو باقی ہیں' انہیں پُرجوش عوام پاش پاش کر ڈالیں گے۔

اہلِ وطن کو ایک نئی صبح کی تازگی' ایک نئے عہد کی تابندگی اور شعور و آگہی کی بھینی بھینی خوشبو مبارک!

انٹرویو

میں نے نگراں وزیر کیوں نہیں بنائے؟

"میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس ٹنوں کے حساب سے دیانت ہے ہوسکتا ہے اونس کے برابر ہی ہو مگر میں نے اپنا کام کیا پوری دیانت سے"

گوادر بالکل دبئی بن سکتا ہے

میں نہیں چاہتا تھا میرا بھائی الیکشن ہارے

شہباز شریف کی 16 وزارتوں کا ریکارڈ کیسے ٹوٹا؟

صوبہ بلوچستان کے نگراں وزیر اعلیٰ

نواب غوث بخش باروزئی

سے دلچسپ الوداعی ملاقات کا احوال

اختر عباس

لفٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ انڈس ہال کی گرمی سے گھبرا کر باہر نکلے تو ہر کوئی جلد از جلد گراؤنڈ فلور پر واقع اواری ہوٹل کی لابی میں جانے کا متمنی تھا۔ میں متلاشی نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھتا آرہا تھا۔ فرسٹ فلور کی لابی میں دو کرسیاں خالی نظر آئیں تو میں نے جلدی سے بڑھ کر الطاف صاحب سے کہا: "یہ بہت پرسکون جگہ ہے۔ بلوچستان کے نگران وزیر اعلیٰ جناب غوث بخش باروزئی سے انٹرویو کے لیے بے حد موزوں ہے۔" انھوں نے میرے انتخاب پر صاد کیا اور آگے بڑھ کر لفٹ کے کھلے دروازے سے جناب باروزئی کو باہر لے آئے۔ آنے والے ایک گھنٹے کے لئے ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے ملک کے سب سے حساس صوبے، وہاں آنے والی سیاسی تبدیلیوں، مخالفت کی لہروں اور آنے والے دنوں کی الجھتی زلفوں کے سنوارے جانے کی باتیں کررہے تھے۔

نواب غوث بخش باروزئی جو میڈیکل ڈاکٹر بھی ہیں، کالاہور میں چند ماہ پہلے تعارف ایک ایسے بہادر

دانشور کے طور پر ہوا جو کسی لگی لپٹی رکھے بنا پوری سچائی کے ساتھ تلخ سے تلخ بات بھی بڑی آسانی سے کر جاتا ہے۔ ان کی باتیں اور جملے ہی نہیں، ان جملوں کے پیچھے پوشیدہ مفہوم بھی جب آشکار ہوتا تو پنجاب یونیورسٹی کے ایک ٹھنڈے ہال میں بیٹھے سامعین کو بھی پسینہ آجاتا۔ اس روز انھوں نے لاہور میں بہت سے دلوں میں اپنے لیے محبت اور احترام کا بیج بو دیا تھا۔ اسی لیے چند ماہ بعد جب وہ صوبے کی بالادست پارٹیوں کی رضامندی سے نگران وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے تو ان کی شخصیت سے کتنی ہی توقعات باندھ لی گئیں جن پہ وہ خاصی حد تک پورے بھی اترے۔

بلوچستان کے مخصوص حالات عالمی اور مقامی سازش، اقتدار میں حصہ لینے والوں کی بے صبری، روٹھے ہوئے اور ناراض لوگوں کی دوریاں، نواب اسلم رئیسانی کی "باکمال حکومت" کے اثرات، سیاسی چین آف کمانڈ کی عدم موجودگی اور روزمرہ فیصلوں میں بھی بالادستوں کی مرضی اور جانبدار حکمرانی کے کتنے ہی سپیڈ بریکرز تھے جو ان دو ماہ میں نواب غوث بخش باروزئی نے اس احتیاط سے عبور کیے کہ ان کا اپنا حقیقی بھائی بھی الیکشن ہار گیا اور وہ کچھ نہ کرسکے۔ وہ ایک ہی وقت میں اپنی خاندانی نجابت اور شرافت پہ نازاں ہیں تو اگلے ہی لمحے کچھ افسران بالا کی بے وفائی اور دھوکہ دہی کے شاکی بھی ہیں۔ جہاں انھیں اپنی ذات پر سابق حکومت اور اپوزیشن کے مشترکہ اعتماد کی خوشی ہے وہاں وزیر بننے کے شوقین سیاست دانوں کے رویّے سے شکایت بھی ہے۔

نواب غوث بخش باروزئی نے ابتدائی تعلیم سبی اور کوئٹہ سے پائی۔ کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج سے گریجویشن کی، پھر 22 سال محکمہ صحت میں خدمات سرانجام دیں اور 22 ویں گریڈ سے ریٹائر ہوئے۔ اسکوائش اور ٹینس کے اچھے کھلاڑی ہیں۔ ہارس رائیڈنگ کا بھی خوب شوق ہے۔ ان کا کسی پارٹی سے باقاعدہ تعلق نہیں رہا البتہ ان کے والد نواب محمد خان باروزئی بھٹو دور میں بلوچستان اسمبلی کے اسپیکر چنے گئے اور 1997ء میں صوبے کے وزیر اعلیٰ بھی مقرر ہوئے۔

ہوٹل کی لابی میں دو ہی کرسیاں تھیں۔ درمیان میں ایک گول میز رکھی تھی۔ نواب صاحب کا ذاتی اسٹاف اور سیکیورٹی والے ذرا ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ وہ لوگ ہماری گفتگو میں بالکل مخل نہیں ہوئے۔ سوالات کا سلسلہ دلچسپی اور جاذبیت کے ساتھ ایسا دراز ہوا کہ خبر ہی نہیں ہوئی کہ آگے، دائیں بائیں، تھوڑے فاصلے پر کتنے ہی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بے شک ہم سب کے دلوں میں بلوچستان کے حوالے سے سوالات کا ایک ایسا جہان آباد ہے جہاں ہر دوسرا بلوچ راہنما اپنا اپنا علم اٹھائے، ریاستی اسٹیبلشمنٹ سے بغاوت کے پھریرے لہراتا ہے۔ کبھی مایوسی اور کبھی دھمکی کو اپنا ہتھیار بناتا ہے۔ کبھی پرانے الزام دہراتا ہے اور کبھی بدلتی نئی سیاسی حقیقتوں سے روشناس کراتا ہے ایسے میں کہیں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آئیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ پاکستان میں رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑے صوبے کے وزیر اعلیٰ میرے سامنے تھے اور دل چاہتا تھا کہ سیاسی حالات پر گفتگو سے پہلے اُن کے بارے میں ضرور جانا جائے جنھوں نے نگرانی کا عبوری دور بڑی خوش اسلوبی سے مکمل کیا ہے۔ آئیے آپ بھی ہماری گفتگو کا حصہ بنیے۔

ایڈیٹر: یہ جو 60 دن نگرانی کے گزرے ہیں کتنی خوشی دے گئے۔ کیا والد کے بعد خود وزیراعلیٰ بننا کہیں زیادہ خوشی دینے والا احساس نہیں ہے؟

مہمان: دیکھیں خوشی کا عنصر تو اس میں ہے کہ اب کیسے لوگ آتے ہیں البتہ اللہ کی طرف سے یہ ایسا موقع ملا کہ مجھے ڈٹ کر کام کرنا تھا تو میں نے پوری ایمانداری سے اپنا کام کیا۔ اپنی سوچ اور اپنی ذہانت کے ساتھ جتنی دیانت داری سے یہ کام ہوسکتا تھا وہ میں نے کیا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ میرے پاس ٹنوں کے حساب سے دیانت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اونس کے حساب سے ہو۔ بہرحال دیانت سے کام کیا۔ میرے لیے بہت بڑا چیلنج تھا، خوشی کا عنصر یہ بھی تھا کہ میں نے اپنے والد کے بعد دوبارہ اسی منصب پر کام کرنے کی کوشش کی اور میں آپ کو بتاؤں کہ یہ کام کوئی مشکل نہیں ہوتا اگر آپ کی نیت ہو کام کرنے کی تو کام بڑے آرام سے ہوجاتا ہے۔ اچھا کام کرنا کوئی اتنی بڑی راکٹ سائنس نہیں ہے۔ آپ کی سوچ سیدھی ہوگی تو کام بھی سیدھا ہوجائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے میرے والد نے ڈلیور کیا تھا۔ ویسا ہی میں نے کرنے کی کوشش کی۔ میرے والد منتخب چیف منسٹر تھے جب کہ میں نامزد وزیر اعلیٰ تھا۔ ہماری پوری اسمبلی میں جو پارٹیاں تھیں اور جو قوم پرست باہر بیٹھے تھے..... ان سب نے مکمل طور پر مجھے سپورٹ کیا اور سب نے کہا کہ انھیں مجھ پر اعتماد ہے۔ یہی اعزاز کیا کم ہے۔

ایڈیٹر: آپ کے والد نواب محمد خان باروزئی بلوچستان اسمبلی کے اسپیکر بھی رہے اور 1977ء میں بھٹو صاحب کے آخری وزیراعلیٰ بھی۔ آپ ایسے بیٹے ہیں جنھوں نے اپنے والد کی یاد کو تازہ کردیا اپنے کام کی وجہ سے۔ یوں کہیے کہ نئی نسل کے لئے تو آپ کا کام اپنے

کابینہ کیوں نہ بنائی؟
شہباز شریف کی 16 وزارتوں کا ریکارڈ کیسے ٹوٹا؟

یہ ایک حیران کن امر ہے کہ مجھے کئی طرف سے حملے سہنے پڑے۔ ہر کوئی وزیر بننا چاہتا تھا۔ ایک صاحب نے ایک کروڑ کی آفر کی تو دوسرے نے دو کروڑ کی کہ اسے وزیر بنالیا جائے۔ یہ سخت مشکل مقام تھا۔ وہ کہتے تھے آپ کا کیا جائے گا۔ میں سوچتا تھا کچھ چلا جائے گا ان کا خیال تھا دو ماہ کی وزارت ہے۔ ساری عمر سابق وزیر کہنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

وہاں تو پہلے سارے اراکین اسمبلی ہی در پے تھے، ایک نے تو دھمکی دے دی بابا وزیر بنالو ورنہ۔ ورنہ کیا میں نے پوچھا بولا ہم دعا گو نہیں رہیں گے؟

میں نے بہت سوچا کہ جو کام وزیروں نے کرنا ہے میں خود کیوں نہیں کرسکتا۔ I know what can Ido تو جو کام میں خود کرسکتا تھا، خود کرلیا۔ اب الیکشن کرواتا اس کی نگرانی کرتا یا اپنے وزیروں پر پہرہ دیتا۔ جو آتا، کسی لسٹ کا ذکر کرتا کہ اس میں اس کا نام ہے۔ میں نے بتایا کہ میرے پاس تو کوئی لسٹ نہیں ہے نہ کسی نے دی ہے۔ بس پھر Delay کرتے کرتے وقت ہی گزار دیا کہ کوئی شوقیہ وزیر بن سکتا۔

والد کے تعارف کا باعث بنا ہے۔

مہمان: میری ذات کا جو کمپوزیشن ہے اور کام کا جو حوالہ ہے اس نے بھی ثابت کیا ہے کہ میرا جو ڈی۔ این۔ اے ہے، اُس میں کوئی نہ کوئی خوبی ہے۔

ایڈیٹر: یہ جو آپ کے حوالے سے تیرہ زبانوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ آپ نے کب سیکھیں؟

مہمان: بچپن سے، کچھ بڑے ہوکے، آہستہ آہستہ تعلیم کے بالکل اختتام پہ امریکا گیا، جرمنی وغیرہ گیا۔ جہاں گیا وہاں سیکھا۔ پھر یہ بات میرے مزاج اور عادت کا حصہ بن گئی ہے۔

ایڈیٹر: اپنی فیملی کے بارے میں بتائیے آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں۔ کتنے بچے ہیں کیا کرتے ہیں؟

مہمان: 2 بھائی ہیں میرے اور چار بہنیں۔ میری ایک بیٹی ہے اور 2 بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا ایم۔ بی۔ اے کرچکا ہے۔ آخری سمسٹر کا امتحان دے گا۔ چھوٹی بیٹی BSc کر رہی ہے ویسے ڈاکٹر بننے کا اسے شوق تھا کیونکہ میں اُسے اکیلا چھوڑ نہیں سکتا اپنے ساتھ ساتھ رکھتا ہوں۔ لکھتی بھی بہت اچھا ہے۔ میں آپ کو بھجواؤں گا اس کی تحریر۔ اگر آپ سمجھیں صحیح ہے تو دیکھ لیجیے گا کہ ایک نواب کی پوتی کی سوچ کیا ہے؟

ایڈیٹر: جب آپ چند ماہ پہلے دورے پہ لاہور آئے تو آپ نے اپنی گفتگو سے لاہور کے اہل علم کے دل جیت لئے، دل سے کی ہوئی باتوں سے، اُس سے ایک تصور یا خیال یہ بھی پیدا ہوا کہ آپ کے خیالات میں اتنی clarity ہے۔ کیا بہت پڑھتے ہیں آپ؟

مہمان: جی، میں خاصا پڑھتا ہوں۔

ایڈیٹر: کیا پڑھتے ہیں آپ، کس طرح کے لوگوں کو، کن کتابوں کو؟

مہمان: دیکھیے، جو بھی نئی سیاسی کتابیں آتی ہیں اُن میں سے پڑھتا ہوں، ادب کی کتابیں پڑھتا ہوں، افسانے وغیرہ بھی دیکھتا ہوں، میں اپ ڈیٹ رکھتا ہوں خود کو جدید ترین ٹیکنالوجی کے ساتھ۔ کیا آچکا ہے، کیا کچھ آنے والا ہے۔

میں اسکول کے زمانے میں اردو میں بھی 96,95 نمبر لیتا رہا ہوں۔ میں بہت ہی اچھا اسٹوڈنٹ تھا اگرچہ ایک سردار کا بیٹا تھا۔ سب اساتذہ تعریف کرتے تھے۔ جب پانچویں میں پہلی پوزیشن لی تو پرنسپل نے اسمبلی میں کھڑا کرکے کہا کہ دیکھو اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے، اس نے پوزیشن لی ہے۔ کیونکہ اچھی کتابیں پڑھتا ہے۔ محنت کرتا ہے کل کو اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔

ایڈیٹر: اپنے والد کے بارے میں کچھ بتائیے، یہ نسل اُن کو نہیں جانتی، آپ تو اُن کو بہت آئیڈیلائز کرتے ہیں۔

مہمان: میرے والد صاحب بہت ہی نفیس انسان تھے اگر آپ اُن کو دیکھتے تو کبھی بھول نہ پاتے۔ ہمارے ہاں لوگ اب بھی انھیں آئیڈیلائز کرتے ہیں۔ بیٹے کے لئے باپ تو باپ ہوتا ہے، وہ میرے والد ہیں اس لیے میں نہیں کہہ رہا، میں آپ کو بتاؤں میں نوابزادہ نصراللہ خان، ولی خان سب سے ملا ہوں بابا کے ساتھ، میں اُن میں سے کسی کو اپنے والد کے نزدیک بھی نہیں دیکھتا۔ بے شک وہ بات زیادہ نہیں کرتے تھے، حالانکہ وہ بڑی بڑی پوسٹوں پہ رہے، آپ کبھی کوئٹہ آئیے، ہمارے مہمان بنیے پھر آپ سے ضرور تفصیلی بات ہوگی پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ ان کی کیا کیا خاص بات تھی۔

ایڈیٹر: سنا ہے 1977 کے مارشل لاء لگنے سے پہلے انہوں نے بھٹو صاحب سے کہا تھا کہ یہ الیکشن مت کراؤ اگر کراؤ گے تو تم نہیں رہو گے۔

مہمان: یہ بالکل درست ہے۔ انھوں نے بھٹو سے کہا۔ الیکشن ٹائم پر کروانا مگر الیکشن ٹائم پہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ وقت سے پہلے ہوئے تھے۔ سب نے بھٹو صاحب کو راضی رکھنے کے لئے کہا یہ ٹھیک ہے، صحیح ہے۔ پنجاب کے نواب صادق قریشی نے فرمایا کہ I want to hold Elections، کوئی مسئلہ ہی نہیں، پی پی کلین

سویپ کرے گی۔

کابینہ کے اجلاس میں سندھ نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے، N W F P والوں نے بھی کہا الیکشن ضرور کرواؤ..... جب میرے والد کی طرف آئے تو انھوں نے کہا You want to Hold Elections or would you listen to me. بھٹو صاحب نے کہا ''نہیں ہم آپ کے خیالات کو سننا چاہتے ہیں، آپ بولیں''، تو بابا نے کہا کہ ''اس وقت جب آپ الیکشن کروائیں گے، تو یاد رکھیں کہ یہ جو 4,3 ضمنی الیکشن ہوئے ہیں ان کے بعد وہ آپ کو دھاندلی ماسٹر کہنے لگ گئے ہیں۔ جب آپ کے جنرل الیکشن ہوں گے تو یہ کہیں گے کہ اس نے الیکشن میں دھاندلی بڑے پیمانے پر کروائی ہے، رزلٹ نہیں مانیں گے، لوگ ان کی بات مانیں گے پھر تحریک چلے گی، وہ لاشیں ڈھونڈیں گے، لاشیں ان کو مل جائیں گی۔ الیکشن اکتوبر، نومبر میں اچھے ہوں گے، آپ تب کرالیں، باقی آپ کی مرضی ہے۔ مولانا نیازی وہاں بیٹھا ہوا تھا سامنے تو اُس نے کہا کہ یہ الیکشن جب ہوں گے دوبارہ تو کیا پیپلز پارٹی بلوچستان سے نہیں جیتے گی اور آپ دوبارہ چیف منسٹر نہیں بن پائیں گے؟ ..... نیازی مرحوم کی بات سن کر میرے والد ہنسے۔ وہ بہت صاف اور واضح بولتے تھے۔ ان کی آواز ایسی تھی کہ کیا بتاؤں، شاندار اور کراری جیسے ریڈیو والوں کی بھاری بیس کی آواز ہوتی ہے۔ کہا، مولانا مجھے اپنی فکر نہیں ہے مجھے آپ کی فکر ہے، میں الیکشن کے بعد آپ کو وہاں پہ فیڈرل منسٹر نہیں دیکھتا۔ تو بھٹو نے کہا:

Yes I agree with you مگر مجھ پر بڑا پریشر ہے۔

پھر انہوں نے یہ بھی کہا، یاد رکھیے جیسے ہی آپ اعلان کریں گے الیکشن کا تو اپوزیشن کا الائنس بن جائے گا۔

کیا نواز شریف کا گوادر کو دبئی کا بنانے کا منصوبہ کامیاب ہو سکے گا؟

وہاں بنانے کا انفراسٹرکچر ہے اللہ کرے کہ یہ بنا دیں۔ کیوں نہیں بن سکتا، اسلام آباد بن سکتا ہے پہاڑیوں کے درمیان تو یہ شہر دبئی کیوں نہیں بن سکتا۔ وہاں پہ آپ کے پاس پانی ہے، بہت کچھ ہے۔ بندرگاہ بنے گی۔ بالکل دبئی بنے گا۔ دبئی بھی تو ایسے ہی تھا، وہاں پہ جب وہ کر سکتے ہیں تو ہمارے لیے تو بہت ہی زیادہ آسان ہے۔ ہماری پورٹ تو بہت ہی اچھی ہے، بہتر ہوگی۔

ایڈیٹر: سنا ہے اس موقع پر ISI کے چیف نے نواب باروزئی کی تردید کرنے کی کوشش کی تھی۔

مہمان: جنرل جیلانی تب ڈی۔ جی آئی ایس آئی تھے۔ انھوں نے بٹن دبایا اور کہا ''سر! ایسا نہیں ہوگا۔ There is no information of any Political allience۔ بابا ہنس کے بولے جنرل صاحب! آپ کو جو رپورٹس آتی ہیں کچھ کچھ رپورٹس مجھے بھی آجاتی ہیں۔ جونہی اعلان ہو جائے الیکشن کا اگر تیسرے دن Allience نہیں بنا تو جو چور کی سزا وہ میری، آپ اپنی سزا خود سوچ لیں اور تیسرے دن ہی PNA بن گیا اور وہی ہوا، الیکشن میں دھاندلی کا الزام بھی لگا، الزام لگنے کے بعد زندہ باد مُردہ باد بھی ہوا۔ بابا کہتے ہیں کہ اجلاس کے بعد کھانا تھا تو کھانے کے وقت بھٹو صاحب نے کہا کہ پیپلز پارٹی اگر جیتی تو اگلے سیٹ اپ میں I will make you the President of Pakistan.

یہ ہے میرا اور میرے والد کا بیک گراؤنڈ۔ یہ تھی ان کی دانش اور تعلقات، وہ بہت معاملہ فہم انسان تھے۔

ایڈیٹر: ایک بات بتائیے کہ آپ کے والد چیف منسٹر

بنے، حلف اُٹھایا لیکن چیف منسٹر ہاؤس میں نہیں ٹھہرے۔ اصل کہانی کیا تھی؟

مہمان: وہ اُس وقت جو چیف منسٹر تھا۔ اس کی گورنمنٹ کرپشن کے باعث ختم کردی گئی تھی، گورنر راج اُس کے بعد میرے والد چیف منسٹر بنے تو اسے سپیکر بنا دیا گیا۔ ان کا نام جام غلام قادر لسبیلہ تھا۔ اس نے بھٹو صاحب سے کہا کہ گھر اور گاڑیاں مت لیں مجھ سے۔ بھٹو نے ہنس کر کہا کہ وہ چیف منسٹر کا گھر ہے گاڑیاں اُس کی ہیں، اس سے پوچھو۔ تو بابا نے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں اگر وہ چیف منسٹر ہاؤس میں خوش ہیں تو ٹھیک ہے خوش رہیں۔ چیف سیکریٹری صاحب آگئے اور بولے سر! آپ کیا بات کر رہے ہیں آپ چیف منسٹر ہیں آپ کا پروٹوکول ہے وہ گھر اور گاڑیاں۔ بابا نے کہا کہ میرا پروٹوکول یہ ہے کہ میں چیف منسٹر ہوں، چیف ایگزیکٹو ہوں میرے قلم سے جو آرڈر نکلے گا وہ Implement ہوگا۔ میں اگر کسی جھونپڑی میں بیٹھوں گا تو بھی چیف منسٹر ہوں گا۔ تو یہ خیال ہے ..... کبھی آپ کوئٹہ آئے تو دکھاؤں گا آپ کو جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ نہ انہوں نے کبھی جاہ وجلال کی خواہش کی نہ ہم نے۔ اور اللہ نے ہمیشہ عزت دی، رتبہ دیا۔

ایڈیٹر: آپ نے گزشتہ دنوں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب سے بلوچی طلبہ کے رزلٹس کے بارے میں بات کی۔ اتنی فکرمندی کیوں؟

مہمان: میں سمجھتا ہوں کہ 10 سال بعد اس کا فائدہ نظر آئے گا۔ ابھی یہ 100 طلبہ ہیں جن کو پنجاب یونیورسٹی نے اسکالرشپ دیا ہے۔ کل دو سو ہو جائیں گے۔ یقیناً وہاں پر جا کر لوگوں کو خوشی ہی دیں گے۔ اللہ نے چاہا تو بلوچستان کی حالت بدل دیں گے۔ ابھی وہاں پورے صوبے میں صرف دو مقامی سیکرٹری ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ لاہور کے تعلیمی اداروں کے پڑھے ہوئے بچے جو مختلف ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس وقت اپنے اپنے ملکوں میں بیوروکریٹ ہیں اور مختلف بڑے عہدوں پر لگے ہوئے ہیں تو ہمارے بچے بھی ہمارا کل بہتر کریں گے۔

س: نگراں وزیراعلیٰ بننے کے بعد نگراں وزیراعظم سے پہلی ملاقات کیسی رہی۔ آپ کا پہلا تاثر کیا تھا؟

مہمان: کھوسو صاحب کو میں جانتا ہوں، خاندانی ہیں، اچھے بندے ہیں، تاثر تو میرا پہلے بھی اچھا تھا اُن کے بارے میں۔ وہ گورنمنٹ میں بھی رہے، چیف جسٹس بھی رہے ہیں۔ انہوں نے کوئی غلط لیڈ (Lead) نہیں کیا۔

ایڈیٹر: آپ اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ یہ جو ججز ہیں ان کو سیاسی مناصب دینے کی بجائے غیر جانبدار سیاسی لوگوں کو ہی ذمہ داری دی جائے نگراں وزیراعظم اور وزرا تو اپنے گھروں سے نکلے ہی نہیں۔ انھیں الیکشن والے دن چاروں صوبوں میں وزٹ کرنا چاہئے تھا۔ خود جگہ جگہ جاتے۔ ان کے وزرا دورے کرتے۔ عام تاثر یہی ہے ان کی وزارتیں دفتروں اور گھروں تک ہی رہیں۔

مہمان: بس ٹھیک ہے جی، ان کے لیے یہی صحیح ہے کہ کام ٹھیک ہو گیا نا جیسے بھی کیا۔ اب اس پر اور کیا بات کرنا۔

ایڈیٹر: آپ سابق ہونے جا رہے ہیں تو کیا کہتے ہیں، بلوچستان کے بارے میں یہاں بہت اُمید پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ نواز شریف گورنمنٹ آرہی ہے تو وہاں کے اختر مینگل، محمود اچکزئی، ڈاکٹر عبدالمالک، بگٹی اور مری جیسی سیاسی قوتوں کے ساتھ ان کی قربت ہے اور وہ جو ایک ڈر تھا، خوف تھا،

ناراض بلوچوں کا، وہ کم ہو رہا ہے۔ کیا لوگ وہاں پر بھی ایسا سوچتے ہیں؟

مہمان: دیکھئے اس وقت سیاسی تقسیم کیا رنگ لاتی ہے۔ میاں صاحب دو بار وزیرِ اعظم رہے۔ بہت تعلقات بھی ہیں ان کے لیکن سوال یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں مینگل کیا لائن پکڑتے ہیں۔

ایڈیٹر: لیکن اختر مینگل تو ان کی ڈرائیونگ سیٹ پر رہے تھے اور بہت احترام کا تعلق رہا دونوں میں۔

مہمان: بہرحال وہ تو بیٹھنا ہی پڑتا ہے، اس کو آپ اتفاق ہی کہیں۔ ابھی کیا نقشہ بنتا ہے، واضح نہیں ہے۔

ایڈیٹر: کہا جا رہا ہے کہ آئندہ صدر بلوچستان سے آئے گا۔

مہمان: اگر آجائے تو بہت اچھا ہے، پھر ایسا ہو کہ وہ کام بھی کر سکے۔ پریذیڈنٹ ہاؤس میں جا کے رہنے اور بسنے کے لئے نہ آئے، وہاں یہ جائے کام بھی کر کے دکھائے۔

ایڈیٹر: نواب صاحب یہ جو گوادر ہے یہ بلوچستان کا بھی سرمایہ ہے اس کی ترقی میں اصل میں کیا رکاوٹ ہے۔

مہمان: وہاں ٹرانسپورٹیشن کے لیے سڑک ہی نہیں ہے پہلے سامان کراچی آتا ہے پھر کہیں اور جاتا ہے، آنے والے دنوں میں سب سے پہلے وہاں سڑک دینی ہوگی۔ یہاں پر اگر سڑکیں نہ ہوں گی تو یہ بالکل Useless ہے۔ پورٹ پر جانا مشکل ہے، لوگ اوپر چڑھ نہیں سکتے، مناسب سیڑھی تک نہیں ہے، جو ہے وہ ہل رہی ہے ڈر ہی رہتا ہے کہ کہیں گر نہ جائے۔ سامان کی آسان ترسیل کے بغیر ترقی نہیں ہوگی، وہ ضروری ہے۔

ایڈیٹر: بلوچستان کے جو تعلیمی ادارے ہیں وہاں بہت سے اُستاد مارے گئے، ڈاکٹرز بھی کافی جان سے گئے، اُس کا نقصان آپ کے بچوں کے فیوچر کو ہوگا، کیا

نوگوایریاز

ایک لحاظ سے تو سارا بلوچستان ہی نوگو ایریا ہے ہمیں سڑک چاہیے سڑک ہوگی تو رابطہ ہوگا۔ آسانی سے کہیں آجا سکیں گے۔ خود میرا حال یہ تھا کہ ہیلی کاپٹر کے بغیر موومنٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک دو جگہ پولنگ سٹاف نہیں پہنچ سکا۔ میں نے اپنا ہیلی کاپٹر دیا کہ جاؤ وہ گھوم پھر کر واپس آگئے کہ نیچے سڑک نہیں ہے خوف سے ہیلی کاپٹر کو ہی نہیں اتارا۔

بلوچستان کا اصل مسئلہ سڑکوں کا نہ ہونا ہے۔ رابطہ ہی نہیں ہے۔ آپ ہمیں ہسپتال بنا دیتے ہو۔ ہمیں سڑک چاہیے۔ ہسپتال کا نمبر بہت بعد میں آتا ہے تو آپ ہمیں ہسپتال بنا دیتے ہو۔ چلائے گا کون؟ پھر سی ایم ایچ والوں کو دینا پڑتا ہے کہ چلاؤ۔

اپنی مرضی نہ دیکھیں ہماری ضرورت دیکھیں۔

اس بات کو لوگ محسوس کرتے ہیں وہاں پہ؟

مہمان: ہماری پوری نسل تباہ ہوگئی ہے، اس طرح سے عوام کو تو بڑا احساس ہے لیکن جو لوگ ایسا کر رہے ہیں اُن کو اگر احساس ہوتا تو وہ ایسا کرتے ہی کیوں؟

ایڈیٹر: آپ سے اگر آنے والا جو چیف منسٹر کہے کہ مجھے دو چار ایڈوئس کیجیے تو آپ کیا کہیں گے؟

مہمان: میں کہوں گا کہ پہلی بات بھی میرٹ ہے دوسری بھی میرٹ ہے تیسری بھی میرٹ ہے جب میرٹ پیش نظر رکھے ہر فیلڈ میں تو کام آپ کا آسان ہو جائے گا اور مشکلات بھی کم ہو جائیں گی۔

ملاقات ختم ہوئی تو ہم نے نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنے مثبت سیاسی اور سماجی رول کو اسی طرح پاکستان اور بلوچستان کے عوام کی بہبود کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ جاری رکھیں۔ ■■■

میرا نشیمن بھی تُو شاخِ نشیمن بھی تُو

ایک انوکھے موضوع پر دل سے لکھی تحریر
ایسی باتیں جو دل میں رہتیں تو ہم ان کی خوشبو، ذائقے اور تاثیر سے ہی محروم رہ گئے ہوتے

یاسمین حمید

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

مالک! تیرا حلم مجھ گنہگار کے لیے کتنا زیادہ ہے۔ میں تیری صریحاً نافرمانی کرتی ہوں، تیری دی ہوئی نعمتوں کو تیری مرضی کے خلاف استعمال کر کے تیرے غضب کو بھڑکاتی رہتی ہوں، مگر اے حلیم آقا! تو مجھے پھر بھی برداشت کیے ہوئے ہے نہ صرف برداشت کیے ہوئے ہے بلکہ اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ میرے کام بناتا ہے، میری مشکلوں کو آسان کرتا ہے اور اپنے گناہوں کے ہاتھوں جن ذہنی اذیتوں میں مبتلا ہوتی ہوں، ان سے نجات دینے والا بھی تُو ہی ہے۔ میری مسلسل نافرمانیاں، نمک حرامیاں مجھے ہرگز اس قابل نہیں چھوڑتیں کہ پھر اپنی حاجات لے کر تیرے دربار میں آؤں۔ آخر کس منہ سے آؤں؟ مگر اے مالک! تیرا بے پناہ رحم و کرم، تیرے عفو و درگزر کی وسعتیں مجھ عاصی و گنہگار کو پناہ دے دیتی ہیں۔

اے میرے مالک! یہ صرف تیرا ہی کرم ہے یہ صرف تیرا ہی حلم ہے تو مجھ گناہوں میں لتھڑی ہوئی کو اپنے درِ رحمت سے دھتکارتا نہیں۔ مجھے شرم نہیں دلاتا، مجھ عاصی و خطا کار کو نوازنے سے انکار نہیں کرتا، ذلیل و رسوا ہونے سے بچاتا ہے، مانگنے سے نہیں روکتا۔ تمام نافرمانیوں، ڈھٹائیوں، سرکشیوں اور گناہ کی غلاظتوں کے باوجود تُو مجھ سے کہتا ہے کہ مانگ! جتنا اور جس قدر مانگنا ہے مانگ لے، میرا دامنِ رحمت اب بھی تجھے پناہ دینے کے لیے تیار ہے۔

مالک! تیرا یہ حلم، یہ عفو و درگزر، یہ چشم پوشی کا

روّیہ مجھے اس پُرخطا زندگی میں بھی مایوس نہیں کرتا۔ تیری یہ یقین دہانی کہ:

اپنی منزل کی طرف لوٹ کے آجا اب تو
آ! کہ مل جائے پھر اللہ کی نصرت تجھ کو!

میری ہمت بندھاتی ہے، مجھے گناہوں کے چکر سے نکال کر نیکی کی راہوں پر لاتی ہے۔

مالک! گناہوں کے اندھیروں سے تیری اطاعت کی روشن راہوں پر میرا آجانا، صرف تیرے حلم کا مرہونِ منت ہے۔

اے میرے مالک! صرف اور صرف تُو ہی اس جہاں میں میرا دوست ہے اور کوئی اس لائق ہے ہی نہیں کہ اسے دوست بنایا جائے، تُو میرا ایسا دوست ہے جو مجھے اس سے کہیں زیادہ جانتا ہے جتنا کہ میں خود اپنے آپ کو جانتی ہوں۔

الایعلم من خلق اور تُو کیسے مجھے نہ جانے گا جب کہ تُو نے ہی تو مجھے پیدا کیا ہے۔ میری ضروریات، میری خواہشات، میری آرزوئیں اور میری تمنائیں صرف اور صرف تُو ہی جانتا ہے، نہ صرف جانتا ہے بلکہ ان کو پورا کرنے کی قدرت بھی صرف اور صرف تجھے ہی حاصل ہے، لہٰذا اے میرے مالک! میری توقعات کا مرکز و محور تُو ہے، تجھ ہی سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں اور کسی سے بھی نہیں۔ اس لیے کہ کوئی بھی انسان جب اپنی توقعات، اپنی خواہشات پوری کرنے پر قادر نہیں ہے تو کسی اور کی تمنائیں کیسے پوری کرسکتا ہے۔

اے مالک! تُو میرا خیر خواہ ہے۔ اس بھری پُری کائنات میں کوئی بھی تجھ سے بڑھ کر یا تیرے برابر میرا خیر خواہ نہیں۔ یہاں تک کہ میں خود بھی تجھ سے بڑھ کر اپنی خیر خواہ نہیں ہوں۔ مجھے تیری خیر خواہی پر یقین ہے، اے مالک! میں نے تیری خیر خواہی پر کبھی شک نہیں کیا۔ مجھے اعتماد ہے تُو ہر حال میں میرا خیر خواہ ہے۔ جب تُو مجھے اپنی کسی نعمت سے نوازتا ہے تب بھی تُو میرا بھلا چاہتا ہے اور جب تُو کسی نعمت سے محروم کرتا ہے تب بھی میری بھلائی کے سوا تجھے کچھ اور مطلوب نہیں ہوتا۔ تیری خیر خواہی پر میرا یقین، نوازشوں اور محرومیوں ہر دو حالتوں میں مجھے مطمئن رکھتا ہے۔

دلوں کا اطمینان

مالک! تجھ پر اعتماد میں سکون ہی سکون ہے، اطمینان ہی اطمینان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پریشانی، خوف و ہراس میں میرا دل تجھے ڈھونڈتا ہے، تجھے ہی پکارتا ہے۔ الابذکر اللہ تطمئن القلوب۔

(خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔)

اے میرے مالک! مجھے تیرے ہوتے ہوئے پریشان ہونے پر شرم آتی ہے۔ کیونکہ تُو موجود ہے اور تیری ذات ہر کام پر قادر ہے، کوئی بھی چیز تجھے کسی کام کے کرنے سے عاجز نہیں کرتی تو پھر میں غم کس بات کا کروں؟ پریشان کس بات پر رہوں؟ میرا اعتماد تو تجھ پر ہے۔ تیری بے پناہ قدرتوں پر ہے، تیری ہر لحہ تائید و نصرت پر ہے۔ ظاہری اسباب مجھے پریشان اس لیے نہیں کرتے کہ مجھے ان کی کم مائیگی کا علم ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تُو اسباب

کا تابع نہیں ہے۔ اسباب تیرے تابع ہیں۔

مالک! میں تیری وہ بندی ہوں جس پر تیری نوازشیں، تیرے انعامات، تیری مہربانیاں اس روز سے بھی پہلے سے ہیں جب سے میں نے آنکھ کھولی۔ میری ہر سانس تیری مہربانی ہے اور ہر سانس کے ساتھ تیری مہربانیاں ہیں۔

مالک! اس پوری کائنات میں تجھ سے بڑھ کر میرا خیال رکھنے والا اور کوئی نہیں۔ میرا خیال اور کوئی رکھ بھی کیسے سکتا ہے؟ کوئی مجھے اس قدر جانتا ہی نہیں، جان سکتا ہی نہیں، جتنا تو مجھے جانتا ہے اور اگر جان بھی لے، تو کس حد تک جانے گا؟ اور جس حد جانے گا تو اس حد تک بھی میرا خیال رکھنے کی قدرت وہ شخص آخر کیسے رکھ سکتا ہے جو اپنا خیال رکھنے پر قادر نہیں ہے۔

مالک! میری ضروریات کا، میری خواہشات کا، میری تمناؤں کا، یہاں تک کہ میرے لطیف ترین جذبات کا، میرے احساسات کی نزاکتوں کا، اے لطیف و خبیر! صرف تُو ہی خیال رکھنے والا ہے۔ مالک! میں کیسے سمجھوں کہ تجھے میرا خیال نہیں۔ میرے نانا ابا کے دل میں پیار و محبت میرے لیے تو نے رکھی۔ میری نانی اماں کو سارا سارا دن میرے لیے دعائیں کرنے اور پیار دینے پر تو نے لگایا۔ تُو نے میرے ماموؤں سے کہا، اسے بس پیار ہی دو۔ تُو نے میری بہنوں سے کہا کہ نہ صرف اس کی ضروریات ہی کا خیال رکھو، خواہشات کا بھی احترام کرو۔ مالک! میرے دوستوں کو مجھ سے پیار کرنا تُو نے ہی سکھایا۔ مالک! تُو کتنا پیار کرنے والا ہے۔ تُو کتنے پیار سے میرے قلبی جذبات و احساسات اور ان کی نزاکتوں کو پڑھتا ہے اور کوئی پڑھ سکتا بھی نہیں، اس لیے کہ میرا دل ہے تو تیرا..... اس دل میں احساسات کا گزر تُو نہیں جانے گا تو اور کون جانے گا۔

مالک! میں کیسے کہہ دوں کہ دل غمگین کے لطیف احساسات کا تجھے پاس و لحاظ نہیں، یتیم کے سر پر پیار و محبت اور شفقت سے رکھا ہوا ہر ہاتھ مجھے یقین دلاتا ہے کہ تجھے میرا سب سے بڑھ کر خیال ہے۔ تُو کتنے پیار سے دستِ شفقت خود رکھتا ہے، اوروں سے رکھواتا ہے۔ تُو نے ہی اپنے محبوب ﷺ کی زبانی یہ خوشخبری دی کہ یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے والے کے لیے اتنا اجر ہے کہ جتنے بال اس کے ہاتھ کی انگلیوں نے چھوئے ہوں۔

اے مالک! تو ہی میرا محافظ ہے، میرا نگہبان تُو ہی ہے۔ میرا سرپرست تُو ہی ہے۔ میری عزت، میرے مال کی حفاظت کی فکر مجھ سے بڑھ کر تجھے ہے۔ تُو نے میری عزت کی حفاظت کی۔ یقیناً یہ تُو ہی تھا جس نے ان لوگوں کو بدترین سزا دی جنھوں نے مجھے نقصان پہنچانا چاہا۔ میرے معاشرے کو یہاں تک یہ کہہ کر خبردار کیا: ترجمہ: (جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے)

مالک! میں کیسے کہہ دوں کہ تُو نے مجھے بے آسرا چھوڑا ہے، تُو اس دل کی نزاکت کو خوب جانتا ہے جسے ناگہانی غم، کمزور اور حساس بنا دیتا ہے،

تجھے معلوم ہے اے مالک! کہ ایسا دل معمولی سی سخت بات بھی بہت دُرشت، بہت تلخ محسوس کرتا ہے۔ تُو نے ایسے دل کا خیال رکھتے ہوئے سب اہلِ دنیا کو حکم دیا۔ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَاتَقْھَرْ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَاتَنْھَرْ (لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو)

مالک! جب تُو زندگی کی چہل پہل سے دور ایک بیمار کو بستر پر لٹاتا ہے، تُو اسے مایوس ہونے کے لیے، پریشان ہونے کے لیے تنہا نہیں چھوڑتا، تُو اس کی دلی کیفیات کو پڑھتا ہے، تو اس کے دوستوں کو کہتا ہے، حکماً کہتا ہے کہ اس کے پاس جاؤ۔ اس کے چاہنے والوں کو اس کے پاس بٹھاتا ہے۔ اسے تسلی دلواتا ہے، اسے اجر و ثواب کے وعدوں سے خوش رکھتا ہے اور اس کی بیماری ہی کو اس کے لیے اُخروی فلاح کا سامان بنا دیتا ہے۔

عیادت اور سعادت

مالک! تو نے اس کے صرف احساسات کا خیال رکھنے کے اہتمام میں کائنات میں اپنے کارندوں سے یہ خدمت کرائی کہ اس کے گھر تک آنے والی راہوں پر ستر ہزار فرشتوں کو اس لیے کھڑا کیا کہ اس بیمار کو تسلی دینے والے کے لیے دعائے رحمت کرتے رہیں۔

مالک! میرا دل تجھے ایک بہترین غمگسار، ایک بہترین مہتمم کی حیثیت سے جانتا ہے۔ اس وقت جب میں دیکھتی ہوں کہ تُو نے میرے اور میرے گھر کی خبر گیری کرنے والے کے لیے انعام مقرر کیا، وہی انعام جو تو مجاہد فی سبیل اللہ اور صائم الدہر کو دیا کرتا ہے۔ یہ سارا اہتمام تو نے صرف میرے لیے کیا، مالک! میرے دل کو اپنا حقیقی شکر گزار بنا۔

مالک! تُو نے میرا خیال تو اس لمحے بھی رکھا، جب مجھ سے بڑھ کر اس روئے زمین پر تیرا نافرمان اور کوئی نہیں تھا۔ مالک! گناہوں کی غلاظتوں اور ان کے تعفن میں بھی تُو نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ایسے میں میرے دل میں نحوست، میرے ضمیر میں ملامت، میری طبیعت میں وحشت تُو نے ہی رکھ دی اور یہ مجھ انتہائی گنہگار پر تیرا ایک خاص انعام تھا

میرا ہی ناصبور دل شکر بجا نہ لا سکا
اس کی نوازشوں میں تو کوئی کمی ہوئی نہیں

مالک! میری روح کا طبیب صرف تُو ہی ہے، میں تیری ہوں۔ میری روح بھی تیری ہے، میرا معالج حقیقی بھی تُو ہی ہے۔ میرا شافی تُو ہے، صرف تُو!

مالک جب کبھی میری بیمار روح کی وحشتیں حد سے بڑھتی ہیں تو میں تیرے مطب میں آتی ہوں، تجھ سے اپنا حالِ دل بیان کرتی ہوں، تو نہ صرف دوا دیتا ہے، خوراک بتلاتا ہے، ایک ایک کر کے پرہیز گنواتا ہے بلکہ میرے سامنے میری بیماری کے اسباب بھی ایک ایک کر کے رکھتا ہے۔ پھر ان اسباب کو دور کرنے کے طریقے بھی سمجھاتا ہے، یہ تیرے خاص احسانات ہیں مالک! میرا حال تو یہ ہے کہ تجھ سے نسخہ لکھوا کر بھی تجھ سے دوا لے کر بھی اور تجھ سے پرہیز کی ہدایات لے کر بھی اسباب مرض سے آگاہ ہو کر بھی اور اسے دور کرنے کا طریقہ سمجھ کر بھی اپنے مرض سے نکلنے کی کوئی خاص

فکر نہیں کرتی۔ اپنے امراض کے پالنے ہی کو اب تک عزیز رکھا ہے۔

مالک! تیرا شکر ہے کہ تُو نے میرے گناہوں پر پردہ ڈالا ہے۔ اگر تُو میرے گناہوں پر پردہ نہ ڈالتا، میرے گناہوں میں بدبو رکھ دیتا تو میرے یہ دوست، میرے یہ بہن بھائی جو آج بڑی محبت اور چاہت سے میرے پاس بیٹھتے ہیں کبھی میرے پاس بیٹھنا گوارا نہ کرتے۔ مالک! مجھے امید ہے تُو اس روز بھی جب میدان حشر میں تمام انسان جمع ہوں گے تو تُو میرے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔

میرا مشیر تُو ہے

مالک! میرا مشیر بھی صرف تُو ہی ہے۔ مشورہ دینے میں تُو نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ تُو نے مجھے کبھی کوئی غلط مشورہ نہیں دیا۔ تیرے مشورے پر عمل کر کے میں نے کبھی کوئی دکھ نہیں اٹھایا۔ میں تیرے مشورے پر چل کر ہمیشہ خوش رہی۔ ہاں تیرے مشورے کو بھول کر کبھی چین نہیں پایا۔

مالک! تُو بن مانگے دیتا ہے۔ تُو نے بن مانگے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ مانگوں گی، تو تُو مجھے ضرور دے گا۔ مالک! تُو نے مجھ سائل کو ہر حال میں نوازا ہے۔ تیری رحیمی، تیری کریمی نے میری کوئی آرزو رد نہیں کی۔

مالک! تجھ سے بڑھ کر میری نیکی کا قدر دان کوئی نہیں۔ تیری قدردانیوں نے مجھے لوگوں کی تعریف سے بے نیاز کیا ہے۔ مجھے مسلسل نیکی کا حوصلہ دیا ہے۔ حسن عمل کی قوت دی ہے۔ اگر تُو میرا قدر دان ہے تو پھر میرے کام کو کوئی سراہے یا نہ سراہے، کوئی میرا بنے یا نہ بنے، مجھے کیا غم ہے، کیا میرے لیے یہ اطمینان کافی نہیں ہے کہ تُو میرا قدر دان ہے۔ تجھ سے بڑھ کر اور ہے کون؟ جس سے میں قدر کرانا چاہوں اور کوئی میری قدر کر بھی کیا سکتا ہے؟

مالک! میں تیرا احسان اپنے ساتھ ہر حال میں محسوس کرتی ہوں لیکن جہاں تک میرا اپنا رویہ ہے وہ کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں۔ میں تیری بندگی کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ میں اس احساس سے خالی ہوں، میں سارا سارا دن اور ساری ساری رات تیری رحمت کے سائے میں گزارتی ہوں، مگر تیری پروا نہیں کرتی۔ سوچتی تک نہیں۔ کہ میں کیسی سرکش ہوں، گناہ کی لذتیں، تیری سخت گیری کے احساس سے مجھے غافل کر دیتی ہیں، نافرمانیوں پر تیری غضب ناک نگاہیں مجھے نظر ہی نہیں آتیں۔ تیری ناراضی اور روٹھنے کا احساس ہی نہیں ہوتا اور اگر کبھی کہیں کسی حد تک ہوا بھی، تو تجھے منانے تیرے پیچھے پیچھے جانے کا کوئی خیال ہی نہیں آتا۔ مجھے تیری ناراضی غمگین ہی نہیں کرتی۔ تیرا غضب مجھے پریشان ہی نہیں کرتا۔

مالک! اس بے حسی سے مجھے نجات دے۔ اپنی محبت کے ساتھ اپنے غیظ و غضب کے احساس سے بھی اپنی عاجز بندی کو نواز۔

■■■

پاکبازی اور سادگی کی آخری حدوں تک پہنچے ہوئے

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ

امت مسلمہ کے چار بڑے فیصلہ سازوں میں سے ایک کی داستانِ حیات،

انھیں ایک دھوکے نے عمر بھر کے لیے دکھی کر دیا تھا

خالد محمد خالد/ارشاد الرحمٰن

یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حبشہ سے واپس آئے تھے۔ اس مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اکیلے نہیں آئے تھے بلکہ یمن کے پچاس سے زائد لوگ بھی آپؓ کے ہمراہ تھے جنھیں آپؓ نے دامنِ اسلام سے وابستہ کر دیا تھا۔ ان لوگوں میں آپؓ کے دو سگے بھائی حضرت ابورُہمؓ اور حضرت ابوبُردہ بھی تھے۔

اس صحابیِ جلیل کا اسم گرامی ''عبداللہ قیسؓ'' ہے اور ''ابوموسیٰ اشعری'' کنیت ہے۔ آپؓ نے جونہی یہ خبر سنی کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ توحید کا اعلان کر رہے ہیں اور پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے اور مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں تو آپؓ فوراً اپنا وطن یمن چھوڑ کر مکہ کی طرف چل پڑے۔ مکہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بیٹھ گئے اور ہدایت و یقین کی نعمتِ لازوال سے جھولی بھرنے لگے۔ پھر کلمہ توحید کی دولت دل میں لیے مکہ سے نکلے اور واپس وطن آگئے۔ دوبارہ فتح خیبر کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس وفد بلکہ اس پوری قوم کو ''اشعریون'' کے نام سے پکارا اور ان کی یہ صفت بیان کی کہ یہ لوگوں میں سب سے زیادہ نرم دل ہیں۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ کے سامنے ان لوگوں کی اعلیٰ مثالیں بیان کرتے اور فرماتے:

''اشعریوں کا کسی جنگ میں توشہ ختم ہو جائے یا ان کا کھانا کم پڑ جائے تو وہ اس چیز کو ایک کپڑے میں جمع کرتے ہیں جو ان کے پاس رہ گئی ہوتی ہے۔ پھر اس کو برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔ معلوم رہے کہ وہ، مجھ سے اور میں ان سے ہوں''

جناب ابوموسیٰؓ نے اسی روز سے ان مسلمین و مومنین میں اپنا مستقل اور بلند مقام بنالیا تھا جن کے مقدر میں یہ لکھ دیا گیا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اور شاگرد ہوں اور ہر دور اور زمانے میں اسلام کو دنیا تک پہنچانے والے بن جائیں۔

حضرت ابوموسیٰؓ حیران کن حد تک عظیم صفات سے لبریز تھے۔ آپ جب جنگ پر مجبور کر دیے جاتے تو جرات مند جنگجو اور چٹان صفت بہادر ثابت ہوتے۔ دوسری طرف آپؓ بے ضرر اور ایسے پاکباز انسان تھے کہ پاکبازی اور سادگی کی آخری حدوں کو پہنچے ہوئے تھے۔

آپؓ ایسے ذہین و فطین اور محتاط فقیہ تھے کہ الجھے معاملات کی گتھیاں سلجھانے میں آپؓ کا فہم و فراست بلندیوں کو چھوتا دکھائی دیتا اور فتویٰ و فیصلہ کے موقع پر چمک چمک کر سامنے آتا۔ حتیٰ کہ یہ کہا جانے لگا تھا کہ: ''اس امت کے فیصلہ ساز چار ہیں: عمر، علی، ابوموسیٰ اور زید بن ثابت!! رضی اللہ عنہم

پھر یہی نہیں بلکہ آپؓ بڑی سادہ فطرت کے مالک تھے۔ کوئی اللہ کے معاملے میں آپؓ کو دھوکا دیتا تو آپؓ اس سے دھوکا کھا جاتے! آپؓ اپنی ذمہ داریوں کی ادائی کا حق ادا کرنے والے عظیم انسان تھے۔ لوگوں پر بہت زیادہ اعتماد کر لیتے تھے۔ اگر ہم آپؓ کی زندگی کا لب لباب نکالنا چاہیں تو وہ یہ ہو سکتا ہے:

''ہر صورت اخلاص سے کام لینا پھر جو کچھ ہوتا ہے، ہوتا رہے''

☆☆☆

حضرت ابوموسیٰؓ کو رسول اللہ ﷺ کے نزدیک اعتماد اور محبت کا مقام حاصل تھا۔ خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کے نزدیک بھی آپؓ صاحب مقام و مرتبہ تھے۔

رسول اللہؐ نے آپؓ کو اپنی زندگی میں معاذ بن جبلؓ کے ساتھ یمن کا والی بنایا۔ وصالِ رسول ﷺ کے بعد آپؓ مدینہ آگئے تاکہ اس جہادِ کبیر میں اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکیں جس میں مسلمان افواج ایران و روم کے خلاف برسرِ پیکار تھیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں آپؓ کو حاکم بنایا اور حضرت عثمانؓ نے کوفہ کی حکمرانی کی ذمہ داری آپؓ کے کندھوں پر ڈالی۔ جب امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ نے آپؓ کو بصرہ کا حاکم بنا کر وہاں بھیجا تو آپؓ نے اہل بصرہ کو جمع کیا اور انھیں خطاب کرتے ہوئے کہا:

''امیر المومنین عمرؓ نے مجھے تمھاری طرف بھیجا ہے کہ میں تمھیں تمھارے رب کی کتاب اور اس کے نبیؐ کی سنت سکھاؤں اور تمھارے لیے راستوں کو صاف ستھرا کروں!''

لوگوں نے جب یہ بات سنی تو تعجب اور حیرانی میں ڈوب گئے کہ ایک حاکم اور امیر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ یہ لوگوں کو دینی رہنمائی اور کتاب و سنت کی تعلیم کیسے دے سکیں گے اور کیسے ان کے لیے راستوں کو صاف شفاف بنا سکیں گے۔

راستوں کی صفائی ستھرائی اہل بصرہ کے لیے نئی اور عجیب و غریب شے تھی۔

حضرت حسنؒ اس حاکم کے بارے میں فرماتے: ''اہل بصرہ کے لیے اس سے بہتر کوئی آنے والا نہیں آیا!''

آپؓ حفظ، فقہ اور عمل کے اعتبار سے اہل قرآن میں سے تھے۔ قرآن کے بارے میں آپؓ کے روشن کلمات میں سے ایک جملہ یہ ہے:

''قرآن کے پیچھے چلو اور یہ نہ چاہو کہ قرآن تمھارے پیچھے آئے!''

ان سخت گرم دنوں میں جب کہ حلق خشک اور سانس بند ہو رہے ہوتے، جناب ابوموسیٰؓ روزے کے والا وشیدا دکھائی دیتے اور یہ کہتے سنائی دیتے ''شاید آج کی سخت گرمی کی یہ پیاس ہمیں قیامت کے روز کوئی طراوت پہنچادے!''

☆☆☆

میدانِ جہاد میں جناب اشعریؓ نے اپنی ذمہ داریوں کو ایسی کمال جرات وبسالت سے ادا کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرمادیا:

''گھوڑ سواروں کا سردار، ابوموسیٰؓ ہے''

قارئین کرام! مضبوط جسم اور بے پناہ طاقت کا مالک یہ سپاہی جونہی میدانِ جنگ سے باہر آتا تو ایک مطیع وفرمانبردار اور خشیت سے رورو کر بے حال ہوجانے والے مومن میں بدل جاتا۔

> آپؓ ایسی متاثر کن آواز میں قرآن کی تلاوت کرتے کہ سننے والے کے دل کی اتھاہ گہرائیوں تک اس کے اثرات پہنچتے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کے بارے میں فرمایا:
> ''ابوموسیٰ کو آلِ داؤد کے سُروں میں سے ایک سُر عطا کیا گیا ہے''
> حضرت عمرؓ جب آپؓ کو دیکھتے تو قرآن مجید کی تلاوت کا آپؓ سے یہ کہتے ہوئے مطالبہ کرتے:
> ''اے موسیٰؓ! ہمارے اندر رب کا شوق پیدا کرو۔''

آپ ایک سپاہی کی حیثیت سے اپنی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ایک غزوے کے لیے نکلے جس میں ہمارے لشکر کے پاؤں گھس کر زخمی ہوگئے اور ناخن اتر گئے، یہاں تک کہ ہم نے قدموں پر کپڑے کے چیتھڑے لپیٹ لیے!''

جناب ابوموسیٰ اشعریؓ کے مزاج کی پاکیزگی وسادگی اور طبیعت کی سلامتی دشمن کو جنگ پر ابھارنے والی نہیں تھی۔ اس طرح کے مواقع پر آپؓ معاملات کو پوری وضاحت کے ساتھ دیکھتے بھالتے اور پورے عزم کے ساتھ فیصلہ کرتے۔ جب مسلمان ایران کو فتح کر رہے تھے تو آپؓ نے اہلِ اصفہان سے جزیے پر صلح کرلی حالانکہ ان لوگوں کا مقصد صلح نہیں تھا بلکہ یہ آئندہ حملے کے لیے تیاری کی مہلت چاہتے تھے۔

یہ لوگ صلح میں مخلص نہیں تھے لیکن پھر بھی جناب ابوموسیٰؓ کا ذہن ان لوگوں کی طرف سے مطمئن ہوگیا اور انھوں نے اسے کوئی سازش نہ سمجھا۔ پھر جب ان لوگوں نے مسلمانوں پر حملے کا ارادہ کیا تب اس کمانڈر کو ان کی فریب کاری پر کوئی شبہ نہ رہا اور اس نے انھیں میدان میں آنے کی دعوت دے دی۔ پھر دن ابھی آدھا نہیں گزرا تھا کہ یہ عظیم کمانڈر فتح مبین سے ہمکنار ہوگیا!

☆☆☆

ایران کی شہنشاہت کے خلاف مسلمان جن جنگوں میں اُترے ہوئے تھے جناب ابوموسیٰ اشعریؓ کا اس جہاد میں عظیم کردار ہے۔ تُوسُر کا وہ مقام جہاں ہُرمُزان اپنے لشکر سمیت پسپا ہو کر قلعہ بند ہو گیا تھا اور اس نے وہاں خوفناک لشکر جمع کرلیا تھا، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اس معرکہ کے مردِ میدان تھے۔ یہ وہ موقع ہے جس میں امیر المومنین جناب عمرؓ بن خطاب نے آپؓ کو مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی کمک پہنچائی تھی جن میں

جناب عمار بن یاسر، جناب براء بن مالک، جناب انس بن مالک اور جناب مجزاۃ البکری رضی اللہ عنہم سرفہرست تھے۔

اس جنگ میں مسلمان لشکر کے کمانڈر جناب ابوموسیٰ اشعریؓ تھے اور ایرانیوں کا کمانڈر ہُرمزان تھا۔ یہ معرکہ شدت اور سختی میں تمام معرکوں سے بڑھ کر تھا۔ جب ایرانی افواج بھاگ کر تُوسُر شہر کے اندر چلی گئیں جو قلعہ نما تھا تو مسلمانوں نے کئی دن تک ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ یہاں تک کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے داؤ کھیلا اور دوسو گھوڑ سواروں کو ایک ایرانی غدار کے ہمراہ بھیجا۔ آپؓ نے اس ایرانی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس لشکر کے لیے شہر کا دروازہ کھلوادے۔

پھر شہر کا دروازہ کھلنا تھا کہ لشکرِ اسلام کے ہراول دستے نے ایرانیوں کا حفاظتی حصار توڑ ڈالا۔ پیچھے سے جناب ابوموسیٰؓ نے مسلسل کاری واروں کا سلسلہ جاری رکھا اور چند ہی لمحوں میں مسلمان اس خطرناک قلعے پر قابض ہوگئے۔ ایرانی کمانڈروں نے ہتھیار ڈال دیے اور حضرت ابوموسیٰؓ نے انھیں گرفتار کرکے امیر المومنین کے پاس مدینہ بھجوادیا تاکہ آپؓ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔

☆☆☆

جناب ابوموسیٰ اشعریؓ صرف اسی جنگ میں حصہ لیتے جس میں مسلمانوں کا مقابلہ ایسی افواج سے ہوتا جو دین کے خلاف برسرِ پیکار ہوتیں اور اللہ کے نور کو بجھا ڈالنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ جب لڑائی ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے ہوتی تو آپ اس سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔

ان جنگوں میں جناب ابوموسیٰؓ نے مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے دیکھا تو حق حکمرانی کے بارے میں آپؓ کی رائے یہ تھی کہ ہر فریق اپنے حاکم کے بارے میں تعصب سے کام لے رہا ہے۔ دوسری طرف آپؓ نے یہ بھی دیکھا کہ دونوں اطراف کے جنگجوؤں کا موقف ایسی انتہا کو پہنچ گیا ہے جس نے پوری امت مسلمہ کو تباہی کے گڑھے کے کنارے لاکھڑا کیا ہے۔ جب صورت حال اس قدر بری انتہا کو پہنچ گئی تو آپؓ کی رائے یہ تھی کہ ہر طرف کا موقف بدل ڈالا جائے اور معاملے کو نئی بنیادوں پر حل کیا جائے۔

اس وقت برپا ہونے والی جنگ ایسے دو مسلمان گروہوں کے درمیان تھی جو برسراقتدار شخص کے بارے میں جھگڑ اور لڑ رہے تھے۔ اس وقت چاہیے تھا کہ جناب علیؓ اور جناب معاویہؓ وقتی طور پر حق خلافت اور دعوائے خلافت سے دستبردار ہوجاتے تاکہ معاملہ ازسرنو مسلمانوں کے ہاتھ میں چلا جاتا اور وہ شورائی طریق سے جس کو چاہتے خلیفہ بنالیتے۔

یہ تھا اس مسئلے کا وہ تجزیہ جو جناب ابوموسیٰؓ نے پیش کیا تھا اور یہی اس کا حل تھا۔

یہ درست ہے کہ جناب علیؓ کی صحیح بیعتِ خلافت ہو چکی تھی اور یہ بھی درست ہے کہ کسی بھی قسم کی غیر قانونی بغاوت وقمر داس جائز حق کو ساقط کرنے کے لیے روا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود معاملات جناب علیؓ وجناب معاویہؓ کے درمیان اور اہل عراق واہل شام کے درمیان متنازع ہو چکے تھے۔ جو کہ جناب ابوموسیٰ اشعریؓ کی رائے میں ایسی صورت اختیار کرگئے تھے کہ ازسرنو توجہ، تفکر اور حل کا تقاضا کر رہے تھے۔

جناب معاویہؓ کی بغاوت محض بغاوت نہ تھی اور اہل شام کا تمرد محض تمرد نہ تھا اور اس معاملے میں تمام تر مخالفت محض رائے کا اختلاف تھا نہ اختیار کا بلکہ یہ سب کچھ اس تباہ کن اندرونی جنگ میں بدل گیا تھا جس میں دونوں اطراف

کی ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور اسلام و مسلمانوں کو بدترین نتائج سے دوچار کر کے رکھ دیا گیا۔

لہٰذا تنازع اور جنگ کے اسباب کا ازالہ جناب ابوموسیٰؓ کی رائے میں دونوں اطراف سے اپنے موقف سے ایسی دستبرداری تھا جو خلوص کی راہ کا نقطہ آغاز ہو۔

حضرت علیؓ نے جب ثالثی کی تجویز کو قبول کر لیا تو آپؓ کی رائے یہ تھی کہ میری طرف سے ''عبداللہ بن عباسؓ'' یا کوئی اور ساتھی نمائندہ بنے مگر آپؓ کے ساتھیوں میں سے اثر و رسوخ رکھنے والے لوگوں کی بڑی تعداد نے آپؓ کو جناب ''ابوموسیٰ اشعریؓ'' کے بارے میں رائے دی۔ جناب ابوموسیٰؓ کو نمائندہ ثالث مقرر کرنے کی دلیل ان لوگوں کے پاس یہ تھی کہ حضرت ابوموسیٰؓ اول روز سے آج تک اس نزاع میں شریک نہیں ہوئے بلکہ دونوں فریقوں کو جنگ سے دستبردار ہو جانے اور صلح پر آمادہ نہ کر سکنے کے بعد دونوں سے الگ تھلگ رہے ہیں، لہٰذا وہ ثالثی کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔

جناب ابوموسیٰؓ کے دین و ایمان اور صدق و اخلاص میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس میں جناب علیؓ کو شک ہوتا تاہم حضرت علیؓ دوسری جانب کے ارادوں سے بھی آگاہ تھے۔ جناب ابوموسیٰؓ کی انتہا درجے کی سادگی اور دوسروں پر بہت زیادہ اعتماد کر لینے کی عادت سے بھی واقف تھے، اس بنا پر جناب علیؓ کو خدشہ ہوا کہ ابوموسیٰ فریق مخالف سے دھوکا کھا جائیں گے اور دوسری جانب سے ثالثی ایسی چال اور فریب میں بدل جائے گی جو معاملات کو مزید خراب کر دے گا۔

☆☆☆

بہر حل دونوں فریقوں کے درمیان ثالثی مذاکرات کا آغاز ہوا۔ جناب علیؓ کی جانب سے حضرت ابوموسیٰؓ اور جناب معاویہؓ کی جانب سے حضرت عمرو بن العاصؓ نمائندے اور ثالث مقرر ہوئے۔ دونوں اصحاب کے درمیان گفتگو کا آغاز حضرت ابوموسیٰؓ کی جانب سے دی گئی اس تجویز پر اتفاق سے ہوا کہ دونوں حکمران ''عبداللہ بن عمرؓ'' کے لیے مسند خلافت چھوڑ دیں بلکہ ان کی خلافت کا اعلان کر دیں اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ خلافت کے معاملے میں لوگوں کی محبت اور توقیر و اکرام کے مستحق ٹھہر سکتے تھے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے جناب ابوموسیٰؓ کی طرف سے آنے والی اس تجویز میں ایک بہت بڑا موقع پا لیا۔ یعنی آپؓ نے اس بات میں سے یہ نکتہ نکالا کہ حضرت ابوموسیٰؓ خلافت کو دوسرے اصحاب رسول ﷺ کی طرف منتقل کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اس طرح حضرت عمروؓ اپنی موقع شناسی کو استعمال میں لا کر اپنے مقصد تک پہنچنے کی کوشش میں لگ گئے۔ آپؓ نے پہلے حضرت معاویہؓ کے بارے میں تجویز دی، کیونکہ یہ بھی اصحاب رسول ﷺ کے درمیان بہت بڑا مقام رکھتے تھے۔

جناب عمرو بن العاصؓ مسلسل کوشش میں رہے کہ جناب عمروؓ انتقالِ خلافت کو ہی گفتگو اور ثالثی کا مرکزی نکتہ بنا کر بیٹھ گئے ہیں تو آپؓ نے بات چیت کا رخ بڑی سیدھی سمت کو موڑ دیا۔ آپؓ نے حضرت عمروؓ کے سامنے یہ بات رکھی کہ خلیفہ کو چننا تمام مسلمانوں کا حق ہے اور اللہ نے ان کے باہمی معاملات کو شوریٰ کے طریق سے طے کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان سب کو اس کا اختیار دے دیا جائے۔

قارئین کرام! اب وہ تاریخی مکالمہ سنیے جو جناب ابوموسیٰ اشعریؓ اور جناب عمرو بن العاصؓ کے درمیان اس موقع پر ہوا۔ ہم یہ گفتگو ابوحنیفہ الدینوری کی کتاب سے نقل

کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ابوموسیٰؓ: اے عمرو! اس چیز کے بارے میں تیری کیا رائے ہے جس میں امت کی بہتری اور اللہ تعالیٰ کی رضا موجود ہے؟

عمروؓ: وہ کیا ہے؟

ابوموسیٰؓ: ہم خلافت عبداللہؓ بن عمر کے سپرد کریں، کیونکہ وہ اس جنگ کی کسی بھی چیز میں داخل نہیں ہوئے!

عمروؓ: اور معاویہ کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟

ابوموسیٰؓ: معاویہؓ اس (خلافت) کی جگہ ہے نہ وہ اس کا حقدار ہے؟

عمروؓ: کیا تجھے معلوم نہیں کہ عثمانؓ مظلومیت کی حالت میں قتل ہوئے ہیں؟

ابوموسیٰؓ: کیوں نہیں!

عمروؓ: تو معاویہ عثمان کے خون کا وارث ہے اور اس کا گھر قریش میں ہے یہ تو تجھے معلوم ہی ہے۔ اگر لوگ یہ پوچھیں کہ اسے امورِ حکومت کیوں دیے گئے جبکہ اس کا کوئی پیش رو نہیں؟

تو اس کا جواب تیرے پاس ہوگا۔ وہ یہ کہ میں نے اسے عثمان کا وارث پایا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے آیت کہ

''اس کے ساتھ وہ زوجہ رسول ﷺ اُمِ حبیبہؓ کا بھائی بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا صحابی بھی!

ابوموسیٰؓ: عمرو! اللہ سے ڈرو۔۔۔۔ تو نے معاویہؓ کے شرف (خاندانی بڑائی) میں سے جو کچھ بیان کیا ہے اگر خلافت شرف کی بنا پر کسی کا حق ٹھہرتی تو ''ابرہہ صباح'' سب لوگوں سے زیادہ اس کا حق دار ہوتا، وہ ان نسل در نسل بادشاہوں کی اولاد ہے جنھوں نے زمین کے مشرق و مغرب پر حکومت کی۔ پھر معاویہؓ کے شرف کا علیؓ بن ابی طالب کے ساتھ کیا مقابلہ؟ رہی تیری یہ بات کہ معاویہؓ عثمانؓ کا وارث ہے تو سب سے قریبی وارث تو عثمانؓ کا بیٹا عمرو ہے۔ ہاں اگر تو میری بات مانے تو ہم عمر بن خطاب کے بیٹے حبرِ اُمت عبداللہ کو خلافت سونپ کر ان کی سنت اور ذکر زندہ کر سکتے ہیں۔

عمروؓ: میرے بیٹے عبداللہ کی فضیلت و صالحیت اور ہجرت و صحابیت میں قدیم ہونے کے باوجود کونسی شے تجھے اس کے بارے میں رائے دینے سے روک رہی ہے؟

ابوموسیٰؓ: تیرا بیٹا یقیناً ایک مخلص آدمی ہے مگر تو نے اسے ان جنگوں میں لتھیڑ دیا ہے۔ لہٰذا کیوں نہ ہم صاف و شفاف انسان کے صاف و شفاف بیٹے عبداللہؓ بن عمر کو یہ مقام دیں۔

عمروؓ: ابوموسیٰؓ! اس کام کے لیے دو داڑھوں کا آدمی ہی موزوں ہو سکتا ہے جو ایک داڑھ سے کاٹتا اور دوسری سے چباتا ہے!!

ابوموسیٰ: عمروؓ! تو تباہ ہو جائے۔۔۔ مسلمانوں نے تلواریں ٹکرا لینے اور نیزے آزما لینے کے بعد معاملہ ہمارے سپرد کیا ہے لہٰذا ہمیں دوبارہ انھیں فساد کی طرف نہیں دھکیلنا چاہیے!

عمروؓ: تو پھر تیرا کیا خیال ہے؟

ابوموسیٰؓ: میرا خیال یہ ہے کہ ہم دونوں آدمیوں علیؓ و معاویہؓ کو خلافت سے معزول کر دیں پھر مسلمانوں کے درمیان مشاورت کرائیں وہ جسے چاہیں اپنا خلیفہ چن لیں۔

عمروؓ: میں اس رائے پر راضی ہوں، جانوں کی خیر اسی میں ہے!

☆☆☆

اس گفتگو کے بعد ثالثی کے معاملہ کی ساری ذمہ داری حضرت عمروؓ بن العاص پر عائد ہو گئی تھی کیونکہ حضرت ابوموسیٰؓ تو معاملہ امت کے سپرد کر کے بری الذمہ ہو گئے

تھے اور حضرت عمروؓ آپؓ کی تائید کرتے ہوئے اس رائے کو نافذ کرنے کی ذمہ داری قبول کر چکے تھے۔ لیکن دراصل ہونا کیا تھا؟ حضرت ابوموسیٰؓ اس سے بے خبر تھے۔ انھیں تو اس وقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے متنبہ کیا جب آپؓ نے واپس آ کر بتایا کہ اس بات پر اتفاق ہوا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا:

''واللہ! مجھے خدشہ ہے کہ عمروؓ نے تمھیں دھوکا دیا ہے۔ اگر تم نے کسی بات پر اتفاق کرنا تھا تو تجھے چاہیے تھا کہ اسے پہلے بات کرنے کی دعوت دیتے اور خود بعد میں کرتے!''

مگر حضرت ابوموسیٰؓ اس موقع کو اس سے بالاتر سمجھتے تھے کہ اس میں بھی عمروؓ کوئی چال چل سکتے ہیں۔ اس لیے آپؓ کو اس متفقہ نکتے کی حضرت عمروؓ کی طرف سے پابندی نہ کرنے کا ذرا شک وشبہ نہ تھا۔

دوسرا روز ہوا اور دونوں حضرات کی پھر نشست ہوئی۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے حضرت عمروؓ کو بات کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ: میں تو تم سے پہلے بات نہیں کر سکتا کہ تم مجھ سے زیادہ فضیلت رکھتے ہو، مجھ سے پہلے کے مہاجر ہو اور عمر میں بھی مجھ سے بڑے ہو!

اب حضرت ابوموسیٰؓ اٹھے اور دونوں فریقوں کے جم غفیر کو مخاطب کر کے کہنے لگے: ''لوگو۔۔۔۔ ہم نے اس چیز کے بارے میں غور و خوض کیا جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس امت کو جوڑ دے اور اس کا معاملہ درست کر دے۔۔۔ تو ہمیں دونوں آدمیوں علی و معاویہ کے خلافت سے دستبردار ہو جانے اور معاملے کو شوریٰ کے سپرد کر دینے سے اچھی کوئی چیز دکھائی نہ دی کہ شوریٰ لوگوں کو اختیار دے کہ وہ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔ لہٰذا میں علی و معاویہ کو خلافت سے معزول کرتا ہوں۔ تم اپنا معاملہ سنبھالو اور جسے چاہو اپنا حاکم بنالو''

آپؓ کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص کی باری آئی کہ آپ بھی یہی اعلان کریں۔ حضرت عمروؓ منبر پر چڑھے اور گویا ہوئے:

''لوگو۔۔۔۔ ابوموسیٰؓ نے جو کچھ کہا ہے تم نے سن لیا ہے کہ اس نے اپنے صاحب کو معزول کر دیا ہے۔ مگر واضح رہے کہ میں اس کے صاحب کو اسی طرح معزول کرتا ہوں جس طرح اس نے کیا ہے اور اپنے صاحب معاویہؓ کو بحال رکھتا ہوں۔ وہ امیر المومنین عثمانؓ کے وارث اور ان کے خون کے انتقام کے مدعی ہیں اور لوگوں میں سب سے زیادہ ان کی جانشینی کے حق دار ہیں!''

حضرت ابوموسیٰؓ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے، حضرت عمروؓ کو نہایت غضب ناک حالت میں برا بھلا کہا اور پھر سے عزلت نشین ہو گئے۔ انھیں اس دھوکے نے بہت دکھ میں مبتلا کر دیا تھا۔ جو انھیں ایک دیندار ساتھی نے دے ڈالا تھا۔ وہ اللہ کے معاملے میں اتنی ہی آسانی اور معصومیت سے دوسروں پر اعتبار کرنے میں مشہور تھے۔ ایسے میں وہ بے اختیار کہا کرتے ''اے اللہ تو ہی سلامتی ہے اور تجھی سے سلامتی مل سکتی ہے۔'' اس واقعے کے بعد امت کا انتشار اور بھی بڑھ گیا۔ مکہ کی طرف محو سفر ہوئے اور زندگی کے بقیہ ایام بیت اللہ کے پہلو میں گزار دیے۔

جب آپؓ ملاقاتِ رب کے لیے عازم سفر ہوئے۔ وہ الفاظ جو آپؓ ساری زندگی دہراتے رہے، دنیا سے روانگی کے وقت آپؓ کی زبان پر جاری تھے:

''اے اللہ تو ہی سلامتی ہے اور تجھی سے سلامتی مل سکتی ہے!''

■■■

فرانسیسی موسیقار کا انوکھا واقعہ

ایک نامور فرانسیسی موسیقار کا دل نواز تذکرہ

اسے فنِ موسیقی کی بہت شُد بُد تھی ایک روز اچانک کسی اور موسیقی سے اس کا واسطہ پڑ گیا تھا

ڈاکٹر محمود احمد غازی

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے خود براہِ راست مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تھا کہ 1957-1958ء میں ایک ایسا شخص ان کے پاس آیا جسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکے۔ ان کی زندگی کا یہ معمول تھا کہ ہر روز دو چار لوگ ان کے پاس آتے اور اسلام قبول کرتے تھے۔ وہ بھی ایسا ہی دن تھا کہ ایک صاحب آئے اور کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے حسبِ عادت ان کو کلمہ پڑھوایا اور اسلام کا مختصر تعارف ان کے سامنے پیش کر دیا۔ اپنی بعض کتابیں انھیں دے دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ جب بھی کوئی شخص ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا تھا وہ ضرور اس سے پوچھا کرتے کہ اسے اسلام کی کس چیز نے متاثر کیا ہے۔

1948ء سے 1996ء تک ڈاکٹر صاحب کے دستِ مبارک پر اوسطاً دو افراد روزانہ اسلام قبول کیا کرتے تھے۔ عموماً لوگ اسلام کے بارے میں اپنے جو تاثرات بیان کرتے وہ ملتے جلتے ہوتے تھے۔ ان میں نسبتاً زیادہ اہم اور نئی باتوں کو ڈاکٹر صاحب اپنے پاس قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ اس شخص نے جو بات بتائی وہ ڈاکٹر صاحب کے بقول بڑی عجیب وغریب اور منفرد نوعیت کی تھی اور میرے لیے بھی بے حد حیرت انگیز تھی۔

اس نے جو کچھ کہا اس کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا ارشاد تھا کہ میں اسے بالکل نہیں سمجھا اور میں اس کے بارے میں کوئی فنی رائے نہیں دے سکتا۔ اس شخص نے بتایا: میرا نام ژاک ژیلبیر ہے۔ میں فرانسیسی بولنے والی دنیا کا سب سے بڑا موسیقار ہوں۔ میرے بنائے اور گائے ہوئے گانے اور ریکارڈ فرانسیسی زبان بولنے والی دنیا میں بہت مقبول ہیں۔

آج سے چند روز قبل مجھے ایک عرب سفیر کے ہاں کھانے کی دعوت میں جانے کا موقع ملا۔ جب میں وہاں پہنچا تو سب لوگ جمع ہو چکے تھے اور نہایت خاموشی سے ایک خاص انداز کی موسیقی سن رہے

تھے۔ جب میں نے وہ موسیقی سنی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ موسیقی کی دنیا میں بہت ہی اونچی چیز ہے جو یہ لوگ سن رہے ہیں۔ میں نے خود آوازوں کی جو دھنیں اور ان کا جو نشیب و فراز ایجاد کیا ہے یہ موسیقی اس سے بھی بہت آگے ہے، بلکہ موسیقی کی اس سطح تک پہنچنے کے لیے ابھی دنیا کو بہت وقت درکار ہے۔ میں حیران تھا کہ آخر یہ کس شخص کی ایجاد کردہ موسیقی ہوسکتی ہے اور اس کی دھنیں آخر کس نے ترتیب دی ہیں۔ جب میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ یہ دھنیں کس نے بنائی ہیں تو کسی نے مجھے اشارہ سے خاموش کر دیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پھر یہی بات پوچھی۔ لیکن وہاں موجود حاضرین نے مجھے پھر خاموش کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے دوران میں وہ فنِ موسیقی کی کچھ اصطلاحات بھی استعمال کر رہا تھا جس سے میں واقف نہیں کیونکہ فنِ موسیقی میرا میدان نہیں۔

قصہ مختصر جب وہ موسیقی ختم ہوگئی اور وہ آواز بند ہوگئی تو پھر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ سب کیا تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ موسیقی نہیں تھی بلکہ قرآنِ مجید کی تلاوت ہے اور فلاں قاری کی تلاوت ہے۔ موسیقار نے کہا یقیناً یہ کسی قاری کی تلاوت ہوگی اور یہ قرآن ہوگا، مگر اس کی یہ موسیقی کس نے ترتیب دی ہے اور یہ دھنیں کس کی بنائی ہوئی ہیں؟ وہاں موجود مسلمان حاضرین نے بیک زبان وضاحت کی کہ نہ یہ دھنیں کسی کی بنائی ہوئی ہیں اور نہ ہی یہ قاری صاحب موسیقی کی ابجد سے واقف ہیں۔ اس موسیقار نے جواب میں کہا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ دھنیں کسی کی بنائی ہوئی نہ ہوں۔ لیکن اسے یقین دلایا گیا کہ قرآن مجید کا کسی دھن سے یا فنِ موسیقی سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ یہ فنِ تجوید ہے اور ایک بالکل الگ چیز ہے۔ اس نے پھر یہ پوچھا کہ اچھا پھر مجھے یہ بتاؤ کہ تجوید اور قرأت کا فن کب ایجاد ہوا؟ اس پر لوگوں نے بتایا کہ یہ فن تو چودہ سو سال سے چلا آرہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں کو قرآن مجید عطا فرمایا تھا تو فنِ تجوید کے اصولوں کے ساتھ ہی عطا فرمایا تھا۔ اس پر موسیقار نے کہا اگر محمد ﷺ نے اپنے لوگوں کو قرآن مجید اسی طرح سکھایا ہے جیسا کہ میں نے ابھی سنا ہے تو پھر بلاشبہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس لیے کہ فنِ موسیقی کے جو قواعد وضوابط اس طرزِ قرأت میں نظر آئے ہیں وہ اتنے اعلیٰ اور ارفع ہیں کہ دنیا ابھی وہاں تک نہیں پہنچی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس شخص نے کہا کہ بعد میں میں نے اور بھی قرأ کی تلاوت میں قرآن سنا، مسجد میں جا کر سنا اور مختلف لوگوں سے پڑھوا کر سنا اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اگر یہ اللہ کی کتاب ہے تو اس کے لانے والے یقیناً اللہ کے رسول ﷺ تھے۔ اس لیے آپ مجھے مسلمان کرلیں۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اسے مسلمان کر لیا۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ کس حد تک درست تھا۔ اس لیے کہ میں اس فن کا آدمی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک الجزائری مسلمان کو جو پیرس میں زیرِ تعلیم تھا، اس نئے موسیقار مسلمان کی دینی تعلیم کے لیے مقرر کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد دونوں میرے پاس آئے اور کچھ پریشان سے معلوم ہوتے تھے۔ الجزائر معلم نے مجھے بتایا کہ

یہ نومسلم قرآن مجید کے بارے میں کچھ ایسے شکوک کا اظہار کر رہا ہے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ جس بنیاد پر یہ شخص ایمان لایا تھا وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی، اب اس کے شکوے کا میں کیا جواب دوں گا اور کیسے دوں گا؟ لیکن اللہ کا نام لے کر پوچھا کہ بتاؤ تمھیں کیا شک ہے؟ اس نومسلم نے کہا کہ آپ نے مجھے بتایا تھا اور کتابوں میں بھی میں نے پڑھا ہے کہ قرآن مجید بعینہٖ اسی شکل میں آج موجود ہے جس شکل میں اس کے لانے والے پیغمبر ﷺ نے اسے صحابہ کرام کے سپرد کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ واقعی ایسا ہی ہے۔ اب اس نے کہا کہ ان صاحب نے مجھے اب تک جتنا قرآن مجید پڑھایا ہے اس میں ایک جگہ کے بارے میں مجھے لگتا ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور حذف ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ وہ خوشی سے اچھل کر کھڑا ہوگیا اور مجھے گود میں لے کر کمرے میں ناچنے لگا اور کہنے لگا کہ واقعی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اس نے بتایا کہ سورۂ نصر پڑھائی ہے اور اس میں افواجاً اور فسبّح کے درمیان خلا ہے۔ جس طرح انھوں نے مجھے پڑھایا ہے وہاں افواجاً پر وقف کیا گیا ہے۔ وقف کرنے سے وہاں سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے جو نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ جب کہ میرا فن کہتا ہے کہ یہاں خلا نہیں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ یہ سن کر میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس شبہ کا کیا جواب دیں اور کس طرح مطمئن کریں۔ کہتے ہیں کہ میں نے فوراً دنیائے اسلام پر نگاہ دوڑائی تو کوئی ایک فرد ایسا نظر نہیں آیا جو فنِ موسیقی سے بھی واقفیت رکھتا ہو اور تجوید بھی جانتا ہو۔

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ چند سیکنڈ کی شش و پنج کے بعد بالکل اچانک اور یکا یک میرے ذہن میں ایک پرانی بات اللہ تعالیٰ نے ڈالی کہ میں اپنے بچپن میں جب مکتب میں قرآن مجید پڑھا کرتا تھا تو میرے معلّم نے مجھے بتایا کہ افواجاً پر وقف نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ افواجاً کو بعد کے لفظ سے ملا کر پڑھا جائے۔ ایک مرتبہ میں نے افواجاً پر وقف کیا تھا تو اس پر انھوں نے سزا دی تھی اور سختی سے تاکید کی تھی کہ افواجاً کو آگے والے لفظ سے ملا کر پڑھا کریں۔ میں نے سوچا کہ شاید اس سے اس کا شبہ دور ہو جائے اور اطمینان ہو جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ آپ جو پڑھانے والے ہیں وہ تجوید کے اتنے ماہر نہیں ہیں۔ دراصل یہاں اس لفظ کو غنہ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا۔ ''افواجاً فسبح'' ڈاکٹر صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ وہ خوشی سے اچھل کر کھڑا ہوگیا اور انھیں گود میں لے کر کمرے میں ناچنے لگا اور کہنے لگا کہ واقعی ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہ سن کر اس کو میں نے دوسرے قاری کے سپرد کر دیا۔ جس نے اس شخص کو پورے قرآن پاک کی تعلیم دی۔ وہ وقتاً فوقتاً مجھ سے ملتا تھا اور سردھنتا تھا کہ واقعی یہ اللہ کی کتاب ہے۔ ژاک زیلبیر بہت اچھا مسلمان ثابت ہوا اور ایک کامیاب زندگی گزار کر 1970ء کے لگ بھگ اس کا انتقال ہوگیا۔ (انتخاب از محاضراتِ قرآنی)

82 ہزار سے زائد
''باجیوں'' کی باجی،

امریکی صدر
کی تحسین
نے سب کو
حیران کر دیا

پاکستان میں مائیکروفنانس کے
شعبے میں خدمات کے
18 نمایاں سال
کشف فاؤنڈیشن کی
ملک اور بیرون
ملک پہچان کا
باعث بنے ہیں

بزنس رول ماڈل

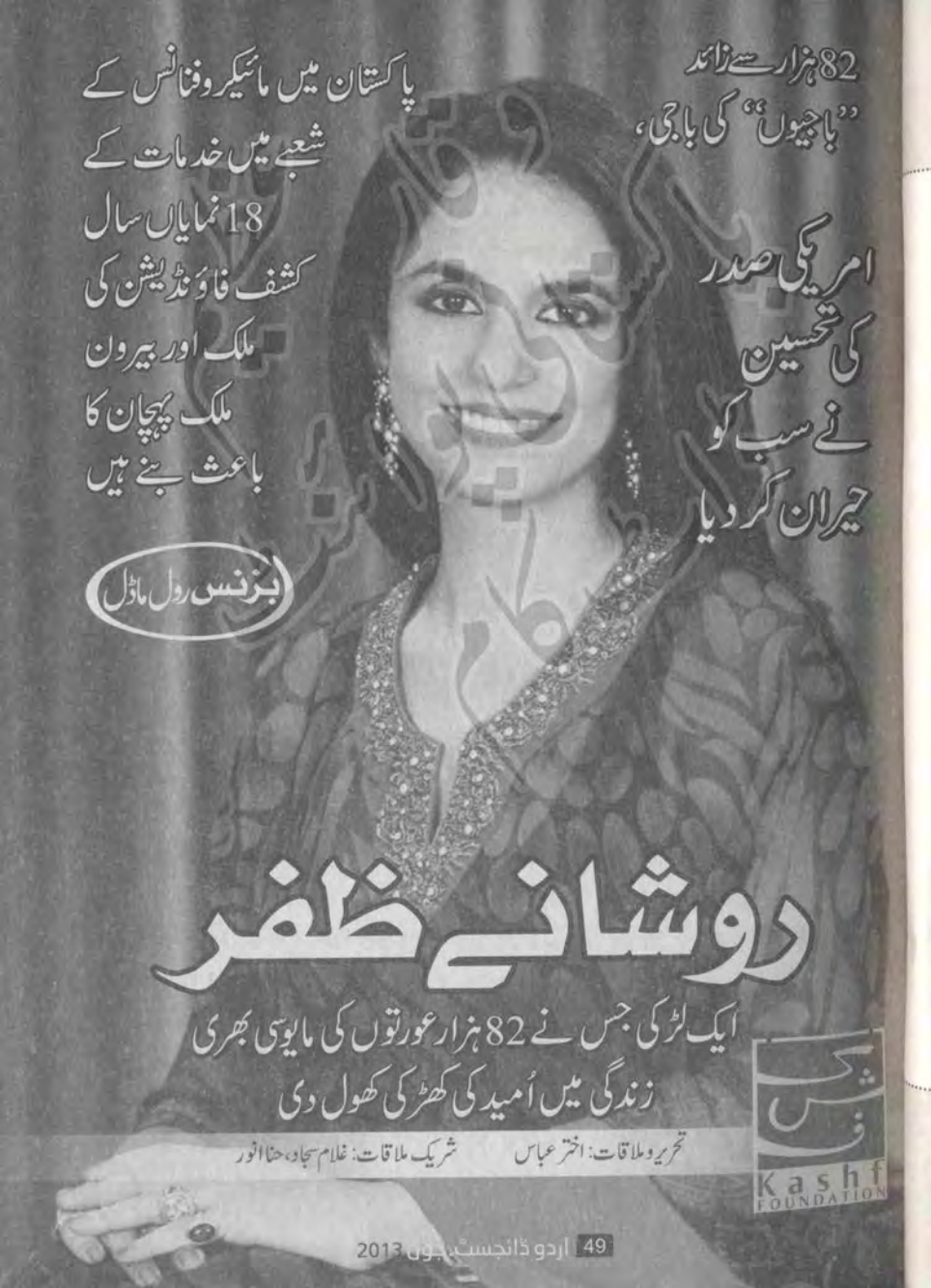

روشانے ظفر

ایک لڑکی جس نے 82 ہزار عورتوں کی مایوسی بھری
زندگی میں اُمید کی کھڑکی کھول دی

تحریر و ملاقات: اختر عباس شریک ملاقات: غلام سجاد، حنا انور

کشف
Kashf
FOUNDATION

پاکستان میں بسنے والی لاکھوں لڑکیوں میں سے ایک ہونے کے باوجود ویسی کیوں نہیں ہے، یہی سوال ہمیں روشانے ظفر سے ملوانے کا باعث بنا۔ روشانے ظفر کہنے کو ایک لڑکی ہے مگر گزشتہ 18 سال سے 82 ہزار سے زائد عورتوں کی مایوسی سے بھری زندگی میں اُمید کی کھڑکی کھول کر اس پر پہرہ دے رہی ہے۔

آج وہ پاکستان کی آواز ہے، صدارتی تمغہ حسن کارکردگی ملنے پر نازاں اور فرحاں نہیں ہے بلکہ اپنے کام میں اور گہرائی لا رہی ہے۔ لاکھوں لڑکیوں کے درمیان کام کرنے والی بوٹے سے قد والی یہ باہمت، پُرعزم اور متحرک لڑکی، عورتوں کی مالی خوشحالی، ان کے خاندانوں کی بہتری اور انھیں غربت کی لکیر سے اوپر اٹھانے کی کوششوں میں یوں لگی ہے جیسے وہ صرف انہی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

اس نے غریب عورتوں کو خواب دیکھنا سکھا دیا ہے۔ بیوہ، اکیلی، بے آسرا، نامراد، خاک سار، خاک بسر کتنے چہروں کو زندگی، عزت، خوشی اور خودمختاری کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔ انھیں سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ دیا ہے۔

پاکستان کی اس بیٹی نے اپنے کتابی علم کو علم نافع میں ڈھال دیا ہے۔ کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ وہ سینیٹر ایس ایم ظفر اور سیفی کی لاڈلی بیٹی ہے، طاہرہ سید کی بھانجی اور ملکہ پکھراج کی نواسی ہے۔

سب اسے کشف فاؤنڈیشن کی بانی، مینیجنگ ڈائریکٹر کے طور پر جانتے ہیں جس نے اپنی جوانی اور جوانی کے سارے خواب اور خوشیاں غربت کی دلدل میں پھنسی، موت کی دعائیں مانگتی عورتوں کی بجھتی آنکھوں کو روشن کرنے کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔

آج کی دنیا میں مائیکروفنانس کے بانی ڈاکٹر محمد یونس سے لے کر ہر وہ اہم فرد اور ادارہ جو اس شعبے اور اس کی نزاکتوں، مشکلوں اور پریشانیوں کو جانتا ہے، روشانے ظفر کی تحسین کرتا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے ٹی وی چینل پر اس کے انٹرویوز، عالمی رسائل میں اس کا تذکرہ ہے۔ یہاں تک کہ انٹرپرینورز (Interpreneures) کی عالمی کانفرنس میں امریکی صدر بارک اوباما اس کے نام اور کام کا تذکرہ کر کے ایک دنیا کو حیران کر دیتا ہے۔

روشانے کہتی ہیں پاکستان کے 40 ملین گھرانوں کو غربت کی لکیر سے اٹھنے اور باعزت زندگی گزارنے کے لیے چھوٹے قرضوں کی ضرورت ہے اور ابھی تک ہم سرکاری اور غیر سرکاری ادارے مل کر صرف 22 لاکھ گھرانوں تک پہنچ پائے ہیں۔ بے شک ایک طویل اور مشکل سفر سامنے ہے مگر روشانے اپنے رب پہ پورا یقین رکھتی ہے کہ وہ اس سفر کو آسان کر دے گا۔

کشف فاؤنڈیشن کے مقاصد میں غریب عورتوں کو صرف سرمایہ فراہم کرنا ہی نہیں ہے بلکہ بچت پہ ابھارنا، بچت کے طریقے سکھانا، انشورنس اور ان کی Capacity Building بھی ہے جس کے لیے خصوصی مالیاتی تربیتی پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں۔ ہر کلائنٹ کو ایک باعزت نام دیا گیا ہے ''باجی''۔ قرض لینے والی ''باجیوں'' کی کامیابی کی کہانیوں سے کشف فاؤنڈیشن کے صدر دفتر کے در و دیوار سجے اور کمرے بھرے ہوئے تھے، جب ہم برکت مارکیٹ کے بالکل ساتھ گارڈن ٹاؤن میں واقع کشف فاؤنڈیشن کے استقبالیہ لاؤنج میں، بورڈز پر آویزاں تصاویر دیکھ رہے تھے۔

فنانشل لٹریسی کی ایک دلچسپ مثال کراچی کی ایک بیوہ کی تھی جس کو تقریباً 20 سال قبل 500 روپے کا قرضہ دیا گیا، ایک پتیلا، چمچ، پکوڑے بنانے کا سامان دینے کے بعد بتایا اور سمجھایا گیا کہ کیسے پکوڑے بنانے ہیں۔ چند برسوں بعد اس خاتون کا انٹرویو مشہور اردو

رسالہ ''رابطہ'' میں چھپا۔ اس نے سادگی سے بتایا کہ آمدن کا تو پتا نہیں البتہ روزانہ 1500 روپے کا پکوڑے بنانے کا سامان آتا ہے۔

کشف فاؤنڈیشن کا اسٹاف اپنے کلائنٹس کے ساتھ Shared Learning پر یقین رکھتا ہے۔ ان کی گروپ میں ٹریننگ کا بندوبست کرتا ہے اور اسی کو مفید پاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے Working Poor کو تھوڑا سرمایہ دے کر ان کو زیادہ فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کی نسبت بائم آف دی پوَر (Below the Poverty Line) کا معاملہ آسان نہیں ہے۔ پنجاب میں 65 فیصد تک رسائی رکھنے والی کشف فاؤنڈیشن کے آفیسرز بلوچستان کے موجودہ ابتر حالات کے باعث 2 فیصد کے قریب غریب لوگوں تک رسائی حاصل کر پائے ہیں۔ کے پی کے میں یہ 5 فیصد تک ہے، جنوبی سندھ کی نسبت نارتھ سندھ میں رسائی کم ہے۔

ایک بین الاقوامی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے روشانے نے کیا خوب بات کہی تھی۔ آپ یہ پوچھتے ہیں غلطیوں سے کیا سیکھا تو اس کا جواب ایک منٹ کا بھی ہے اور تین گھنٹے کا بھی۔

10 لاکھ گھروں کے ساتھ کام کرنے کے بعد انھیں صرف اقتصادی مضبوطی نہیں دی بلکہ خودمختاری، بچوں کی تعلیم اور بہتر غذا کی نعمت سے بھی ہمکنار کیا ہے۔ ان کے مقاصد کے حصول میں تین رکاوٹیں بہت اہم ہیں۔ عورتوں کے لیے مالی سہولت کی فراہمی، مارکیٹ تک رسائی، سماجی رکاوٹوں کو دور کرنا، لیگل مسائل اور خاندان کے مردوں کی طرف سے آنے والی رکاوٹیں الگ سے ہیں۔ کشف کی روح میں جہاں کاروباری اخلاقیات خون کی طرح دوڑتی نظر آتی ہے وہاں کامیاب 'باجیوں' کی تعریف و تحسین کے پروگرام، ان کی کاوشوں اور کوششوں کو تسلیم کر کے اظہار و احترام کرنا بھی معمول ہے۔

ڈاکٹر محمد یونس سچ ہی تو کہتے ہیں۔ ''روپیہ ہر چیز نہیں ہوتا۔ وہ ذہن کہیں اہم ہوتا ہے جو کام کرتا ہے اور روپے کے بہتر استعمال کے راستے سوچتا ہے اور دماغ ہی کامیابی کے بند دروازے کھولتا ہے۔''

روشانے ظفر نے ہزاروں عورتوں کی زندگیوں میں سکھ کے دروازے انہی کے ہاتھوں کھلوا دیئے ہیں۔

آیئے ملتے ہیں اس لڑکی سے جو اپنی ذات کی حد تک بے شک تنہا ہے مگر اس سے ہزاروں گھر اور اس کی ٹیم کے 2800 لوگ جو یوں باہم جڑے ہوئے ہیں کہ ان کی صلاحیتیں اور فاؤنڈیشن کے وسائل مل کر زندگیوں میں آسانی لانے کا خوشگوار کام کیے جا رہے ہیں۔

س: ایک گیت سے آپ کی شہرت کا آغاز ہوا اور عروج بالکل دوسرے شعبے میں پایا۔ زندگی کا خواب ایسا ہی دیکھا تھا یا سب اتفاق سے ہوتا گیا؟

ج: ہر انسان میں Diversity ہوتی ہے۔ ہر انسان صرف ایک ہی نہیں بہت سے کام کر سکتا ہے اور اس میں قابلیت بھی ہوتی ہے۔ تو ضروری نہیں ہے کہ جو Academically Motivated ہو وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ جسے پڑھنے لکھنے کا شوق ہو وہ آرٹس اور فنون لطیفہ کی طرف نہیں آ سکتا۔ یہ تو کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سارے ہنر اور صلاحیتیں دی ہوتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ آپ کو موقع ایسا مل جائے جس سے آپ اپنے ہنر کو آزما سکیں، منوا سکیں۔ کئی لوگ ہوتے ہیں جن میں مصوری کا ٹیلنٹ ہوتا ہے لیکن ان کو موقع نہیں ملتا۔ اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے میں سارا وقت صرف کر دیتے ہیں اور

اپنے ٹیلنٹ کو ابھار نہیں پاتے۔ لیکن میں ان چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جن کو اپنا ہر فن ابھارنے کا موقع ملا ہے۔ اگر پڑھنا تھا تو اللہ نے اس کا موقع دیا، اگر میوزک سیکھنا تھا تو اس کا موقع بھی ملا، میں جس فیملی سے تعلق رکھتی ہوں، اس میں ہر قسم کی آزادی تھی کہ ہم آرٹس سیکھیں، اپنے تعلیمی اور پروفیشنل کیریئر کو بنائیں۔ جو چاہیں کریں۔ ہمارے اوپر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی گئی تھی کہ صرف وکیل بننا ہے، انجینئر یا ڈاکٹر بننا ہے۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ کام کرنا ہے اور محنت کرنی ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ ایک چیز آپ کو پلیٹ میں بھی سجائی ملے گی اور ہمیشہ آپ کو پکی پکائی روٹی ملتی رہے گی۔ من وسلویٰ نہیں ملے گا آپ کو بلکہ اپنی محنت سے کرنا ہے آپ نے جو بھی کرنا ہے، اس میں تعلیم کا جو معیار تھا اور جو Requirement تھی وہ بہت سخت تھی۔ ہم سب بہن بھائیوں کو یہ کہا گیا تھا کہ پڑھنا آپ سب نے خود ہے ہم آپ کو موقع دے دیں گے۔ ہم آپ کے لیے دروازہ کھولیں گے لیکن اس Opportunity کو آپ نے خود حاصل کرنا ہے اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے موقع ملا اور میں جو کرنا چاہتی تھی وہ میں نے کیا۔

س: لیکن ظاہر ہے جیسے جیسے آپ کے ذہن میں پختگی آتی جاتی ہے۔ آپ سے لوگ ملتے ہیں، تو ان کی شخصیت آپ پر اثر انداز ہوتی ہے اور ایسے لوگ ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں؟

ج: میرے ساتھ بچپن سے اور ابھی تک میرے والد کی شخصیت ہے اور ان کے کردار نے مجھے بہت Influence کیا ہے۔ انھوں نے ایک لیول پر میری زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح جب میں پروفیشنل زندگی میں آئی تو ڈاکٹر محمد یونس نے میری پروفیشنل Development میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے Grameen Bank کا کام شروع کیا تھا۔ ان سے ابھی تک لگاؤ ہے اور اس طرح ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ ساٹھ سال سے وہ خواتین کی اقتصادی خوشحالی اور بہتری کے لیے کام کر رہی ہیں۔ انھوں نے مجھے Mentor (مکمل رہنمائی اور گائیڈ) کیا ہے، جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے ایک اور بہت اہم شخصیت مجھ پر اثر انداز ہوئی ہیں اور وہ میری اپنی والدہ ہیں۔

کہنے کو تو یہ چار شخصیات ہیں جنھوں نے مجھے بننے میں مدد دی، رہنمائی دی، اعتماد دیا مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس طرح ہوا اور کب کب ہوا، یہ ایک تسلسل نہیں ہوتا، ایک سفر ہوتا ہے۔

س: آپ Graduation کے لیے امریکا گئیں اور وہاں آپ نے ورلڈ بینک میں کام کیا، کیا یہ آپ کی اپنی مرضی تھی یا حالات ویسے بنے؟

ج: ہاں ورلڈ بینک میں تو میں کام کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اکنامکس Development کے تناظر میں پڑھی تھی کہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں کیسے ترقی لائی جاسکتی ہے۔

اقتصادیات میں ایک مضمون ہے، جس میں، میں

کہنے کو یہی چار شخصیات ہیں جنھوں نے مجھے بننے میں مدد دی

نے Specialization کی تو اس حوالے سے عالمی بینک ہی سب سے مناسب جگہ تھی جہاں میں نے بہت کچھ سیکھا اور جو کچھ سیکھنے کا موقع ملا وہ پھر میں ٹرانسفر بھی کر سکی اور مجھے وہاں سے Exposure بھی ملا۔

س: وہاں پڑھائی کے دوران، مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ اٹھارہ، اٹھارہ گھنٹے پڑھتی تھیں۔ جب یہاں سے آپ گئی تھیں تو اِدھر اتنا پڑھنے کا رواج نہیں تھا، اُس ماحول میں کیسے ڈھلیں؟

ج: میں ہمیشہ سے بہت ہی پڑھاکو تھی۔ کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا مجھے، ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی تھی۔ وہ جسے Book Worm کہتے ہیں۔ ہم سبھی بہنیں، بھائی پڑھا کرتے اور ہمیں کتابوں کا بہت شوق ہے۔ میرے والد بچپن میں ہمیں Book shop لے جایا کرتے تھے اور یہ ہمارے لیے ایک اہم Event ہوتا تھا۔ کتابوں کی دکان پر جانا ہے تو ہم چاروں کو لے جانا ہے، یہ ہمارے لیے ایک ریگولر فیچر تھا۔ جن کتابوں کو آپ کلاسک کہیں گے وہ بھی پڑھیں۔ اسٹوری بکس بھی پڑھیں۔ میری ایک بدقسمتی ہے کہ ان میں انگریزی کے عنوان زیادہ پڑھے ہیں، اب بھی عبور جو ہے وہ انگریزی میں زیادہ ہے۔

س: آپ ورلڈ بینک میں گئیں تو عام طور پر ورلڈ بینک کے بارے میں لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ استحصال کرتے ہیں۔ اگر یہی ان کا خاص مائنڈ سیٹ ہے تو ان کے قریب رہ کر کیسا لگا؟

ج: اصل میں ورلڈ بینک کے مختلف ادارے ہیں۔ آپ شاید IMF کی بات کر رہے ہیں۔ ہاں وہ اپنی رائے زیادہ مسلّط کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے ان سے قرض لیا ہوتا ہے۔ ہماری حکومتوں کا ان کے پاس ایک Drawing Right ہوتا ہے جس کو SBR کہتے ہیں۔ ان ممالک نے یوں سمجھ لیں مل کر ایک نیب بنایا ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کو جب مشکل آتی ہے۔ اپنی معیشت اور ایکس چینج ریٹ کو تناسب میں رکھنے کے لیے جب ان سے قرض لیتے ہیں تو پھر ان کی بات بھی ماننا پڑتی ہے، ان کے قواعد وضوابط اور ان کی پالیسی کو قبول کرنا پڑتا ہے یہ تو IMF ہے۔ اس پر بہت ساری بحث ہوسکتی ہے۔

کچھ حد تک میں بھی اس سے اتفاق کرتی ہوں کہ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہر ملک کی اپنی اپنی مشکلات ہیں۔ انھوں نے ایک ہی فارمولا بنایا ہوا ہے اور جب کوئی بھی ان سے قرض لیتا ہے تو وہ یہ فارمولا اس پر مسلّط کر دیتے ہیں۔ پھر ورلڈ بینک کی بات کریں تو اس کا کام اس سے ذرا مختلف ہے۔ یہ کم ریٹ پر کبھی تو Zero Percent Rate پر آپ

کو سرمایہ دیتے ہیں۔ جو واپس بھی کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا گرانٹ پروگرام بھی ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ 'کم شرح منافع' Low Interest Rate پر لین دین کریں بلکہ وہ اور قسم کے بھی فوائد دیتے ہیں۔ ان کا زیادہ فوکس ڈویلپمنٹ پر ہوتا ہے۔ میں نے ورلڈ بینک میں ترقیاتی منصوبوں کے حوالے سے کام کیا تھا۔ جیسے پانی ہو گیا، یا Infrastructure ہو گیا۔ یعنی جو جو عام انسان کی ضروریات ہیں اس حوالے سے منصوبے تھے۔ میں نے جس موضوع پر کام کیا تھا وہ تھا صاف پانی تک لوگوں کی رسائی اور اس کی نکاسی یعنی Water Sanitation، یہ ایک بنیادی ضرورت ہے لوگوں کی۔ آپ کی بات بجا ہے کہ وہاں پر ایک حد تک غرور آجاتا ہے لوگوں میں کہ ہمیں سب کچھ پتا ہے۔ ہمارے پاس جواب ہیں۔ میرے خیال میں جب آپ ترقیاتی کام میں پڑتے ہیں تو آپ کے پاس جواب نہیں ہوتا جواب ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ آپ کو لوگوں سے ملنا پڑتا ہے اور ان کے ساتھ شمولیت سے آپ حل نکال سکتے ہیں۔ جیسے ہم کشف میں کام کرتے ہیں، ہم لوگوں کو ایک راہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح اپنا کاروبار چلانا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے۔ اپنی خواتین کی خاص طور پر فیصلہ سازی میں تربیت کرنی ہوتی ہے۔ ہمت ان کی ہوتی ہے، محنت ہوتی ہے، ہم تو صرف ان کا ہاتھ تھام رہے ہوتے ہیں۔ یہ سرمایہ ہے، یہ اپنے کاروبار میں لگائیے۔ مزید پیسے کمائیے، اپنے بچوں کا مستقبل بہتر بنائیے، آگے چل کر اپنی بچت کیجیے۔ اپنے کاروبار کو مستحکم بنائیے اور ہمارا سرمایہ ہمیں واپس کر دیجیے۔

س: آپ نے خواتین کے لیے کام کو ہی کیوں چُنا، اس میں ایک محدودیت نہیں پائی جاتی؟

ج: مجھے دراصل خواتین کے ساتھ کام کرنے کا ہمیشہ سے بہت شوق تھا۔ اس وقت بھی پاکستان میں خواتین اور بچیوں کا جو Status ہے وہ ناقابل قبول ہے۔ کسی بھی شعبے کو اٹھا لیں۔ ان کی صحت، تعلیم، کاروباری مواقع کوئی بھی موضوع اٹھائیں گے ہر طرف آپ کو اندھیرا ہی اندھیر نظر آئے گا۔

مجھے ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ میں نے ایسی زندگی گزاری ہے جس میں میں اگر لڑکی ہوتی یا لڑکا ہو اس سے مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔ جو میں کرنا چاہتی تھی اللہ نے مجھے اس کے مواقع دیئے۔ مجھے ایک ایسی فیملی دی کہ جس نے مجھے ہمیشہ سپورٹ کیا۔

مجھے یہ بات ہمیشہ کھٹکتی تھی کہ ہر بچی جو پیدا ہوتی ہے اسے اپنا Potential پورا کرنے کا موقع کیوں نہیں ملتا اور کیوں اس کا Potential چھین لیا جاتا ہے، اس کے فیصلہ کرنے کے مواقع کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ تو میں ہمیشہ اپنے فیصلے خود کرنا چاہتی تھی، میں نے ورلڈ بینک میں بھی جتنا کام کیا تھا خواتین کے حوالے سے ہی کیا تھا۔ جب پانی و صحت تک رسائی کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں تو ان کی زندگیوں پر کیا

بچپن میں ابا سبھی بچوں کو باقاعدگی سے بک شاپ پر لے جاتے۔

یہ ہمارے لیے ایک اہم Event ہوتا تھا

اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ اس سے ان کا جو وقت بچتا ہے (جیسے جن علاقوں میں پانی لینے جانے کے لیے پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے صرف کرتی ہیں) تو وہ پھر کہاں صرف کرتی ہیں؟ بہت سی خواتین پھر کاروبار کی طرف آتی ہیں اور اپنے روزگار کے ذرائع ڈھونڈتی ہیں تو ایسی خواتین کے ساتھ کام کرنے کا ہمیشہ سے مجھے شوق تھا۔

میں نے ورلڈ بینک میں جب کام کیا تو پاکستان میں ہی کام کیا تھا۔ میں اس دوران واشنگٹن میں نہیں اسلام آباد میں تھی۔

س: آپ کو زندگی میں بنگلہ دیش گرامین بینک کے بانی جو اصل میں اس ریجن میں عورتوں کی غربت مٹانے اور چھوٹے قرضے دینے کی سوچ کے بانی ہیں، نے بہت اسپائر کیا ہے۔ ان سے ملاقات پہلے ہوئی یا اسپائریشن؟

ج: میں نے پاکستان میں خواتین کے مسائل کے حوالے سے بہت سفر بھی کیا۔ اسی دوران میری ملاقات ڈاکٹر یونس سے ہوئی۔ UNICEF کی جانب سے اسلام آباد میں ایک کانفرنس تھی، اس میں یہ اسپیکر تھے۔ اس ملاقات میں ہماری بڑی اچھی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے مجھے اپنا کارڈ دیا اور پھر مجھے پتا چلا کہ یہ اتنے بڑے انسان ہیں۔

س: عورتوں کے مسائل زیادہ معاشرتی ہیں، معاشی یا انسانی، کیسے دیکھتی ہیں اسے؟

ج: عورتوں کے جو مسائل ہیں وہ معاشرے کے بھی مسائل ہیں۔ یہ Human Rights کے مسائل ہیں اور انسانی حقوق کے حوالے سے مسائل خواتین کے مالی مسائل ہیں۔ آپ ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ جب آپ علیحدہ کرنے کی کوشش کریں گے تو مسائل اور بڑھ جائیں گے اور یہی بات ڈاکٹر یونس نے مجھ سے کہی تھی جب پہلی دفعہ ان سے ملی اور مجھے یہ بات بہت اچھی بھی لگی اور پھر ہماری بات دو تین سال تک چلتی رہی۔ میں ان سے سیکھتی رہی پھر ایک وقت آیا جب میں نے ورلڈ بینک سے استعفیٰ دے دیا اور ان کو لکھا کہ میں بے روزگار ہوں کیا کروں؟ کیا آپ مجھے مشورہ دیں گے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ بالکل یہی لکھا، انگریزی میں ای میل کی تھی تو انھوں نے مجھے جواب نہیں دیا۔ میں سمجھی کہ ظاہر ہے وہ بہت بڑے آدمی ہیں، کہاں میری ای میل کا جواب دیں گے۔ کوئی دو ہفتے کے بعد مجھے پی آئی اے کے دفتر سے کال آئی کہ آپ کے لیے ایک ٹکٹ ہے اسلام آباد سے ڈھاکہ، آپ آکر وصول کر لیں۔ جب میں نے سنا کہ محمد یونس ڈھاکہ، تو وہ ڈاکٹر یونس ہی تھے۔ میں نے اسی وقت انھیں فون کیا۔ انھوں نے کہا کہ مل گیا ہے تمھیں ٹکٹ تو بس پھر آجاؤ۔ تم جو اس وقت بے روزگار ہو آجاؤ اور دیکھو کام کیسے چل رہا ہے یہاں۔ وہاں سے میں نے پھر اپنے ابو کو فون کیا اور ان سے پوچھا کہ کیا کرنا چاہیے؟ وہ تو کہنے لگے ''مشرقی پاکستان'' (وہ تو تب بھی بنگلہ دیش کو مشرقی پاکستان ہی کہتے تھے) کہ میرا تو اب بھی آدھا دل مشرقی پاکستان میں ہے، تم ضرور جاؤ اور سیکھو۔ تو بس

''مجھے ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ میں نے ایسی زندگی گزاری ہے جس میں میں اگر لڑکی ہوتی یا لڑکا ہوتا اس سے مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔ جو میں کرنا چاہتی تھی اللہ نے مجھے اس کے مواقع دیئے۔ مجھے ایک ایسی فیملی دی کہ جس نے مجھے ہمیشہ سپورٹ کیا۔''

وہاں سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ وہاں میں دس ہفتے رہی، لیکن یہ پہلا وزٹ تھا۔ اگلے دو تین برسوں میں بہت دفعہ وہاں گئی۔

س: تو کیا کشف نے وہیں جنم لیا یا واپسی پہ؟

ج: اصل میں، میں تو وہاں گئی تھی کہ وہاں دو تین سال کام کروں گی۔ لیکن ڈاکٹر یونس نے کہا کہ ہمیں آپ کی بالکل ضرورت نہیں۔ آپ کے ملک کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔ یہ دس ہزار ڈالر میرے پاس آپ کی امانت ہیں۔ آپ واپس جائیں اور جب آپ کو لگے کہ کوئی ایسا کام ہے جو آپ کرنا چاہتی ہیں، مجھے بتا دیں۔ یہ میں آپ کو بھیج دوں گا اور آپ کام شروع کر لیں۔ یہ میں بات کر رہی ہوں 1994ء کی۔ تو تب دس ہزار ڈالرز کی ویلیو آپ کو پتا ہے کتنی تھی۔ تو میں نے کہا یہ تو میں نے نہیں سوچا تھا کہ الگ سے کام کروں۔ لیکن انھوں نے کہا کوئی بات نہیں تم واپس جاؤ، سوچو اور دیکھو کہ کیا کرنا ہے۔ جب میں بنگلہ دیش میں سفر کر رہی تھی تو Grameen Bank کے لوگوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا۔ جہاں جہاں میں گئی انھوں نے بہت خوش اسلوبی سے میرا استقبال کیا۔ اپنا پورا Process مجھے سمجھایا۔ وہاں پر میں ان کی ایک کلائنٹ کے گھر پر رہی۔ دو تین دن کے لیے تو وہاں جب میں نے دیکھا کہ اتنی مشکل سے لوگ اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ زرخیز زمین بھی نہیں ہے اور تھوڑا تھوڑا پیسہ جمع کر کے، چھوٹے چھوٹے کاروبار چلا کر انھوں نے اپنی زندگی Sustain کی ہوئی ہے تو وہاں پر آپ یوں سمجھیں مجھے لگا کہ یہ ایک معجزہ ہے اور معجزہ کشف کو کہتے ہیں کہ اس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ پاکستان کی عورتوں کے لیے ایسے مواقع کی فراہمی بہت ضروری ہے۔

اس طرح کرتے کرتے کشف کا آئیڈیا 1995ء نومبر میں Develop ہوا اور پھر ڈاکٹر یونس نے اپنے وعدے کے مطابق وہی ایڈ مجھے دے دی اور پھر میری نانی نے بھی اس کو شروع کرنے کے لیے سب سے پہلی Donation دی۔

س: آپ بہت Young CEO ہیں فیلڈ میں لوگوں کو مانتے ہوئے مشکل تو ہوتی ہوگی؟

ج: ہاں لیکن اب تو لوگ بہت جان گئے ہیں۔ پہلے لوگ بہت کہتے تھے۔ لیکن اگر آپ دیکھیں تو ہماری ساری ٹیم بہت Young ہے۔ میرے Business Development Officers ہیں وہ عام طور پر بی۔اے کر کے آتے ہیں اور اب ہمارے ادارے میں Average Age (چونکہ بہت عرصے سے بھی بہت سارے لوگ کام کر رہے ہیں) بھی 26-27 ہوگئی ہے۔

س: جو لوگ آپ کے پاس ہیں کیا وہ سب آپ کا انتخاب ہیں؟

ج: ہاں یہ بالکل ہمارے اپنے بچے ہیں جو فیلڈ

آفس میں آج کل ہم سب ''اقبالیات'' پڑھ رہے ہیں۔

مزاج بدلنے کے لیے یہ بہت ضروری اور اہم ہے

میں جاتے ہیں۔ چھوٹے علاقوں سے لے کر KPK تک جاتے ہیں۔ پنجاب تو ہمارا پورا Cover ہوا ہوا ہے۔ سندھ کے مختلف علاقوں تک ہم پہنچ چکے ہیں۔ پنجاب میں ایک دو اضلاع ہوں گے جہاں ہم نہیں ہیں۔ سندھ کے 4 اضلاع میں ہیں اور KPK کے تین میں۔

س: مستقبل کی کیا منصوبہ بندی ہے؟

کشف فاؤنڈیشن سے کشف مائیکرو فنانس بینک تک تو پہنچ گئے ہیں۔ یہاں آپ کا Second in Command کون ہے۔ کیا آپ نے اپنی مرضی سے کسی کو چنا اور ٹرینڈ کیا ہے؟ جیسے کارپوریٹ ورلڈ میں سکسیشنل پلاننگ کہا جاتا ہے۔

ج: میرے پاس اس وقت بہت اچھے لوگ ہیں، ہمارے ہیڈ آفس میں اس وقت جو کام کر رہے ہیں Chief Operating Officer ہیں، کامران۔ یہ کوالیفائیڈ Chartered Accountant ہیں اور پچھلے آٹھ سال سے ہمارے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ یہ پرائیویٹ سیکٹر سے آئے تھے اور یہ اسی جذبے کے ساتھ آئے تھے کہ وہ پاکستان اور پاکستان کی خواتین کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے آفس کا ایک کلچر ہے کہ ہم بہت Professional ہیں۔ جتنے بھی لوگ آپ کو کشف میں ملیں گے وہ Professional Degree Holder ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہیڈ آفس میں IT میں فیصل اور ثناء ہیں۔ ہماری HR Manager ہیں زینب، یوں ہماری ہر طرح سے کوشش ہوتی ہے کہ خواتین و مرد مل کر کام کریں اور یہ سب لوگ ہمارے ساتھ ایک عرصے سے ہیں۔

س: Youth کی جو بچیاں ہیں انھیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہ اگر کچھ کرنا چاہیں تو وہ کر پائیں گی۔ عام طور پر بھی جاب کی طرف بھاگتے ہیں اور خود سے بزنس شروع کرنے کا سوچتے بھی نہیں اور Entrepreneur Approach بھی نہیں ہے کیسے گائیڈ کریں گی ان بچیوں کو؟

س: پہلے تو آپ ان سب سے کہیں کہ وہ ہمارا ڈراما دیکھیں Hum TV پر ''رہائی'' کے نام سے چل رہا ہے۔ Concept ہمارا ہے، پھر ہم نے پوری ٹیم سلیکٹ کی پھر پروڈکشن ہاؤس کو Hire کیا اور اس کا موضوع بالکل یہی ہے کہ ایک اکیلی عورت کیا کچھ کر سکتی ہے۔ جب کہ اس کے اردگرد بھنور ہیں، ان سے کیسے نکلے گی، ہم نے اس میں بچیوں کی تعلیم کی بات کی ہے، ہم نے اس میں گھریلو تشدد کی بات کی ہے۔ ہم نے ان تمام موضوعات کو پیش کیا جن کا ہر عورت کو روزمرہ سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ کہانی بالکل حقیقی ہے۔ یہ ڈراما فرحت اشتیاق (انھوں نے ''ہم سفر'' لکھا تھا) سے ہم نے لکھوایا ہے۔ اس کے لیے ہم نے انھیں کہا کہ اس بار آپ نے Reality Based لکھنا ہے۔ ورنہ وہ ہمیشہ رومانوی ناول لکھتی ہیں۔ ہم نے ان کو اپنی کلائنٹس کی کوئی پندرہ بیس کہانیاں دیں اور اس میں سے بھی انھوں نے ایک

کہانی منتخب کی۔ یوں سمجھیں کہ 90 فیصد اصل کہانی ہے جب کہ 10 فیصد ہم نے ایسے Treat کیا ہے جس سے وہ ڈراما سیریل بن سکے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ جو ہمارا Mind Set بنا ہوا ہے کہ خواتین کچھ نہیں کرسکتیں، کاروبار نہیں چلاسکتیں یا ان کے پاس کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، اس کو Break کیا جاسکے۔ ان مشکلات کے باوجود جب ایک خاتون نکلتی ہے، گھر سے باہر اپنا کاروبار کرتی ہے اور پہلی دفعہ اس کے ہاتھ میں اپنی کمائی آتی ہے تو وہ تبدیلی میں نے اپنی آنکھوں سے ہزاروں لاکھوں دفعہ دیکھی ہے۔

س: کشف کا کام کس قدر مستقل بنیادوں پر استوار ہے؟

ج: یہ پیغام ہے۔ جو مجھے ڈاکٹر یونس نے بھی کہا تھا کہ Micro Finance کوئی مستقل کام نہیں ہے۔ آپ سسٹم بنالیں، ایک پراسس بنالیں وہ چلتا رہے گا۔ جب کہ لوگوں کی ذہنیت بدلنا تمھارا کام ہے۔ اور یہی کام ہم کشف میں کرتے ہیں۔

پہلے ہم خواتین اور ان کی فیملی پر کام کرتے ہیں تاکہ ان کے اندر شعور پیدا ہو۔ ہمارے ہاں ٹریننگ سیشن ہوتے ہیں جنھیں ہم مالیاتی تربیتی پروگرامز بھی کہتے ہیں۔ اس میں ہم مردوں کی بھی تربیت کرتے ہیں اور خواتین کو بھی فوکس کرتے ہیں تاکہ ان کو پتا ہو کہ کاروبار کس طرح چلانا ہے۔ پیسوں کا استعمال کیسے کرنا ہے، انھیں کاروبار میں کیسے لگانا ہے۔ واپس کیسے کرنے ہیں، بچت کیسے کرنی ہے۔ جب مال بیچتی ہیں تو اس کے دام کیسے مقرر کرنے ہیں۔ یہ تمام باتیں ہم انھیں ٹریننگ کے دوران بتاتے ہیں۔ یہ ہمارا باقاعدہ پروگرام ہے۔ تین دن کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ کبھی کو اس میں سے گزرنا ہوتا ہے۔ ایک ابتدائی ٹریننگ ہوتی ہے جس میں ہم ان کی بزنس پلاننگ کرتے ہیں۔ اس کے بعد تین دن کی ایک اور ٹریننگ ہوتی ہے، پھر اس کا ایک Follow On ہوتا ہے، جب اگلے سال وہ دوسری دفعہ ہمارے پاس آتے ہیں۔ سرمائے کا دورانیہ ڈیڑھ سال ہوتا ہے۔ ہم اسے قرض نہیں سرمایہ کہتے ہیں۔ ہماری Investment ہوتی ہے یہ۔ اس کے علاوہ اگر کبھی Loss بھی ہو جائے یا Incase کوئی مشکل بھی آجاتی ہے تو ان کے ساتھ انشورنس بھی ہوتی ہے۔ کبھی کوئی بیمار ہو جائے یا فوت ہو جائے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کلائنٹ کی مشکلات بہت بڑی ہو جائیں تو پھر ہم ان کو Releif بھی دیتے ہیں۔ لیکن یہ بہت کم Cases ہوتے ہیں 0.4 فیصد ایسے کیس ہوتے ہیں جہاں پر ہمیں Relief دینا پڑا۔ لوگ Cheat نہیں کرتے۔ ہمارا 99 فیصد پیسہ واپس آتا ہے۔ پھر کچھ ایسے کیسز ہوتے ہیں کہ آپ کو نظر آرہا ہوتا ہے جیسے کسی کو کوئی بڑی بیماری ہو جائے، کسی

کا گھر جل گیا یا کوئی بڑا سانحہ ہو گیا۔ جیسے سیلاب آیا تھا ملتان میں تو ہمارے 300 کے لگ بھگ لوگ متاثر ہوئے تھے۔ اسی طرح جوزف ٹاؤن کے کلائنٹس ہیں۔ ان کو ہم نے ریلیف آفر کیا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگ یہ نہیں کہتے کہ جو ہم نے بقایا جات دینے ہیں وہ ہمیں معاف کر دیں۔ بلکہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں تین یا چھ مہینوں کا وقت دے دیں، ہم اس کے بعد پیسے دے دیں گے۔ کہتے ہیں یہ ہمارے لیے بہت اہم سہولت ہے اگر آپ نے آج معاف کر دیا تو آئندہ ہم کس منہ سے آکر آپ سے پیسے مانگیں گے۔ تو ہم ان کے مطابق ان کو Choices دے دیتے ہیں اور وہ اپنے حالات کے مطابق مہلت لے لیتے ہیں۔ جیسے جوزف ٹاؤن میں بھی ہم ان کے ساتھ بیٹھے، ان کے ساتھ میٹنگ کی تو انھوں نے تین مہینے کا ٹائم لیا اور کہا کہ تب تک ہمارے کاروبار شروع ہو جائیں گے تب تک آپ ہمیں چھوٹ دیں۔ لوگ جان بوجھ کر ہمیں Dodge نہیں کرتے۔ یہ غلط نظریہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ فراڈ کرتے ہیں۔ جیسے پہلے بھی میں نے بتایا کہ ہمیں ایک فیصد سے بھی کم ایسے لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ اچھے، معیاری اداروں کی کمی کے باعث ہے۔ اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ کوئی بچہ، بچی اٹھائیں جو ابھی گریجوایشن کر کے آیا ہو۔ اس کو آپ ایک غلط ادارے میں ڈال دیں تو وہ غلط کام ہی کرے گا/کرے گی۔ لیکن اگر آپ اس کو معیاری ادارے میں ڈال دیں جہاں اخلاقیات کا معیار ہو تو ظاہر ہے وہ غلط کام نہیں کریں گے۔

س: ڈاکٹر یونس جب لون دیتے ہیں تو وہ 14 نکات کا کلائنٹ سے حلف بھی لیتے ہیں۔ آپ کے ہاں بھی ایسا کوئی سلسلہ ہے؟

ج: ہمارے ہاں پانچ نکات ہیں، سب سے پہلے تو یہ ہوتا ہے کہ

1۔ میں جب سرمایہ لوں گی تو اپنے کاروبار میں لگاؤں گی۔ وہ میں نے بے وجہ خرچ نہیں کرنا۔

2۔ وقت کی پابندی کروں گی جو بھی اصول، ضوابط ہیں انھیں سمجھوں گی اور ان کے مطابق چلوں گی۔

3۔ بچت کروں گی جو آج کما رہی ہوں اس میں سے مستقبل کے لیے بچا کر رکھوں گی۔

4۔ اپنی قوت سے زیادہ پیسہ نہیں اٹھاؤں گی۔ اتنا ہی لوں گی کہ جتنی ضرورت ہو گی۔ (ایک Crises جو انڈیا میں بھی آیا تھا وہ یہ تھا کہ ایک ایک شخص نے ایک وقت میں پانچ، پانچ، چھ چھ قرض لے لیے تھے اور یہ نہیں دیکھا کہ وہ واپس کیسے کریں گے۔ یہ دونوں سائیڈ کا مسئلہ تھا کلائنٹ کا بھی اور اداروں کا بھی۔ تو ہم بہت سختی سے اس کو مانیٹر کرتے ہیں اور اس وقت ایک پراجیکٹ بھی شروع کیا ہے ہم نے جس میں ہم Computerized Information Bureau بنا رہے ہیں۔ چونکہ ہم شناختی کارڈ پر قرضہ دیتے ہیں اس سے شناختی کارڈ نمبر سے ڈیٹا سامنے آجائے گا کہ آیا اس شخص

نے پہلے کبھی قرض لیا ہے یا نہیں۔ نہ صرف ہم سے بلکہ دوسرے اداروں سے بھی اور آیا واپس کیا بھی تھا یا نہیں۔)

5۔ پانچویں چیز یہ ہے کہ میں اپنے بچوں کے مستقبل کو سنواروں گی۔

ہم نے حلف اور ارادہ بہت سادہ رکھا ہے۔ ہماری جو Pass Book ہے اس کے پیچھے بھی لکھا ہے اور ٹریننگ کے دوران بھی انہی باتوں کو بار بار دہراتے ہیں۔

پچھلے دنوں میں عارف والا گئی تھی۔ وہاں خواتین مصالحے پیستی ہیں اور انھیں پیک کرتی ہیں اور بہت زیادہ وہاں یہ کام ہو رہا ہے۔ تقریباً ہر گلی میں یہ کام لوگ کر رہے ہیں اور برسوں سے چل رہا ہے۔ اب اس بزنس میں ہر کوئی شامل ہے۔ بچے اسکول سے واپس آ کر کام میں لگ جاتے ہیں۔ خاوند، بیٹا وہ تھوک کی مارکیٹ سے آرڈر لے کر آ رہا ہے، خاتون اگر پڑھی لکھی ہے وہ بیٹھ کر حساب کتاب کر رہی ہے۔ اس نے مزید خواتین کو کام دیا ہوتا ہے۔ تو سب اس بزنس میں لگے ہوتے ہیں اور اس کو ہم Home Business کہتے ہیں اور عموماً ایسے کاروبار میں 50 ہزار کا سرمایہ اچھے طریقے سے استعمال ہو سکتا ہے اور اگر بہت ہو تو لاکھ تک جا سکتا ہے۔

س: کشف فاؤنڈیشن کو اپنے مقصد یعنی خواتین کی بحالی اور غربت کا خاتمہ کے حوالے سے جس قدر شناخت ملی ہے ملکی سطح پر اور باہر بھی، اس پر کیا کہیں گی؟

ج: ہر موقع کی اپنی خوشی ہوتی ہے۔ میرے خیال سے اچھا تب لگتا ہے کہ جب آپ کے اپنے ملک میں باقاعدہ پہچان ملتی ہے۔ باہر تو آپ اپنے ملک کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔ جب صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی ملا تھا تو خاص طور پر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ جو لوگ اچھا کام کر رہے ہیں ان کو سراہنا چاہیے۔ یہ میں صرف اپنے حوالے سے بات نہیں کر رہی۔ ہمارے ملک میں تنقید برائے تنقید کا بھی ایک نامناسب رویہ ہے اسے ذرا بند کرنے کی ضرورت ہے اور میڈیا نے اسے بڑھانے میں بہت کردار ادا کیا ہے۔ اچھی خبریں تو آتی ہی نہیں ہیں۔ جو لوگ سالہا سال سے کام کر رہے ہیں ان کو تو پہچان نہیں ملتی۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ ان کے پیچھے ضرور کسی کا ہاتھ ہے جو کہ سچ نہیں ہوتا۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں جو بہت اچھا کام کر رہے ہیں آپ ان کو Recognise کریں۔ جب آپ کو اپنے ملک میں پہچان ملتی ہے تو اس کا اپنا ہی ایک مزا ہے۔

مجھے ایک اور موقع پر بہت خوشی ہوئی۔ میرے خیال میں یہ نہ صرف میرے لیے بلکہ پاکستان کے لیے باعث فخر تھا جب صدر اوباما نے ہمیں Recognise کیا تھا 2010ء میں۔ انھوں نے بہت اچھے طریقے سے ہمیں متعارف کرایا تھا۔ ہوا یوں کہ ڈاکٹر یونس اور میں Enterpreneourship Summit میں گئے تھے اور یہ صدر اوباما کا مصر کا پہلا دورہ تھا۔ اس میں تمام مسلمان ممالک میں سے ایسے لوگ بلوائے گئے تھے جو اپنی اپنی فیلڈ میں مانے ہوئے

تھے۔ میں اور ڈاکٹر یونس ہی دو ایسے تھے جو مائیکروفنانس سے بُلائے گئے تھے۔ تو جب انھوں نے اپنی تقریر کے دوران اس میں حوالہ دیا کہ ہمارا Enterpreneourship کا تقاضا یہ ہے کہ ایک گڑی دوسری گڑی کو پکڑے انھوں نے ڈاکٹر یونس کا ذکر کرتے ہوئے کہا بالکل اسی طرح جیسے ایک معیشت دان تھا بنگلہ دیش میں، جس نے یہ کام شروع کیا اور پھر اس نے یہ کام ایک خاتون جو پاکستان میں تھی اس کو سکھایا، جس سے لاکھوں خواتین کو فائدہ ہوا۔ تو جب انھوں نے ہمارے ملک کا نام مینشن کیا تو بہت اچھا لگا۔ وہاں پہ میاں منشا صاحب سمیت ہمارے بڑے بڑے سرمایہ دار اور صنعت کار بھی موجود تھے۔ جب انھوں نے یہ سنا تو انھیں بھی بہت فخر محسوس ہوا۔ انھوں نے آ کر مجھے کہا کہ آج پہلی دفعہ امریکن صدر سے ہم نے پاکستان کی تعریف سنی ہے۔

س: کشف کا ایک قابل تقلید پہلو اس کی بزنس اخلاقیات (Business Ethics) کا اہتمام اور اس کی ترویج بھی ہے، یہ اتفاقاً تو نہ ہوا ہوگا؟

ج: یہ بہت سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔ ہمارا عملہ، آفس، کلائنٹس ہر جگہ ہم کاروباری اخلاقیات کا اہتمام کرتے ہیں۔

یہاں پر کام کرنے کے بہت سے مواقع ہیں بشرطیکہ آپ نسبتاً صاف رہیں۔ دل سے کام کریں اور اخلاقیات کو درست رکھیں۔ اپنے نصیب العین اور مقاصد کو سامنے رکھیں تو آپ کیا سے کیا نہیں کر سکتے ہیں۔

میں عام طور پر Vague Ethics پر یقین نہیں کرتی۔ Ethics بہت واضح اور لکھی ہوئی ہونی چاہیے۔ اس پر مسلسل فوکس رہنا چاہیے۔ یقین مانیں ادارے اور بزنس دونوں کی عمر بڑھ جائے گی۔ ادارے اپنی کاروباری اخلاقیات کو درست کر لیں، اپنا بزنس کلچر درست کر لیں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ 90 فیصد وقت جو میں ٹریننگ میں اسٹاف کے ساتھ بات کرتی ہوں Ethics پر ہوتی ہے۔ جس طرح ابھی ہم نے Fraud Prevention کے حوالے سے ٹریننگز کی ہیں۔ Dignity at Work ہم باوقار پروفیشنل ماحول پر بھی کام کرتے ہیں جیسے دفاتر (Work place) پر Sexual Harsassment کی روک تھام، یہ کس قدر اطمینان کی بات ہے کہ یہ کمزوری کشف میں نہیں ہے۔ میرا تو زیادہ تر وقت جو اسٹاف کے ساتھ گزارتی ہوں ان موضوعات پر ہوتا ہے۔ مائیکروفنانس پر میں کم ہی بات کرتی ہوں۔ وہ باقی لوگ کرتے ہیں۔ اس کا سسٹم بنا ہوا ہے۔ کسی کی جو بھی ٹریننگز ہیں وہ ہمارے ٹیکنیکل لوگ کرواتے رہتے ہیں۔

س: آنے والے دنوں میں کیا نئے اہداف اور منصوبے ہیں؟

ج: کشف میں ہم بہت سے نئے کام کر رہے ہیں۔ ابھی ایک اور پراجیکٹ کا آغاز کر رہے ہیں کم آمدنی کے اسکولوں کے ساتھ۔ اس وقت اگر آپ پنجاب کا Assessment کریں تو 45,000 اسکولز ایسے ہیں جو لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت قائم کیے

جہاں 200,300 بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ ان اسکولوں کے معیار کو ہم نے بہتر بنانا ہے۔ اس میں ہم تین طرح سے کام کر رہے ہیں سرمایہ دے رہے ہیں کہ ان کے بنیادی انفراسٹرکچر کو بہتر بنایا جائے۔ کئی کے پاس مناسب فرنیچر نہیں، کہیں بلڈنگ نہیں یا ورکنگ کیپٹل کے لیے پیسہ نہیں ہے۔ جس سے بہتر ٹیچرز کو لے کر آئیں۔ ان کو ایک لاکھ تک سرمایہ ہم دیں گے۔ دوسری جو مدد ہم کر رہے ہیں کہ پورا منصوبہ بنا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی مہارتوں کو کس طرح بہتر بنا سکتے۔ ہیں یہ ایک ٹریننگ پیکج ہے۔ پھر تیسرا مقصد یہ ہے کہ ٹیچر ٹریننگ کو بہتر کیا جائے۔

ابھی حال ہی میں ہم نے یہ پراجیکٹ شروع کیا ہے۔ بیکن ہاؤس کے ساتھ مل کر، ہم اسکول منتخب کرتے ہیں۔ کم آمدنی کے علاقوں میں جب کہ بیکن ہاؤس کے ٹیچرز ان اسکولوں کو ٹریننگ دیتے ہیں۔ یہ ان کا یوں سمجھیں C S R ہے یعنی یہ ان کی Corporate Social Responsibility ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سے کام کر رہے ہیں، خاص طور پر ان سیکٹرز میں جہاں خواتین کا زیادہ رجحان ہے جیسے اُڈے کا کام ہوگا، دکانیں چلانے کا کام ہو، Commodity Trading جیسے کپڑا بیچنا، مال مویشی وغیرہ کا کام۔

جب انسان کے ہاتھ میں اپنی آمدنی آتی ہے تو ایک دم آپ کے کندھے خود سے سیدھے ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور آپ کو جو بوجھ محسوس ہوتا ہے وہ کچھ حد تک کم ہونے لگتا ہے۔ یہ تبدیلیاں ہمیں خواتین میں محسوس ہوتی ہیں۔ ہماری ریسرچ ہمیں بتاتی ہے کہ جو شروع میں ہمارے پاس آتی ہیں ان میں سے تیس سے چالیس فیصد کہتی ہیں کہ مجھے اپنی رائے پر اعتماد ہے کہ میں کوئی بھی فیصلہ کروں گی وہ درست ہوگا۔ جب ایک دو سال بعد ہم ان سے یہی سوال پوچھتے ہیں تو ان میں سے 85 فیصد عورتیں کہتیں ہیں کہ اب میں زیادہ پراعتماد ہوں۔ میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں اور میری فیصلہ سازی کی جو صلاحیت ہے وہ بہت بہتر ہوئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ ایک شاندار تبدیلی ہے۔ جب یہ تبدیلی آنی شروع ہو جائے تو یہ آگے منتقل ہو جاتی ہے۔ ابھی حال ہی میں بہاول نگر گئی ہوئی تھی وہاں ہماری ایک کلائنٹ کی ایک بیٹی تھی۔ اس نے پہلے اسے پڑھایا اور اب وہ ہمارے ہاں جاب بھی کر رہی ہے۔ بزنس ڈویلپمنٹ آفیسر کے طور پر۔ ایک قسم کی آپ کو تحریک نظر آ رہی ہے۔ اس طرح پھر ان کے لیے مواقع بڑھ جاتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ خواتین جاب بھی کر رہی ہیں تو اسی کمیونٹی میں ہماری آفیسرز ایک رول ماڈل بھی بن جاتی ہے۔ ملاقات اختتام کو پہنچی تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک کشف سے شروع ہونے والا کام اب سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر کئی ادارے سرانجام دے کر لاکھوں مستحق لوگوں کی زندگیاں بدل رہے ہیں اور یہ کریڈٹ کیا کم ہے کہ جب بھی مائیکروفنانس (چھوٹے قرضوں) کا ذکر آئے گا تو کشف کا ذکر بھی ساتھ ہی آئے گا۔ ■■■

طب و صحت

ڈاکٹر نصیر علی

20 عادتیں جو آپ کو فربہ بناتی ہیں

زیادہ کھانے سے انسان موٹا نہیں ہوتا، موٹاپا اُس وقت جنم لیتا ہے جب آپ زیادہ حرارے یعنی کیلوریز کھاتے ہیں۔

بیس سالہ اصغر کالج میں داخل ہوا تو وہاں اکثر کچھ نہ کچھ کھاتا پیتا رہتا۔ ہر وقت چرتے رہنے سے اُسے موٹا تازہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے دوست یہ دیکھ کر اظہار تعجّب کرتے کہ اصغر تو بڑا ''اسمارٹ'' یعنی دبلا پتلا اور اچھی صحت کا مالک ہے۔ آخر اس کی صحت کا راز کیا تھا؟

دراصل اصغر مضرِ صحت چیزیں نہیں بلکہ پھل، سبزی اور میوہ جات کھاتا تھا جو انسان کو فربہ نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں یہ غلط نظریہ جڑ پکڑ چکا کہ انسان زیادہ کھانے سے موٹا ہوتا ہے۔ حالانکہ موٹاپا اس وقت جنم لیتا ہے جب انسان زیادہ حرارے (کیلوریز) کھائے۔ چنانچہ کم حراروں والی غذائیں زیادہ لی جائیں، تب بھی وہ ہمیں موٹا نہیں کرتیں۔ لیکن زیادہ حراروں والی غذا ہمیں قدرتاً فربہ بنا ڈالتی ہے۔

ذیل میں ایسی 20 عادات کا ذکر ہے جنھیں اختیار کرنے سے ہم موٹاپے کا شکار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان سے دور رہیے اور خود کو سدا اسمارٹ رکھیے۔

پہلی عادت: زیادہ یا کم سونا

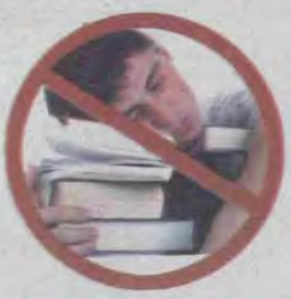

یاد رکھیے، موٹاپا بیماریوں کی ماں کہلاتا ہے۔

کیلی فورنیا یونیورسٹی کے محققوں نے تجربات سے دریافت کیا ہے کہ جو مرد و زن پانچ گھنٹے سے کم سوئیں، ان کے شکم پہ ''ڈھائی گنا'' زیادہ چربی چڑھ

جاتی ہے۔ جب کہ جو آٹھ گھنٹے سے زیادہ نیند لیں، ان کے بدن پر بھی تقریباً اتنی ہی چربی چڑھتی ہے۔ لہٰذا اگر آپ کو اپنا وزن کنٹرول کرنا ہے تو رات کو چھ سات گھنٹے ضرور سوئیے۔

دوسری عادت: بوتلیں پینا

لاکھوں پاکستانی ہر ہفتے کھاتے پیتے تقریباً ایک گیلن سوڈا واٹر چڑھا جاتے ہیں جو انسانی صحت کے لیے خطرناک ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے، جو مرد یا عورت روزانہ ایک دو بوتلیں پیئے، اس کا موٹا ہونے کا امکان 33 فیصد بڑھ جاتا ہے اور اس ضمن میں ڈائٹ سوڈا بھی برابر کا مجرم ہے۔

برطانوی آکسفورڈ یونیورسٹی میں پچھلے دس برس سے ایسے 100 بوڑھوں پر تجربہ جاری تھا جو روزانہ ایک یا دو سوڈا بوتلیں پیتے تھے۔ یہ تجربہ کچھ ہی عرصہ پہلے اختتام کو پہنچا۔ اس کا ماحصل یہ نکلا کہ باقاعدگی سے بوتلیں پینے والوں کا وزن ''پانچ گنا'' زیادہ بڑھ گیا۔ محققین کا خیال ہے کہ بوتلوں میں شامل مصنوعی شکر اور دیگر کیمیائی مادے بھوک کو بڑھاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے زیر اثر زیادہ کھانا کھایا جاتا ہے۔

تیسری عادت: کم چکنائی والی غذائیں کھانا

بازار میں کم چکنائی (Low-Fat) والی کئی غذائی اشیا دستیاب ہیں مثلاً دودھ وغیرہ۔ لیکن اب ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں کچھ ہی کم حرارے موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اس عمل کے دوران چکنائی کی جگہ نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) لے لیتا ہے۔ نشاستہ ہمارے جسم میں پہنچتے ہی تیزی سے ہضم ہوتا اور یوں شکر کی سطح بڑھا دیتا ہے۔ اور جب شکر کی سطح کم ہو تو فوراً ہمیں بھوک لگ جاتی ہے۔ یہی چکر پھر انسان کو موٹا بناڈالتا ہے۔

چوتھی عادت: کھانا چھوڑ دینا

پاکستانیوں کی بڑی تعداد صبح، دوپہر یا رات کو ایک وقت کا کھانا نہیں کھاتی۔ بہت سے مرد وزن دبلا ہونے

کی خاطر یہ عمل اپناتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ خصوصاً ناشتہ چھوڑنے والے یوں خود کو موٹاپے کا شکار بنا لیتے ہیں۔

مثلاً امریکی کارنیوال یونیورسٹی کے ماہرین نے ایک تجربے سے معلوم کیا کہ جو لوگ ناشتہ نہ کریں، وہ جلد فربہ ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ کھانا ترک کرنے سے ہمارا نظام استحالہ (Metabolism) سست ہو کر بھوک بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ انسان اگلے کھانے میں معمول سے زیادہ غذا کھاتا ہے۔ یہ اُلجھن اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔

پانچویں عادت: ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل نہ کرنا

تجربات سے انکشاف ہوا ہے کہ جو فربہ مرد و زن ماہرین غذائیات کی ہدایات پر عمل نہ کریں تو وہ دبلے نہیں ہوتے، بلکہ ان پر مزید موٹاپا چڑھ جاتا ہے۔ دوسری طرف ہدایات پر عمل کرنے والے نہ صرف اسمارٹ ہونے لگتے ہیں، بلکہ روزمرہ سرگرمیوں میں ان کی چلت پھرت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ آپ بھی اپنے ماہر غذا کی ہدایات پر لبیک کہیے اور مثبت نتائج پائیے۔

چھٹی عادت: جلدی جلدی کھانا

شاید آپ کو علم نہ ہو، ہمارا جسم ایک بڑی خامی رکھتا ہے..... یہ کہ ہمارا معدہ دماغ تک یہ پیغام پہنچانے میں پورے 20 منٹ لگاتا ہے کہ وہ بھر چکا۔ یہی وجہ ہے کہ جلدی جلدی کھانے والے مرد و زن عموماً معمول سے زیادہ کھانا ہڑپ کر جاتے ہیں۔ جب کہ آہستہ آہستہ کھانے والے نسبتاً کم کھاتے اور موٹاپے سے بچ جاتے ہیں۔

ایک فرانسیسی یونیورسٹی میں تجربے سے انکشاف ہوا کہ سستی سے کھانا کھانے والے فی طعام 66 حرارے کم کھاتے ہیں۔ اس تعداد کو معمولی نہ سمجھیے..... یوں ہر سال ہم اپنے جسم میں 20 پونڈ چربی چڑھانے سے بچ جاتے ہیں۔

ساتویں عادت: ہوٹلوں میں مفت غذائیں کھانا

کئی ہوٹل اور ریستوران اپنے گاہکوں کو کسی مخصوص دن کوئی مخصوص غذا مثلاً چپس، بسکٹ، سالسا وغیرہ مفت فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے مرد و زن مفت کا مال سمجھ کر وہ غذا خوب اڑاتے ہیں۔ لیکن یہ قدم اٹھانے کی انھیں قیمت بھی چکانی پڑتی ہے۔ وہ یہ کہ زائد غذا کھا کر وہ اپنے کھانے میں کم از کم 300 حراروں کا اضافہ کر بیٹھتے ہیں۔ بظاہر یہ مقدار معمولی لگتی ہے، لیکن جب مفت غذا کھانا معمول بن جائے تو زائد حرارے ہی انسان کو فربہ کر ڈالتے ہیں اور اسے پتا بھی نہیں چلتا۔

آٹھویں عادت: حد سے زیادہ ٹی وی دیکھنا

امریکی ورماؤنٹ یونیورسٹی میں ایک حالیہ تجربے سے انکشاف ہوا کہ جن موٹے مرد و زن نے روزانہ ٹی وی دیکھنے کا دورانیہ نصف کیا، انھوں نے 119 حرارے مزید جلائے۔ وجہ یہی ہے کہ وہ اس دوران دوسرے

کام کاج میں مصروف یعنی عموماً متحرک رہے۔ گویا وہ ایک سال تک اپنا یہی معمول رکھیں تو یہ ان کا 12 پونڈ وزن کم کر ڈالے گا۔

اکثر لوگ عموماً کھانا کھاتے ہوئے ٹی وی دیکھتے ہیں۔ تب وہ ٹی وی میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ انھیں پتا ہی نہیں چلتا وہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھا چکے۔ چنانچہ ٹی وی دیکھتے ہوئے کھانا انھیں فربہ کر ڈالتا ہے۔ مزید برآں بہت سے لوگوں میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر کچھ کھانے کی خواہش بھی جنم لیتی ہے۔

نویں عادت: زائد کھانے کا آرڈر دینا

کئی ہوٹل خصوصاً فاسٹ فوڈ ریستوران زیادہ کھانا (کومبو میل) سستا فروخت کرتے ہیں۔ لہٰذا سستے کھانے کی چاہ میں بہت سے مرد وزن اسی کومبو میل کا آرڈر کرتے ہیں۔ لیکن وہ بے خبری میں اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے جسم میں سو ڈیڑھ سو حرارے مزید چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا پیسے بچانے کے چکر میں زائد کھانا نہ خریدیئے ورنہ موٹاپے کا نشانہ بننے کے لیے تیار رہیے۔

دسویں عادت: سفید ڈبل روٹی کھانا

فرانسیسی اوسبورن یونیورسٹی نے ایک تجربے میں درجن پھر فربہ مرد وزن کو بارہ ہفتوں تک خالص اناج کھلایا۔ تجربہ ختم ہوا تو پتا چلا کہ ان کے شکم پہ چڑھی بہت سی چربی اتر گئی۔ گویا میدہ اور چھنے ہوئے اناج سے بنی اشیا انسان کو فربہ کرتی ہیں۔ جب کہ خالص اناج اسمارٹ بناتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ خالص اناج میں ریشہ (فائبر) کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ نیز ان میں دیگر غذائی اجزا بھی موجود ہوتے ہیں۔ یہی خوبی انھیں سپر فوڈ بنا ڈالتی ہے۔

گیارہویں عادت: میز پر پلیٹیں رکھنا

ہمارے ہاں پہلے یہ رواج تھا کہ کھانے کا ڈونگا باورچی خانے میں رکھا ہوتا تھا اور امی یا دادی ہر کسی کو پلیٹ میں نکال کر سالن دیتیں۔ آج کل یہ رواج ہے کہ میز پر سالن کے ڈونگے رکھے جاتے ہیں۔ اب ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ باورچی خانے میں ڈونگے رکھنے کی روایت ہی طبی طور پر درست تھی۔

وجہ یہ ہے کہ جب میز پر سالن رکھا ہو تو انسان بے اختیار زیادہ کھانا کھا بیٹھتا ہے۔ بعض مرد و زن تو 35 فیصد تک زیادہ کھانا کھا لیتے ہیں۔ لیکن جب کسی کو علم ہو کہ سالن لینے کے لئے باورچی خانے تک جانا پڑے گا تو وہ معمول کے مطابق کھاتے ہیں۔ لہٰذا تندرستی کی طلب ہے تو بزرگوں کی روایت کی طرف پلٹ جائیے۔

بارہویں عادت: پانی کم پینا

پانی ہمارے بدن کا اہم جزو ہے۔ بلکہ تمام جسمانی افعال اسی مائع کی مدد سے انجام پاتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم روزانہ مطلوبہ مقدار میں پانی نوش کریں اور زیادہ پانی پینے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ ہمیں دبلا کرتا ہے۔

امریکی اُوٹاہ یونیورسٹی میں ایک تجربے کے دوران فربہ مرد و زن کو کہا گیا کہ وہ ایک ماہ تک روزانہ ہر کھانے سے قبل دو گلاس پانی پئیں۔ تجربے کے اختتام پہ معلوم ہوا کہ پانی نہ پینے والوں کی نسبت ان کا وزن 30 فیصد کم ہو گیا۔

مزید برآں جرمن ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ پانی سرد ہو تو اثر دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ وہ فربہ لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ روزانہ چھ گلاس ٹھنڈا پانی نوش کریں۔ یہ پانی نظام استحالہ متحرک کر کے پچاس ساٹھ حرارے جلا ڈالتا ہے۔ گویا یہ مفت کا موٹاپا مکاؤ نسخہ ہے۔

تیرہویں عادت: بوفے سے پرہیز کیجیے

آج کل ہوٹلوں، ریستورانوں، شادی ہالوں حتیٰ کہ نجی دعوتوں میں بوفے عام ہو چکا۔ کھانے کا یہ طریق کار بھی انسان کو فربہ بناتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مرغ مسلم ہر کسی کی دسترس میں ہوتا ہے۔ لہٰذا چٹورے کھل کر ہاتھ صاف کرتے ہیں اور یہی آزادروی انھیں فربہ بنا کر بیماریوں کی آغوش میں لے جاتی ہے۔ لہٰذا کسی بوفے میں جائیے تو ہاتھ ہولا رکھیے اور پیٹ کی گنجائش کے مطابق ہی کھائیے۔

کئی لوگ چند لقموں میں پوری روٹی کھا جاتے ہیں۔ یہ بھی موٹاپے کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جاپانی ماہرین طب نے ایک تجربے کے ذریعے دریافت کیا ہے کہ جو مرد و زن بڑے لقموں میں کھانا کھائیں وہ اکثر 52 فیصد زیادہ غذا کھاتے ہیں۔ جب کہ چھوٹے لقمے لینے اور آہستہ کھانے والے کم کھانا کھاتے ہیں۔

چودھویں عادت: دوران طعام بڑے لقمے لینا

چھوٹے لقموں کا فائدہ یہ ہے کہ غذا ٹکڑوں میں

بٹ جاتی ہے۔ جب کہ آہستہ کھانے سے انسان غذا سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے نیز سیر بھی جلد ہوجاتا ہے۔ یہ سنہرا اصول یاد رکھیے..... نقمے جتنے چھوٹے ہوں گے، آپ کی کمر بھی اتنی ہی پتلی ہوگی۔

پندرہویں عادت: بڑی پلیٹوں میں کھانا نہ کھائیے

برطانیہ میں ایک تحقیق سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ ایک دعوت میں 99 فیصد موٹے مرد و زن بڑی پلیٹوں کی طرف لپکتے ہیں۔ معنی یہ کہ زیادہ کھانا، زیادہ حرارے اور زیادہ موٹاپا! لہٰذا آپ دبلے ہونے کے خواہش مند ہیں تو دعوت میں چھوٹی پلیٹ کا انتخاب کیجیے۔ سیری نہ ہو تو آپ مزید سالن ڈال سکتے ہیں۔

سولہویں عادت: فربہ دوست نہ بنائیے

ایک کہاوت ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ فربہی کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ جرمن محققوں نے بذریعہ تحقیق جانا ہے کہ جب آپ کا دوست فربہ ہو جائے تو یہ 57 فیصد امکان ہوتا ہے کہ آپ بھی موٹے ہو جائیں۔ وجہ یہ ہے کہ فربہ دوستوں کی معیت میں اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے انسان نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا وزن بڑھالیتا ہے۔

سترہویں عادت: دیر سے طعام کرنا

جب ہم سو رہے ہوں تب بھی ہمارا جسم چربی جلانے کا عمل جاری رکھتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پیٹ نہ بھرا ہو۔ ورنہ پھر بدن اسے ہضم کرنے میں مصروف رہتا ہے۔

امریکی ماہرین طب نے 50 مرد و زن کی عادات کا دو ہفتے تک جائزہ لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ کس وقت سوتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ اس تحقیق سے پتا چلا کہ جو لوگ نو بجے کے بعد کھانا کھائیں وہ زیادہ کھاتے اور یوں فربہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا رات نو بجے سے پہلے طعام کرنا معمول بنالیجیے۔

اٹھارہویں عادت: بازاری شربتوں سے دور رہیے

آج کل بیشتر ہوٹلوں میں پھلوں کے رس کے نام پر ایسے مشروب ملتے ہیں جو کارن سیرپ اور گاڑھا کرنے والی اضافیوں (Thickening Agents) سے بنتے ہیں۔ یہ سراسر فربہی کے ہرکارے ہیں۔ چنانچہ انھیں نوش جاں نہ کریں تو بہتر ہے۔

انیسویں عادت: وزن ناپنے کا پیمانہ استعمال کیجیے

کئی فربہ لوگ وزن ناپنے کا پیمانہ لے تو آتے ہیں مگر اسے استعمال نہیں کرتے۔ اب لندن یونیورسٹی کے ماہرین نے تجربے سے جانا ہے کہ جو روزانہ پیمانے پر اپنا وزن کریں، انھیں پھر فربہی کم کرنے کی تحریک ملتی ہے۔ لہٰذا فربہ مرد و زن باقاعدگی سے اپنا وزن چیک کریں، یوں اسمارٹ ہونے میں مدد ملے گی۔

بیسویں عادت: ہیجان میں کھانا نہ کھائیے

بہت سے مرد و زن زیادہ کھانا کھا کر غم، غصے یا ذہنی دباؤ سے چھٹکارا پانے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ طریق کار بھی فربہی کو دعوت دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں انسان بغیر سوچے سمجھے زیادہ غذا کھا جاتا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ غم و غصے کی حالت میں اگر کھانے کی تمنا جنم لے تو چیونگم کھا لیجیے، پانی کا گلاس پی لیجیے یا چہل قدمی کیجیے۔ غرض ہیجانی کیفیت میں کھانا کھا کر غم و غصہ دور کرنے کی کوشش نہ کریں ورنہ آپ خود کو حراروں سے بھرلیں گے۔

■■■

طبّی ٹوٹکے

بیماریوں سے بچانے والے

جنید اکرم

آپ کی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ناشتہ کس قدر ضروری ہے

ہمیں محسوس نہیں ہوتا، لیکن عام زندگی میں بعض کام ہمارے جسم اور صحت پر براہ راست اثرانداز ہوتے ہیں۔ ذیل میں ایسی ہی سات سرگرمیاں پیش ہیں جنہیں انجام دینے یا نہ دینے سے ہم کئی خوفناک بیماریوں مثلاً ذیابیطس، امراض قلب، موٹاپے وغیرہ سے بچ سکتے ہیں۔

1۔ جب ہم ناشتہ نہ کریں.....تو کیا ہوتا ہے؟

انسان جب طویل آرام کے بعد صبح بیدار ہو، تو اُسے کھانا کھائے دس بارہ گھنٹے بیت چکے ہوتے ہیں۔ گویا تب بدن کو ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص بات یہ کہ اس وقت خون میں گلوکوز کی مقدار بھی کم ہوچکی ہوتی ہے۔

چناں چہ انسان ناشتہ کیے بغیر کام پہ لگ جائے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنی پوری توانائی سے محروم ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے دماغ

کو موثر طور پر کام کرنے کے لیے شکر خون (بلڈ شوگر) کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ناشتہ نہ کرنے والے مرد و زن دوران کار سر درد، اعصابی تناؤ، متلی، شکم درد محسوس کرتے ہیں۔ بعض اوقات ذہنی قوت بھی کم ہو جاتی ہے۔ ماہرین تحقیق سے دریافت کر چکے کہ اسکول جانے والے جو بچے ناشتہ کریں ان کی یادداشت تیز ہوتی ہے۔ نیز وہ ناشتہ نہ کرنے والے بچوں سے بہتر کارکردگی دکھاتے ہیں۔

ممتاز امریکی معالج، ڈاکٹر سوما ڈریلی کہتی ہے ''ناشتہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ سارا دن انسان کی بھوک کنٹرول میں رکھتا ہے''۔ ایک اور بات یہ ہے کہ جو مرد و زن ناشتہ نہ کریں، وہ پھر دوپہر یا رات کو زائد کھانا کھا کر حراروں کی کمی پوری کرتے ہیں۔ نیز اس دوران عموماً وہ سچوریٹڈ چکنائی والی اشیا کھاتے ہیں..... وہ چکنائی جو ہمارے قلب کی شریانوں میں جم جاتی ہے۔

ناشتہ نہ کرنے والے اس عادتِ بد میں بھی مبتلا رہتے ہیں کہ کھانوں کے درمیان الم غلم (Junk) غذائیں کھاتے پھریں۔ امریکا میں بذریعہ تحقیق معالجوں نے یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ جو فربہ خواتین زیادہ کاربوہائیڈریٹ اور پروٹین سے بھرپور بھاری ناشتہ کریں، ڈائٹنگ کے دوران ان کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ جبکہ ناشتہ نہ کرنے والی موٹی خواتین اس کامیابی سے محروم رہتی ہیں۔ لہٰذا مناسب ناشتہ کر کے وزن کم کیجیے، یوں آپ کے خون میں شکر کی سطح بھی معمول پر رہے گی۔

نکتے کی بات

75 فیصد سے زیادہ جو مرد و زن ناشتہ کریں، وہ اپنا وزن کم کر لیتے ہیں۔ سونے پہ سہاگا اگر صبح آپ ناشتے سے لطف اندوز ہوں، تو آپ انسولین مزاحمت (Resistance) سے بھی بچ سکیں گے۔ اسی خلل کے باعث انسان ذیابیطس قسم دو کا نشانہ بنتا ہے۔

2۔ جب ہم چاکلیٹ کھائیں۔۔۔تو کیا ہوتا ہے؟

بازار میں دستیاب تمام میٹھی اشیا میں چینی موجود ہوتی ہے۔ اسی لیے جب ہم ٹافی، گولی، آئس کریم، کیک وغیرہ کھائیں، جن میں کہ چینی بہت ہوتی ہے، تو ہمارے خون میں شکر کی سطح (کبھی کبھی خطرناک حد تک) بڑھ جاتی ہے۔ تاہم چاکلیٹ کے ذریعے یہ اثر جنم نہیں لیتا۔

وجہ یہ ہے کہ چاکلیٹ میں چکنائی (Fat) بھی خاصی ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ چاکلیٹ کے ہضم ہونے کا عمل سست کر ڈالتی ہے۔ چناں چہ چاکلیٹ کھانے سے ہمارے خون میں شکر بڑھتی تو ہے، لیکن اتنی زیادہ مقدار میں نہیں جو سادہ کاربوہائیڈریٹ مثلاً ٹافی، گولی، سفید ڈبل روٹی، پاستا یا آلو کھانے سے جنم لیتی ہے۔

چاکلیٹ دیگر منفی عوامل بھی رکھتا ہے۔ مثلاً دودھ والے (ملک چاکلیٹ) میں قلبی شریانیں بند کرنے والی اچھی خاصی سچوریٹڈ چکنائی موجود

ہوتی ہے۔ اور یہی مِلک چاکلیٹ بازار میں دستیاب ہے۔

یہ بھی درست کہ چاکلیٹ سٹیرک (Searic) تیزاب نامی چکنائی بھی رکھتا ہے جو ہمارے کولیسٹرول میں اضافہ نہیں کرتا۔ لیکن بہت زیادہ چکنائی کھانے کا مطلب ہے بہت زیادہ حرارے کھانا۔ لہٰذا اگر آپ نے باقاعدگی سے مِلک چاکلیٹ کھایا تو فربہ رہنے کے لیے تیار رہیے۔ البتہ گہری رنگت والا (Dark) چاکلیٹ اس لحاظ سے بہتر ہے کہ وہ بلند فشارِ خون (بلڈ پریشر) اور کرنے والے ضد تکسیدی مادے رکھتا ہے۔

نکتے کی بات

چاکلیٹ یقیناً بچوں بڑوں کی من پسند غذائی شے ہے، لیکن اسے کھانا عادت نہ بنائیے۔ بس ہفتے میں ایک دو بار کھائیے۔ دوسری صورت میں وزن بڑھنا آپ کا مقدر بن جائے گا۔

3۔ جب ہم سیب کھالیں۔۔۔تو کیا ہوتا ہے؟

رس بھرے سیب کی ہر قاش اہم غذائیت (Nutrient) اور دیگر غذائی مرکبات رکھتی ہے۔ یہ رسیلا پھل ہمارے نظام استحالہ (Metabolism) کو تقویت پہنچاتا، بھوک دباتا اور قلب کی نشوونما کرتا ہے۔

سیب کے غذائی اجزا میں ریشہ (فائبر) سب سے اہم ہے، خصوصاً حل پذیر ریشہ۔ یاد رہے، ہر قسم کا خلوی مادہ ہماری صحت کے لیے مفید ہے، لیکن حل پذیر ریشہ ایک منفرد خاصیت رکھتا ہے، یہ کہ وہ خون میں شکر کی سطح کنٹرول کرتا ہے۔

جیسے ہی حل پذیر ریشہ ہماری آنتوں میں پہنچے، وہ ہر قسم کے تیزاب و جراثیم متحرک کر دیتا ہے۔ اسی سرگرمی کے باعث نظام انہضام سست پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیب میں موجود شکر ہمارے بدن میں آہستہ آہستہ جذب ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ بے شک دو سیب کھا جائیں، ہمارے خون میں شکر کی سطح معمول پر رہتی ہے۔

سیب ایک ضد تکسیدی (Antioxidant) مادہ، کوئرسٹین (Quercetin) بھی رکھتا ہے۔ یہ بڑا صحت بخش مادہ ہے (جو سبز چائے اور پیاز میں بھی ملتا ہے۔) یہ ہمیں دمے، امراض قلب اور شاید بعض اقسام کے سرطان سے محفوظ رکھتا ہے۔

نکتے کی بات

تحقیق و تجربات کے ماہرین کو علم ہوا ہے کہ سیب کھانے والے ذیابیطس اور دل کی بیماریوں سے بچے رہتے ہیں۔ نیز یہ پھل انسان کو فربہ ہونے سے بھی بچاتا ہے۔

۴۔ اگر میں بیٹھے ہوئے دن گزار دوں۔۔تو کیا ہوتا ہے؟

کئی لوگ دن کا بیشتر حصہ بیٹھے ہوئے گزارتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اس میں کوئی برائی نہیں۔

BAHOO GRAFIX

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں جب گلوکوز بھی ہمارے خون میں آرام کرنے لگے، تو ہمارا جسم کئی خرابیوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔

جب ہم چلیں پھریں یا کوئی کام کریں، تو ہمارے عضلات گلوکوز جذب کر کے توانائی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن جس دن ہم زیادہ بیٹھے رہیں اور حرکت نہ کریں، تو گلوکوز زیر استعمال نہیں آتی۔ اور جب انسان بیٹھے رہنے کو معمول بنالے تو دو اہم جسمانی مسئلے جنم لیتے ہیں۔

اول یہ کہ ہمارا جسم بعض غیر استعمال شدہ گلوکوز کو چربی (یا چکنائی) میں بدل دیتا ہے۔ دوم گلوکوز خون میں طویل عرصہ آرام دہ حالت میں رہے، تو ہمارے بدن میں خاص قسم کے مرکب مادے ''اے جی ایز'' (AGEs) کی مقدار خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے۔ یہ مادہ ہمارے اعصاب اور خون کے خلیوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے خون میں شکر کی سطح مسلسل بلند رہے، تو گردوں کی بیماری جنم لیتی ہے۔ نسیں خراب ہوتی اور اندھا پن چمٹ جاتا ہے۔ ذیابیطس تو اس کی خاص مصنوعہ گنی جاتی ہے۔

چناں چہ طویل عرصہ بیٹھ کر نہ گزارئیے، حرکت میں رہیے اور کام کیجیے۔ ورنہ آپ درج بالا جسمانی خرابیوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یاد رہے، ورزش چربی گھلانے والی سکہ بند سرگرمی ہے۔ اور تحقیق بتاتی ہے کہ جسمانی سرگرمی سے اے جی ایز کی سطح بھی معمول پر آتی ہے۔ لہٰذا معمولات زندگی میں ورزش کو ضرور داخل رکھیے۔

نکتے کی بات

دن کا بیشتر عرصہ بیٹھے رہنے سے خون میں شکر بھی بے حرکت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ حالت پھر کئی جسمانی خرابیاں پیدا کرتی ہے۔

5۔ جب میں غصے میں سارا دن بسر کروں۔۔۔تو کیا ہوتا ہے؟

انسان گاہے بہ گاہے غصے میں آئے تو اس میں کوئی ہرج نہیں..... یہ ایک قدرتی جذبہ ہے جو کبھی نہ کبھی ہر کسی کو آ دبوچتا ہے۔ لیکن مسلسل غصے میں رہنا دوسری بات ہے..... یوں انسانی صحت متاثر ہوتی ہے۔

غصہ دو دھاری تلوار ہے۔ کیونکہ جذباتی طور پر یہ انسان کا موڈ تباہ کرتا اور دوسروں کو اس سے دور کرتا ہے۔ جبکہ جسمانی لحاظ سے غصہ ور انسان موٹاپے اور ذیابیطس کا نشانہ بن سکتا ہے۔

غصہ دراصل ایک قسم کا ''جذباتی دباؤ'' (Emotional Stress) ہے۔ اس کے جنم لینے سے ہمارے بدن میں ایڈرینلین اور دباؤ سے وابستہ دیگر ہارمون پیدا ہوتے ہیں۔ ان دباؤ والے ہارمونوں کا ایک اثر یہ ہے کہ وہ ہمارے خون میں شکر کی سطح بڑھاتے ہیں۔ نیز جذباتی دباؤ ہم میں بری عادات مثلاً الم غلم چیزیں کھانا بھی جنم دیتا ہے۔

انسان دن بھر جلتا کڑھتا اور پیچ و تاب کھاتا رہے، تو یہ کیفیت اس کے دل پر بھی منفی اثر ڈالتی ہے۔ امریکی ییل یونیورسٹی کی تازہ تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ جو لوگ غصہ پالنے کے شوقین ہیں، ان میں ایک کیمیائی مادہ، اینڈوتھیلین

(Endothelin) بکثرت ملتا ہے۔

اینڈوتھیلین کی زیادتی ہی سے دل کی شریانوں میں چربی، کولیسٹرول اور دیگر غذائی مواد جمع ہو کر تھکے بناتا ہے۔ چناں چہ اس کیمیائی مادے کے باعث حملہ قلب ہونے کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے۔

جدید تحقیق نے ایک اور خطرناک انکشاف بھی کیا ہے۔ یہ کہ کوئی انسان مسلسل شدید غصے میں رہے، تو اس میں دھڑکن قلب کی بے قاعدگی (Arrhythmia) کا خلل جنم لیتا ہے۔ یہ خلل بے قابو ہو جائے تو پھر آپ کا دل دھک دھک کرنا چھوڑ سکتا ہے..... ہمیشہ کے لیے!

نکتے کی بات

یاد رکھیے، دن بھر غصے میں رہنا زہر ہے۔ لہٰذا اگر آپ اپنا خون ابلتا پائیں، تو جلد اُسے سرد کرنے کی راہ ڈھونڈیے۔ مثلاً اپنا غم و غصہ ڈائری میں لکھ ڈالیے۔ کسی دوست یا ہم راز کو قصہ درد سنائیے۔ یا پھر باہر جائیے اور بلند آواز میں چیخیے۔۔۔ غرض ایسا ہر قدم اٹھائیے جو آپ کا غصہ دور کر سکے۔

6۔ میں سارا دن خوش رہوں۔۔۔تو کیا ہوتا ہے؟

جب انسان خوش ہو، اطمینان و سکون محسوس کرے تو اس میں قوت ارتکاز بڑھ جاتی ہے۔ وہ پھر اپنے آپ پہ زیادہ توجہ دیتا ہے۔ چونکہ انسان اپنی دنیا میں امن و امان سے ہوتا ہے، لہٰذا اس کے

مظلوموں کی ہڈیاں

کئی سو برس پہلے سندھ سمّہ خاندان کا ایک بادشاہ تھا، اس بادشاہ کا نام تھا جام خیرالدین، یہ بہت ہی نیک اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔

ایک دن جام خیرالدین اپنے امیروں اور مصاحبوں کے ساتھ شکار کے لئے نکلا۔ ایک جگہ اُس نے دیکھا کہ آدمیوں کی بہت سی ہڈیاں پڑی ہوئی ہیں۔ جام خیرالدین وہیں اپنی سواری کو روک کر کھڑا ہو گیا اور بہت دیر تک ان ہڈیوں کو دیکھتا رہا، پھر اُس نے اپنے امیروں اور مصاحبوں سے کہا تم جانتے ہو کہ یہ ہڈیاں مجھ سے کیا باتیں کر رہی تھیں؟ بادشاہ کا یہ سوال سُن کر سب چُپ ہو گئے۔ بادشاہ نے اُن کو خاموش دیکھ کر کہا یہ مظلوم انسانوں کی ہڈیاں ہیں جو مجھ سے انصاف کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ پھر اُس نے فوراً ہی حکم دیا کہ قریب کے گاؤں کے کسی بوڑھے آدمی کو بلا کر لایا جائے، چنانچہ اسی وقت لوگ ایک بوڑھے آدمی کو لے کر آئے، بادشاہ نے اُس کو وہ ہڈیاں دکھا کر پوچھا تم بتا سکتے ہو کہ یہ کون لوگ تھے، اور کس طرح مارے گئے؟

بوڑھے نے کہا حضور! اب سے کوئی سات سال پہلے کی بات ہے کہ گجرات کا ایک قافلہ ادھر سے گزرا، اور فلاں ڈاکوؤں کی ٹولی نے اس قافلے کے لوگوں کو مار کر اُن کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ یہ اُنھیں مظلوموں کی ہڈیاں ہیں اور آج بھی ان لوگوں کا مال ان ڈاکوؤں کے پاس موجود ہے۔ بادشاہ نے یہ سُنا تو بے چین ہو گیا۔ اور حکم دیا اُن ڈاکوؤں کو اسی وقت پکڑ کر لایا جائے، اور ان سے وہ مال و اسباب بھی حاصل کیا جائے جو اُن مظلوموں کا اُن کے پاس موجود ہے۔ سب ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس لایا گیا۔ بادشاہ نے اُن سب کو قتل کرا دیا اور وہ مال جو اُن کے پاس سے ملا تھا گجرات کے بادشاہ کے پاس اس غرض سے بھجوا دیا تا کہ اُن مظلوموں کے جو وارث موجود ہوں اُن میں یہ مال تقسیم کر دیا جائے۔

انتخاب: مولانا اعجاز الحق قدوسی (ماخوذ: از معصومی)

بدن میں ذہنی دباؤ سے وابستہ ہارمون جنم نہیں لیتے۔ یوں ان کی عدم موجودگی میں خون کی شکر قابو میں رہتی ہے، بلند فشارِ خون پیدا نہیں ہوتا اور دل کی دھڑکن معمول پر رہتی ہے۔

جدید تحقیق بتاتی ہے کہ خوش باش رہنے والے مرد و زن چھوت کی بیماریوں اور دیگر امراض سے محفوظ رہتے ہیں۔ امریکی کارنیج میلن یونیورسٹی میں محققوں نے دس مرد اور خواتین کو دانستہ مختلف جراثیم اور وائرس کا شکار بنایا۔ بعد ازاں اُن مرد و زن کے جسمانی معائنے سے انکشاف ہوا کہ جو خوش باش اور اچھے موڈ میں تھے، ان کے جسم میں بیماریوں کا مقابلہ کرنے والے خاص پروٹین ''سائٹوکائنز'' زیادہ مقدار میں پیدا ہوئے۔ یہ پروٹین ہمارا نظام مامون پیدا کرتا ہے۔

دیگر تجربات سے بھی واضح ہوا کہ جذبات ہمارے رویے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً ان سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مثبت طرزِ فکر رکھیں اور امید پرست رہیں، وہ صحت بخش کھانے کھاتے اور ورزش کرتے ہیں۔ ان کے خون میں شکر کی سطح بھی کم ہوتی ہے۔ غرض وہ ناامیدی اور منفی طرزِ فکر کا شکار لوگوں کی نسبت بہتر زندگی گزارتے ہیں۔

7۔ اگر میں رات کو پانچ گھنٹے نیند لوں۔۔۔ تو کیا ہوتا ہے۔

انسان جب بھی معمول سے کم نیند لے تو اس کا جسمانی نظام تلپٹ ہو جاتا ہے۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ نیند کی کمی سے ہمارے بدن میں بھوک کنٹرول کرنے والا ہارمون، لیپٹن کم جنم لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو مرد و زن کم سوئیں، وہ عموماً زیادہ کھانا کھانے لگتے اور فربہ ہو جاتے ہیں۔

نیند کی عدم موجودگی سے بدن میں دباؤ Stress پیدا کرنے والے ہارمونوں کی افزائش بھی بڑھتی ہے۔ اسی باعث ہمارا بدن خون میں زاہد گلوکوز پھینکنے لگتا ہے (تاکہ دباؤ کم ہو سکے)۔ لہٰذا بہت کم نیند سے جسم میں انسولین کا نظام بھی گڑبڑا جاتا ہے۔

دل تھام کے رکھیے، ابھی تو آغاز ہے۔ محققوں نے انکشاف کیا ہے کہ انسان کم سونا معمول بنالے، تو ہمارا مدافعتی (Immune) نظام ایسے مخصوص کیمیائی مادے بنانا چھوڑ دیتا ہے جو جراثیم مارتے ہیں۔ یہی وجہ ہے، پچھلے سال ایک تحقیق سے دریافت ہوا، جو خواتین و حضرات سات گھنٹے سے کم نیند لیں، وہ دوسروں کی نسبت عام بیماریوں مثلاً بخار، کھانسی، نزلہ وغیرہ میں زیادہ گرفتار ہوتے ہیں۔

نیند کی کمی کے دیگر نقصانات بھی ہیں۔ مثلاً جب الارم انسان کو جگائے، تو بے دلی سے دن کا آغاز کرتا ہے۔ پھر جوں جوں وقت گزرے، انسان پہ سستی اور غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ پھر کوئی کام دھیان سے نہیں کرتا۔ دوسری طرف جو مرد و زن پوری نیند لیں، رات کو بھرپور آرام کریں وہ نئی معلومات تیزی سے اخذ کرتے اور بہترین طور پر کام انجام دیتے ہیں۔

نکتے کی بات

یہ درست ہے کہ کچھ لوگ تھوڑی سی نیند لے کر بھی چوکس چوبند ہو جاتے ہیں، مگر بیشتر لوگوں کو سات آٹھ گھنٹے نیند کی ضرورت ہوتی ہے۔ ■■■

تحقیق و جستجو

ماں کے بدن میں بچے کے زندہ خلیے

ماں بیٹے کے روحانی رشتے کا ذکر جسے سائنس نے اب اور بھی مضبوطی سے ہم کنار کر دیا ہے۔

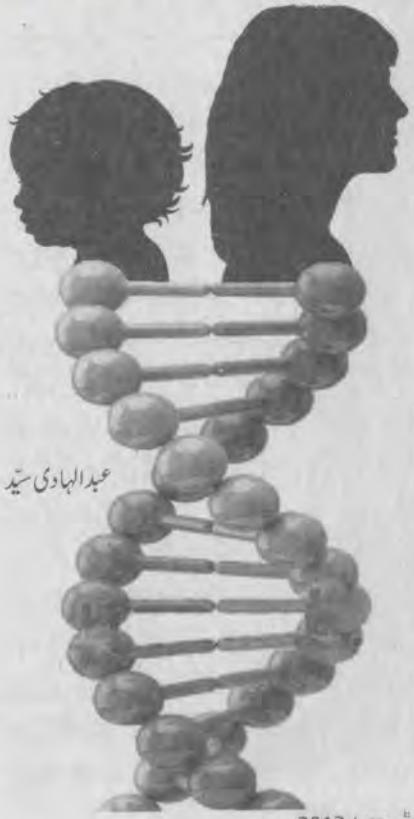

عبدالہادی سیّد

ایک اردو مثل ہے: ''باپ پر پُوت، پتا پر گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔'' اس مثل کے معنی ہیں کہ اولاد شکل و صورت اور عادات میں اپنے والدین سے ملتی جلتی ہے۔ اب جدید سائنس نے بھی اس برسوں پرانی مثل کو درست قرار دے ڈالا۔

امریکی سائنس دانوں نے ماؤں کے دماغ میں بچوں کے زندہ خلیے دریافت کیے ہیں۔ یوں ماں اور بچے کا روایتی رشتہ مزید مستحکم ہو گیا۔ ہمارے دین کی رو سے روحانی طور پر یہ رشتہ بہت گہرا ہے۔ اب سائنس نے اُسے جسمانی لحاظ سے بھی بہت مضبوط کر دیا۔

ماں اور بچے کے مابین روحانی و جسمانی رشتے کا آغاز زمانۂ حمل سے ہوتا ہے۔ تب بڑھتے بچے (جنین) کے لیے ماں ہی سب کچھ ہوتی ہے وہ اُسے غذائیت فراہم کرتی ہے اور غذائیت بھی! جبکہ ماں کے دل کی دھڑکن بچے کو مسلسل لوری جیسی کیفیت عطا کرتی اور اُسے پُرسکون رکھتی ہے۔

ایک نالی، آنول (Placenta) ماں اور بچے کے مابین جسمانی تعلق قائم رکھتی ہے۔ یہ نالی ماں اور بچے، دونوں کے خلیے مل جل کر جنم دیتے ہیں۔ اسی نالی کے ذریعے ماں سے غذا بچے کو منتقل ہوتی ہے جبکہ بچہ اپنا فضلہ اور گیس باہر خارج کرتا ہے۔

آنول کے ذریعے ہی ماں اور بچے کے خلیے ایک دوسرے کے اعضا کی سمت ہجرت کرتے ہیں۔ عموماً جگر، غدہ درقہ، پھیپھڑے، دل، گردے اور جلد ان ہجرتی خلیوں کا مسکن بنتی ہے۔ ماہرین نے بذریعہ تحقیق دریافت کیا ہے کہ یہ ہجرت

خواہ مخواہ نہیں ہوتی۔۔۔ ہجرتی خلیے ضرورت پڑنے پہ میزبان کی بافتوں (Tissues) کی مرمت کرتے اور اُسے کینسر جیسے موذی امراض سے بچاتے ہیں۔

سائنس دانوں سے لے کر عام آدمیوں تک، سبھی کو یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ ایک فرد کے خلیے بڑی آسانی سے دوسرے فرد کے اعضا کے خلیوں سے جا ملتے ہیں۔ عام خیال یہی ہے کہ ایک انسان اپنے مخصوص اور انفرادی خلیوں سے وجود میں آتا ہے۔ لیکن درج بالا تحقیق نے یہ نظریہ باطل قرار دے ڈالا۔ کیونکہ اس نے ثابت کر دیا کہ تمام انسان اپنے بدن میں خصوصاً ماؤں کے خلیے رکھتے ہیں۔

زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ انسانی جسم میں اہم ترین عضو دماغ میں دوسرے لوگوں کے خلیے پائے گئے۔ تحقیق نے انکشاف کیا کہ عورتوں کے دماغ میں مردانہ خلیے پائے گئے۔ جبکہ مردوں کے دماغوں میں زنانہ خلیے دریافت ہوئے۔ اب ماہرین تحقیق کر رہے ہیں کہ انسانوں میں خلیوں کی ہجرت کس قسم کے اثرات مرتب کرتی ہے۔ بذریعہ تحقیق ایک چشم کشا انکشاف ضرور ہوا۔۔۔ ہجرتی خلیے ان خواتین کے دماغ میں کم پائے گئے جو الزائمر کی مریض تھیں۔ گویا ان خلیوں کا دماغ کی تندرستی سے تعلق ہے۔

ہم سبھی خود کو اچھوتا سمجھتے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال بہرحال کافی عجیب ہے کہ آپ کے جسم میں والدین حتیٰ کہ پُرکھوں کے خلیے موجود ہوں۔ مزید حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہجرتی خلیے دماغ جیسے پیچیدہ عضو میں بھی ملتے ہیں۔ تاہم زندگی میں خلیوں کا ملنا جلنا غیر معمولی بات نہیں۔ یہ عمل سائنسی اصطلاح میں ''کیمرازم'' (Chimerism) کہلاتا ہے۔ دیگر حیوانیات مثلاً پھپھوندی اور مونگے کی چٹانوں (Corals) میں عموماً یہ عمل انجام پاتا ہے۔

جب ایک نامیے (Organism) میں جینیاتی طور پر مختلف خلیے موجود ہوں تو یہ کیمرازم کہلاتا ہے۔ انسانوں میں اس عمل کا مشاہدہ پچاس برس قبل ہوا جب حمل کے بعد حاملہ کے خون میں وائی لومیے (Y Chromosome) دیکھے گئے۔ چونکہ یہ خلیے جینیاتی طور پر مردانہ ہوتے ہیں، لہٰذا زنانہ جسم میں جنم نہیں لے سکتے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ دراصل نر بچوں سے ماؤں میں منتقل ہوئے۔

اب ماہرین جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ بچے کے خلیے ماں کے جسم میں کیا عمل کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک منفرد نظریہ سامنے آیا۔ بچے کے خلیے بنیادی (stem) خلیوں کے طرح ہوتے ہیں۔۔۔ یعنی ان سے مختلف اقسام کے عضو اور بافتیں بن سکتی ہیں۔ نیز یہی خلیے بافتوں کی مرمت بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ جب ماں میں کوئی عضو مثلاً دل، گردے یا دماغ میں کوئی خلل آئے، تو بچے کے خلیے ہی متاثرہ عضو کی مرمت کرتے ہیں۔

اگر تحقیق اور تجربات سے درج بالا نظریہ درست نکلا تو یہ ایک عظیم دریافت ہوگی۔ یوں ماں اور بچے کے مابین موجود لازوال رشتہ مزید مضبوط ہو جائے گا۔ اس سے یہ بھی انکشاف ہوگا کہ انسانوں کے مابین روابط کتنے مضبوط ہیں۔

■■■

طنز و مزاح

بے تاب کی بے تابیاں

خوفناک اور عبرتناک کہانیاں لکھنے والے ایک خوفزدہ مصنف کا ماجرا، اس کی بیوی کا کہنا تھا

''اگر محافظ کو ہی محافظ کی ضرورت پڑ جائے تو بہتر ہے انسان محافظ کے محافظ کو ہی اپنا محافظ بنالے''

اعتبار ساجد

ستّر سے زائد خوفناک اور عبرت آموز کہانیوں کے مصنّف فضل الٰہی بتاب اچھے بھلے اپنی روش پر گامزن تھے کہ کسی حاسد نے طعنہ دے دیا کہ آپ انسانوں کی کہانیاں لکھ نہیں سکتے اس لیے جنوں بھوتوں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ یہ طعنہ کیا تھا تازیانہ تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ انسانوں کی کہانیاں لکھنے لگے۔ شروع شروع میں لوگ یہی سمجھے کہ منشی صاحب جنوں بھوتوں کی نئی اقسام سے متعارف کروا رہے ہیں۔ بعد میں جب لوگوں کی سمجھ میں اصل معاملہ آیا تو احتجاج شروع ہوگیا۔ سب سے بڑا اعتراض یہ ہوا کہ منشی صاحب انسانوں کو مسخ کر کے پیش کر رہے ہیں۔ یہ جنوں بھوتوں کے مسائل ہیں جنہیں وہ آدمیوں کے سر منڈھ رہے ہیں۔ ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ وہ عشقیہ مناظر بھی ڈراؤنا بنا کر پیش کرتے ہیں اور ہمیشہ ہیرو ہیروئن کی ملاقات قبرستان میں کرواتے ہیں۔

''آدھی رات کا وقت۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ہُو کا سماں۔ سناٹے کی راجدھانی۔ کہیں اُلو بول رہا ہے۔ کہیں گیدڑ آہیں بھر رہے ہیں۔ قبرستان میں اکھڑی ہوئی قبریں۔ سرسراتے ہوئے سائے۔ کھڑکھڑاتے ہوئے پتے۔ شرجیل انشا غضیل نے گھڑی دیکھی۔ رات کے پونے بارہ بجے تھے۔ مگر دُور دُور تک بھاگ بھری عُرف مہ پارہ کی آمد کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اچانک ایک قبر ٹوٹ کر گری۔ گیدڑ چیخے۔ اُلو بولا۔ پتے کھڑکھڑائے۔ سائے لہرائے۔ اور پھر یکلخت سناٹا چھا گیا۔''

جب ان کی کہانیوں میں سائے کچھ زیادہ سرسرانے اور پتے کچھ زیادہ کھڑکھڑانے لگے تو لوگوں نے حضرت جگر سوز مراد آبادی کو

جا پکڑا کہ آپ دونوں مل کر معاشرے کو خوفزدہ کر رہے ہیں تقریباً آدھی آبادی اختلاج قلب میں مبتلا ہوگئی ہے۔ باز آجائیے۔ ورنہ انجام بُرا ہوگا۔

حضرتِ اوّل یعنی جگر سوز مراد آبادی تو فوراً تائب ہوگئے۔ حضرتِ دوم یعنی منشی فضل الٰہی بیتاب باز نہیں آئے۔ ادب کی خدمت جاری رکھی۔ آخر لوگوں نے ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا یعنی ان کی کہانیاں پڑھنی چھوڑ دیں۔ اس معاشی حملے نے مصنف کو چاروں خانے چت کر دیا۔ چپ چاپ کان لپیٹ کے شاعری کرنے لگے۔ شروع میں مہتاب تخلص رکھا۔ لوگوں نے کہا۔ شرم کیجیے۔ فوراً آئینہ منگوا کر دیکھا۔ مہتاب کی جگہ بیتاب ہوگئے۔ لوگوں نے ان کی شاعری میں نقص نکالنے شروع کیے۔ پہلے تو انہیں زبانی کلامی شرمندہ کیا جاتا رہا پھر ان کے خلاف کالم لکھے جانے لگے۔ جہاں یہ مشاعرہ گاہ میں پہنچے، چار چھ بدخواہ پہنچ گئے۔ یہ شعر عرض کرتے ہیں۔ ادھر سے گیدڑوں کی آواز آتی ہے۔ یہ کہتے ہیں۔ ''حضرات، مصرعہ دیکھیے گا۔'' اُدھر سے آواز آتی ہے۔ ''ہواؤں۔ ہواؤں۔ ہواؤں۔'' بالآخر اس صورتِ حال سے زچ ہوگئے۔ یہی حل سوچا کہ مخالفین کو مخاطب کر کے بانگِ دہل ایسے اشعار پڑھے جائیں جن سے ان کی مٹی پلید ہو۔ یہ عمل گویا جلتی پر تیل ڈالنے کے مترادف تھا۔ لوگ جو پچاس فیصد آپ کے خلاف تھے، سو فیصد ہوگئے۔ پہلے مشاعروں میں ہُوٹ ہوتے تھے۔ پھر اپنے محلے میں ہُوٹ ہونے لگے۔

یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔ اور اس کا فوری سدباب ضروری تھا۔ چنانچہ پہلے تو آپ

احساس کی عدالت

انسان بہت کم اس عدالت میں آتا ہے، کیونکہ اس کے لیے عزم و ہمت چاہیے اور تنہائی کے لمحات چاہئیں۔ یہ وہ عدالت ہے جہاں انسان اپنے ارادوں کا جائزہ لیتا ہے، حقائق کو سمجھتا ہے، ماضی کا احتساب کرتا ہے، حال پر توجہ دیتا ہے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔

یہ عدالت بعض واقعات کے ردِعمل کے طور پر اور بعض اچانک جذباتی کیفیت میں قائم ہو جاتی ہے، اس کے لیے کسی کورٹ کی عمارت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس عدالت کے ذریعے انسان کو سزا یا جزا کے طور پر جو چیز ملتی ہے اسی کا نام ''کامیابی'' ہے۔ یعنی احتساب ایک ایسا عمل ہے جس کے بعد ہر صورت میں انسان کو کامیابی ملتی ہے۔

یہ عدالت روزانہ رات کو سونے سے قبل، بستر پر لیٹنے کے بعد بھی قائم کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے چند لمحات درکار ہیں۔ اس کے بعد ہر آنے والی صبح اپنے ساتھ چوبیس گھنٹے پر مشتمل دن رات لاتی ہے جو آپ کے لیے عمل کی ایک شاہراہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ اس شاہراہ پر اپنے مقاصد اور منزل کو سامنے رکھتے ہوئے سفر کرتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔

انتخاب: محمد عاطف سلیم

(ماخوذ: ''شاہراہ زندگی پر ترقی کا سفر'' مصنف: محمد بشیر جمعہ)

نے محلے کے معتبرین کی شان میں نظمیں لکھیں۔ پھر اصلاحی فلاحی کمیٹی میں جا گھسے۔ چھ سات نظمیں فلاحی کمیٹی کی شان میں عرض کیں۔ پھر ایک اجلاس میں اپنا مسئلہ سب کے سامنے رکھ دیا کہ میں تو سنجیدگی کے ساتھ ملک و قوم اور شعر و ادب کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکے نہیں چھوڑتے۔ عجیب و غریب آوازیں نکال کے چھیڑتے ہیں۔ اس مسئلے پر معتبرین کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ گھر جا کے اپنے اپنے لڑکوں کو ڈانٹا کہ کم بختو! آوازیں نکال کے چھیڑتے ہو۔ شرم نہیں آتی۔ صاف ان کا نام لے کر

کیوں نہیں چھیڑتے۔ لیجیے صاحب۔ اس اذن چھیڑ خانی کا ملنا تھا کہ حضرت بیتاب نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ مشاعرے میں جاتے ہیں تو لڑکے چھیڑتے ہیں گھر سے نکلتے ہیں تو کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے لڑکے نام پکار پکار کے چھیڑتے ہیں۔ بیچارے بیوی بچوں سے الگ شرمندہ کہ یا الٰہی یہ نام بناتے بناتے نام ڈبونے کا سلسلہ کیا چل نکلا۔ بہت پریشان اور آزردہ خاطر ہو کر ایک لمڈھینگ ملازم رکھ لیا۔ اس لٹھ بردار ملازم کو لے کر نکلنے لگے مشاعروں میں بھی وہ ان کا باڈی گارڈ ہوتا۔ ایک آدھ بار لڑکوں نے چھیڑ چھاڑ کی کوشش کی تو لمڈھینگ لٹھ لے کر ان لفنگوں پر پل پڑا۔ دوسروں نے عبرت پکڑی۔ نام لے کر چھیڑنا درکنار، آوازیں نکالنا تک بند کر دیا۔

اس شاندار فتح سے خوش ہو کر حضرت نے ڈنکے کی چوٹ مشاعروں میں جا کر ایسے اشعار پڑھنے شروع کیے جن میں نام بنام اہلِ محلّہ اور ہم عصر شاعروں کے بارے میں خوفناک ترین جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔ لٹھ بردار کی موجودگی میں احتجاج کون کرتا؟ سب حضرات دم سادھ کے بیٹھے رہتے۔ بلکہ بعض تو جبراً وقہراً واہ واہ بھی کرتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے محلے میں اور ادبی دنیا میں آپ کی دھاک بیٹھ گئی جن تنظیموں نے آپ کا بائیکاٹ کر رکھا تھا وہ بھی اپنے مشاعروں میں بطور خاص آپ کو مدعو کرنے لگیں۔ جن انجمنوں نے آپ کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی وہ آپ کو مسندِ صدارت تک پیش کرنے لگیں۔ مضافات کے مشاعروں سے بلاوے آنے لگے۔ آپ اور آپ کے باڈی گارڈ کا کرایہ آمد و رفت دیا جانے لگا۔ قیام و طعام میں خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ الغرض، آپ شہرت کی بلندیوں تک جا پہنچے۔ اگر اچانک ایک واقعہ آپ کی زندگی میں نہ آتا، تو بلاشبہ آپ ہمیشہ شعر و ادب سے وابستہ رہتے اور استادِ فن، نمبرون کہلاتے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز آپ سو کر اٹھے تو دیکھا کہ لمڈھینگ غائب ہے اور بیگم بھی موجود نہیں۔ پورا دن آپ نے انہیں آوازیں دے دے کر گزارا۔ شام کو سسرال گئے۔ معلوم ہوا کہ بیگم صبح سے یہاں براجمان ہیں۔ لیکن آنے کو تیار نہیں۔ وجہ پوچھی تو کہا گیا۔ ''اس شخص کے ساتھ کیا رہنا جو اپنی حفاظت کے لئے دوسروں کا محتاج ہو۔ شوہر تو محافظ ہوتا ہے۔ اگر محافظ کو بھی محافظ کی ضرورت پڑ جائے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ انسان محافظ کے محافظ کو اپنا محافظ بنا لے؟''

آپ نے خاصا زور بیاں دکھایا۔ بڑے بڑے مشکل الفاظ بولے۔ سیکڑوں محاورے اور ضرب الامثال پیش کیں۔ مگر کچھ پیش نہ گئی۔ ناچار گھر لوٹ آئے اور حد درجہ دل برداشتہ ہو کر ایک بار پھر خوفناک، دہشت ناک اور وحشت ناک کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ مگر اب کے ہر کہانی کا مرکزی خیال ایک ہی تھا کہ جن بھوت قابلِ اعتبار نہیں ہوتے کبھی کبھی باڈی گارڈ کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں اور ایسا غچہ دیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک بار پھر آپ نے حضرت جگر سوز مراد آبادی کو مختلف قسم کے جھانسے دے کر تعلقات بحال کر لیے ہیں اور اکثر ان کے کھنڈر نما پریس میں منڈلاتے دکھائی دیتے ہیں!

■■■

پسند اپنی اپنی

حد سے بڑھی انفرادیت اور بدلے ہوئے پسند ناپسند کے ان پیمانوں کا تذکرہ جن کے باعث زندگی آسان ہونے کی بجائے مشکل ہوئی جاتی ہے

پروفیسر محمد فاروق قریشی

ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ ابا جی مقامی پرائیویٹ ہائی اسکول میں استاد تھے، جہاں سے ان کو اتنی تنخواہ ملتی تھی جس میں دس افراد کے کنبے کی مشکل سے گزر بسر ہو سکتی تھی۔ والد صاحب کو کاشتکاری کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ لیکن آبائی زمین جو بھارت میں رہ گئی تھی اس کا کوئی متبادل قطعہ اراضی پاکستان میں ان کو نہیں ملا جس کی وجوہات مجھے معلوم نہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے اس شوق کی تکمیل اس طرح سے کی کہ زرعی اراضی مالکان سے لیز (Lease) یعنی ٹھیکہ پر لے کر کاشت کاری شروع کر دی۔ کاشتکاری کے لیے زمین کبھی کسی مزارعہ کو نصف فصل کے عوض یعنی بٹائی پر دے دیتے تھے۔ یا ملازم رکھ کر ان سے کاشت کرواتے تھے۔ اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فصلوں کی کاشت اور برداشت میں ہمیں ملازموں کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے گنے کی بوائی سے لے کر اس کی کٹائی اور چھلائی اپنے ہاتھوں سے کی۔ گندم کی کٹائی اور کپاس کی چنائی میں بھی حصہ لیا۔ کھیتوں کو پانی لگانے کے لیے ملازموں کے ساتھ ہم بھی جاتے تھے۔ کبھی کبھی ملازم کی چھٹی کے باعث ہمیں یہ آبی فریضہ خود ہی انجام دینا پڑتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ جنوری کی یخ بستہ سردی میں میں کھیتوں کو پانی لگانے گیا تو پیچھے کھال کسی جگہ سے ٹوٹ گیا اور

پانی آنا بند ہو گیا۔ چنانچہ رات کے اندھیرے میں کھال کے ساتھ ساتھ واپس نہر کے موگے کی طرف گیا۔ جو کئی میل کی دوری پر واقع تھا۔ نہر سے تھوڑا پہلے کھال ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور پانی کسی اور کی زمین کے داخلی کھال میں جا رہا تھا۔ میں کھال میں داخل ہو گیا اور کسّی کی مدد سے شگاف کو بند کرنے میں مصروف ہو گیا۔ پانی سرد اور بہاؤ تیز تھا اور میں کم عمر اور ناتجربہ کار۔ جب میں کافی دیر تک واپس نہ پہنچا تو ابا جی کو تشویش ہوئی اور وہ لالٹین ہاتھ میں لیے مجھے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے۔ مجھے جب پانی میں ٹھٹھرتے، شگاف کو بند کرنے کی ناکام جدوجہد میں مصروف دیکھا تو مجھے کام سے روک دیا۔ جلدی سے قریبی بستی سے کاشتکاروں کو جگا کر لائے۔ انھوں نے آ کر شگاف بند کیا۔ ایک الاؤ روشن کیا جہاں ہم نے اپنے ہاتھ پاؤں سینکے۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ پدرانہ شفقت کیا ہوتی ہے۔

کاشتکاری کی وجہ سے چارے کی فراہمی آسان ہو گئی تو گھر میں بھینسیں اور بکریاں بھی آ گئیں۔ لیکن کھیتوں سے چارہ کاٹ کر گھر لانے کی ذمہ داری ہماری مقرر ہو گئی۔ چنانچہ میں اور میرے بھائی اپنے اپنے دور میں تقریباً دو تین میل کے فاصلے سے چارے کے گٹھے سائیکل پر یا سر پر اٹھا کر لاتے اور ٹوکہ مشین پر کترتے۔ بھینسوں کو تالاب پر پانی پلا کے لانا اور ان کو چارہ ونڈا ڈالنا بھی ہماری ذمہ داری تھی۔ ابا جی اور ہماری اس محنت اور ریاضت کا صلہ پروردگار نے یوں دیا کہ ابا جی کو حکومت کی طرف سے غیر مالک کاشتکار کے طور پر قرعہ اندازی میں ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی الاٹ ہو گئی۔ بعد میں ان کو اس کے حقوق ملکیت بھی مل گئے۔ اس لیے ہمارا گھر اجناس اور اشیائے خورد و نوش سے بھرا رہتا تھا۔ گھر کے ایک بڑے کمرے میں گندم، چینی کی بوریاں نیچے سے اوپر تک تہہ در تہہ پڑی رہتی تھیں۔ ایک دوسرے کمرے میں کپاس کا ذخیرہ کیا جاتا تھا جس میں ہر ہفتے کی چنائی کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ رات کو اسی کپاس پر بستر بچھا کر ہم سو بھی جاتے تھے۔ ہم سب بھائی میٹھی چیزیں کھانے کے شوقین تھے۔ ہم چینی کی بوری جو آسانی سے ہماری رسائی میں ہوتی تھی، کے کونے پر سوراخ کر لیتے تھے اور کھانا کھانے کے بعد یا ویسے ہی آتے جاتے ایک مٹھی بھر لیتے تھے۔ یہاں مجھے ایک شرارت یاد آتی ہے جو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کی تھی۔ انہی دنوں میں ہمارے گھر میں یوریا کھاد کی بوریاں لائی گئیں جو اتفاقاً چینی والی بوریوں کے قریب ہی رکھ دی گئیں۔ شام کو میں نے اپنے بھائی کو بتایا کہ چینی کی نئی بوریاں آئی ہیں اس نے پوچھا ''کہاں''؟ میں نے کہا ''آؤ میرے ساتھ۔'' کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ کھاد کی بوری میں ڈال دیا۔ اس نے مٹھی بھر کر منہ میں ڈال لی۔ جب اس نے رونا شروع کیا تو میں گھر سے باہر بھاگ گیا۔ برسوں بعد وہ بھائی میرے گھر آئے، جب ان کے سامنے چائے کا کپ رکھا تو میں نے کہا کہ اس میں چینی ڈال لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے چینی کھانی اس وقت سے چھوڑ دی جب آپ نے مجھے یوریا کھاد

کھلائی تھی۔

ہمارے گھر میں گنے، چھلیاں، دودھ، دہی، مکھن باافراط دستیاب ہوتے تھے۔ ہم یہ چیزیں بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ میری بی جی بہت محنتی اور سگھڑ خاتون تھیں۔ وہ علی الصبح اٹھ کر نماز سے فارغ ہو کر دودھ بلوتیں اور مکھن نکالتی تھیں۔ روزانہ صبح ناشتے میں روٹی، رات کا بچا ہوا سالن، دہی اور لسی ہوتی تھی۔ بی جی بہت نیک دل اور فیاض تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ روزوں کے مہینے میں وہ ہمسائیوں کو صبح لسی کے ساتھ باقاعدگی سے دہی بھی دیا کرتی تھیں۔

موسم سرما میں کھیتوں میں گنے، بیلنے میں پیڑے جاتے تھے اور ان کے رس کو کڑاہے میں ڈال کر گرم کیا جاتا تھا جب شیرہ گاڑھا ہو جاتا تو اسے لوہے کے ڈرموں میں ڈال کر محفوظ کر لیتے تھے۔ پھر اس شیرے کو ایک مشین میں ڈال کر کھانڈ یا چینی بنائی جاتی تھی۔ بعض اوقات تازہ شیرے کو خشک کر کے شکر یا گڑ بھی بنایا جاتا تھا۔ ہمیں کھانے کے لیے یہ سب چیزیں مل جاتی تھیں۔ خصوصاً گنے کا رس تو ہمارا محبوب مشروب تھا۔ اس کو گھر بھی لایا جاتا تھا جہاں اسے کھیر بنانے کے لیے اور گڑ کو میٹھے چاول پکانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ گنے کے رس میں کنو کا رس ملا کر پینا گاؤں والوں کے لیے ایک عیاشی سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ابا جی کو میٹھا بہت پسند تھا۔ کھانے کے بعد ضرور گڑ یا کوئی میٹھی چیز کھاتے تھے۔ سردیوں میں ان کے کوٹ کی جیب میں گڑ ضرور ہوتا تھا۔ کہیں مہمان بن کر بھی جاتے تو ان کے پاس اپنا گڑ ضرور ہوتا تھا۔

غزل

تیرے سلوک پہ حیرت پناہ مانگتی ہے
وہ جھوٹ ہے کہ حقیقت پناہ مانگتی ہے
میں تجھ کو پا کے محبت کے جس مقام پر ہوں
وہ طرب ہے کہ اذیت پناہ مانگتی ہے
عروج آدمِ خاکی کی انتہا دیکھو!
وہ دلکشی ہے کہ عبرت پناہ مانگتی ہے
ہر ایک شخص یہاں اپنے حال میں گم ہے
سکوں ہے ایسا کہ وحشت پناہ مانگتی ہے
وہ قتلِ عام ہوا ہے وفا شعاروں کا
صلیب و دار کی ہیبت پناہ مانگتی ہے
جہاں ضمیر کی سوداگری رواج بنے
وہاں سماج کی غیرت پناہ مانگتی ہے
شکست کھا کے زمانے کی چال سے یارو!
میرے جنون کی شدت پناہ مانگتی ہے

(شاعر: محمد زکریا اعوان۔ چکوال)

کبھی کبھی موسم کے پھل جیسے آم، کنو، امرود، خربوزہ، تربوز، شہتوت اور بیر ہمیں کھانے کے لیے ملتے تھے۔ لیکن جو کچھ بھی ملتا تھا ہم بڑی رغبت سے کھا جاتے تھے اور اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ہمارے گھر میں کسی نے کبھی یہ کہا ہو کہ مجھے فلاں پھل یا فلاں سبزی پسند نہیں، اس لیے میں نہیں کھاؤں گا۔ یہ ایک طرح کی ناشکری ہوتی جس کا اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وقت کا پہیہ گردش کرتا رہا۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی مجھے ملازمت مل گئی۔ دو سال بعد میری شادی ہو گئی۔ بیگم صاحبہ کا تعلق لاہور شہر سے تھا۔

انھوں نے آتے ہی ہمارے گھر میں چائے نوشی کی داغ بیل ڈالی۔ چائے ہمارے گھر میں کبھی کبھار بنائی جاتی تھی اور وہ بھی سردیوں میں۔ لیکن اب چائے کا سلسلہ موسموں کے تغیر و تبدل سے ماورا سارا سال چلنے لگا۔ بنیادی طور پر ہم دودھ کی پینے والے لوگ تھے۔ میرے والد چونکہ ہر میٹھی چیز کو والہانہ رغبت سے کھاتے تھے ان کو میری بیگم کی چائے کی عادت بہت راس آئی۔ خود میں نے طویل قدامت پسندانہ مزاحمت کے بعد بیگم کے ترغیبی ہتھکنڈوں کے سامنے بالآخر ہتھیار ڈال دیے۔ اس وقت میں تین کپ روزانہ چائے کا عادی ہو چکا ہوں۔ اگرچہ اب بھی کبھی کبھی میں پرانی عادت کے زیر اثر بھول جاتا ہوں کہ چائے نوش فرمانے کا وقت ہو چکا ہے۔

چائے کے علاوہ بیگم صاحبہ کو دال چاول اور مرغ پلاؤ بہت پسند تھے۔ چنانچہ یہی پسند میرے بچوں میں بھی در آئی۔ بیگم صاحبہ کے پسندیدہ پھل صرف آم، آڑو اور کنو ٹھہرے۔ ڈرائی فروٹ میں ان کو صرف چلغوزے پسند تھے، باقی چیزوں کو ان کی نظرِ التفات میسر نہیں ہوتی تھی۔ بیگم صاحبہ کی پسند اور ناپسند کے دائرے ہمیشہ بڑے واضح، اٹل اور غیر تغیّر پذیر رہے' اگرچہ میرے بچے، شاید میری تقلید میں، ہر خشک و تر نعمت کو خوشی سے کھا لیتے تھے۔ لیکن میرے لیے حقیقی اذیت اور آزمائش کا مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب میری دوسری نسل معرضِ وجود میں آئی اور اس نے اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرنا شروع کیا۔ میرے لیے یہ بات سوہانِ روح تھی کہ ہمارے پوتوں، نواسوں کے سامنے پھل دھرے ہوں اور وہ ان کو کھانے سے اس لیے انکار کر دیں کہ وہ پھل ان کو پسند نہیں۔ صورت حال یہ ایں رسید کہ ایک بچے کو کیلا پسند نہیں تو دوسرا خربوزے کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ ایک کو بھنڈیاں پسند ہیں لیکن بینگن سخت ناپسند ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ان کے ناپسندیدہ پھل، سبزی یا مشروبات ان کے سامنے پڑے رہیں یہ ان کو ہاتھ نہیں لگائیں گے، خواہ کتنی ہی بھوک کیوں نہ لگی ہو۔ میں تو اب پھل سبزی وغیرہ لاتے وقت دس مرتبہ سوچتا ہوں کہ کیا لے کر جاؤں اور کیا چھوڑوں۔ کیونکہ متعدد مرتبہ ایسا ہوا کہ میں اپنی پسند کا کوئی پھل گھر لے گیا۔ کسی نے اس کو ہاتھ نہ لگایا۔ میں خود ہی کئی دن تک اس کو کھاتا رہا کیونکہ میں نے تو آخر اس پر پیسے خرچ کیے تھے۔

گھر کے اندر یہ اختلافات شدت کے ساتھ قائم رکھے جاتے ہیں۔ جہاں ان سب کی پسند آپس میں مل جاتی ہے وہ ہے کے ایف سی، میکڈونلڈ یا پیزا ہٹ۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ حد سے بڑھی ہوئی انفرادی اور ذاتی پسند و ناپسند ہمیں ایک دوسرے سے دور کرنے کا باعث تو نہیں بن رہی؟ کہیں اس سے ہمارا خاندانی ربط و ضبط کمزور تو نہیں ہو رہا؟ کہیں اس کی وجہ ہماری خوشحالی اور نعمتوں کی بہتات تو نہیں؟ اور کیا ہم اتنی ساری چیزوں کو رد کر کے نعمتوں کی ناشکری تو نہیں کر رہے؟ ہمارے اردگرد کتنے لوگ ہیں جن کو وہ چیزیں بھی میسر نہیں جن کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور اکثر ضائع بھی کر دیتے ہیں؟

■■■

طنزومزاح

کیوں کراتے ہو میری شادی؟

شادی جیسے فروعی معاملے کی تحقیق میں الجھے ایک نوجوان کا دلچسپ ماجرا، دوستوں کے سوالوں اور عملی جوابوں نے اسے خود ایک سوال بنا دیا تھا

عمیر محمود

زندگی اچھی خاصی گزر رہی تھی، کہ ہم شادی کی عمر کو آن پہنچے۔ ہم تہیہ کیے بیٹھے ہیں کہ کوئی بڑا کام کریں گے، شادی جیسے فروعی معاملات میں نہیں الجھیں گے، ویسے بھی کسی شخص کا عمر بھر کا ساتھ پاؤں میں پڑی زنجیر کے مترادف ہے۔ کوئی اونچی منزل حاصل کرنے کے لیے ذہنی یک سوئی کی ضرورت ہوتی ہے، جو بیوی کے ہوتے کم از کم نہیں ہو سکتی۔ ایک طویل عرصے تک آنے بہانے اس افتاد کو ٹالتے رہے، لیکن اب کی بار صورت حال کہیں گھمبیر دکھائی دیتی ہے۔

ویسے تو ہم خاصے نالائق واقع ہوئے ہیں، عمر رواں کی کئی بہاریں تو حصول علم میں گزار دیں۔ جو اماں ابا کی توجہ ہماری گزرتی عمر کی طرف دلاتا، وہ اسے شرمندگی اور ہمیں غصے سے دیکھ کر کہتے ''ابھی تو اس کی پڑھائی ہی مکمل نہیں ہوئی۔''

یہ جملہ سننے کے بعد ہمیں شرمندگی ہوتی اور سوال کرنے والے کو غصہ آجاتا۔ پوچھا جاتا، ''آخر اور کتنا پڑھائیں گے اسے؟''

ہنوز دلی دور است، ہم دل ہی دل میں سوچتے اور اپنی غیر شادی شدہ زندگی میں مگن ہو جاتے۔ پھر وہ وقت آیا کہ ہمارے والدین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا، اور یونیورسٹی والوں کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ ہمیں کامیابی کا پروانہ تھما کر زندگانی کی جانب دھکیل دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا، جب نظریں ہم سے باتیں کرنے لگیں، کچھ نظریں کہتیں ''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی'' کچھ کہتیں ''اب آیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے'' اور کچھ نظریں سوالیہ ہوتیں ''اب نہیں تو کب؟''

عزیزوں رشتہ داروں کی گفتگو میں شاید ہمدردی ہی ہوتی ہے، لیکن ان کی باتیں نشتر بن کر ہمارے والدین کا جگر چھلنی کر دیتی ہیں۔ منہ پھاڑ کر اکثر کیا جانے والا یہ سوال ملاحظہ فرمائیں ''آپ کا بیٹا بوڑھا ہو گیا، آخر کب کریں گے اس کی شادی؟'' کہنے والا تو یہ بات مزے سے کہہ کر چلتا بنتا ہے، اور ہمارے والدین گھر آ کر تادیر ایک دوسرے پر الزام و دشنام کی بارش کرتے ہیں۔ ہر کوئی دوسرے کو اس تاخیر کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ لڑائی طول پکڑتی ہے تو کئی ایسے مردے بھی اکھاڑ لیے جاتے ہیں جنھیں بہت پہلے باہمی مشاورت سے دفنایا گیا تھا۔ ایک دوسرے کو نئے سرے سے الٹی میٹم دیے جاتے ہیں اور بلڈ پریشر معمول پر رکھنے والی گولیاں کھائی جاتی ہیں۔ اور ہمیں ''آر یا پار'' والی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

تو جناب اب ہم ہمہ وقت لرزہ بر اندام رہتے ہیں۔ کوئی وقت گزرتا ہے کہ یہ طوق ہمیں پہنا دیا جائے گا۔ جب جب ہمارے دوستوں کے موبائل پر اس نوعیت کا پیغام آتا ہے ''گھر آتے ہوئے دہی لیتے آنا!'' تو ہم ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ کبھی کبھی استہزائیہ سا قہقہہ بھی نکل جاتا ہے، جس پر دوست ناک بھوں چڑھاتے ہیں، ہمیں حسرت سے اور خوں آشام نظروں سے دیکھتے ہیں، دانت بھی پیستے ہیں، جب کچھ بن نہیں پڑتا تو دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہیں ''کوئی بات نہیں بچو! تم پر بھی یہ وقت آئے گا ہی۔''

ایک دوست جب ملتے ہیں، کہتے ہیں ''بھئی آپ کی شادی کے چاول کھانے کی حسرت ہے۔'' ہم بہتیرا کہتے رہیں شادی کے چاول چھوڑیے، ابھی کسی اچھے سے ہوٹل چلتے ہیں اور چاول کھائے لیتے ہیں، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ایک ہی گردان الاپتے رہتے ہیں۔ ایک اور دوست ہمیں ہر دوسرے روز ایک ڈیڈ لائن دے دیتے ہیں کہ اس کے بعد ہم انہیں غیر شادی شدہ نظر نہ آئیں۔ ایک بٹ صاحب دوستی کے پردے میں کھوجنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کہیں ہم میں کوئی تکنیکی خامی تو نہیں۔

جب ہم شادی کی انسپائریشن لینے کے لیے اپنے شادی شدہ دوستوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر کوئی بدحال ہی نظر آتا ہے۔ جب ملتا ہے اخراجات کا رونا روتا ہے، بیوی کی شکایتیں کرتا ہے، اسکول کی بڑھتی فیسوں اور بچوں کے حوائج ضروریہ سے متعلق اشیاء کی گرانی کا فسانہ کہتا ہے۔ جب سنتے ہیں کہ ایک درمیانے درجے کے اسکول میں نرسری سے بھی نچلے درجے کی کلاسوں میں بچے کی فیس پانچ ہزار روپیہ ماہانہ ہے تو اوسان دیر تک خطا رہتے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں ایک بچے کی پیدائش ہوئی، جب موصوف رات گئے راگ الاپتے تو ہم ہڑبڑا کر نیند سے اٹھ بیٹھتے اور دیر تک شادی سے توبہ کرتے۔

ہمارے کچھ دوست اپنے والدین ہونے کی فضیلت بیان کرتے رہتے ہیں۔ ایک جملہ یکساں ہوتا ہے، ''جب دفتر سے گھر پہنچتا ہوں تو چھوٹو کو دیکھتے ہی ساری تھکن اتر جاتی ہے۔'' لیکن انہی دوستوں کو ہم نے مختلف تقریبات میں بچوں کے ہاتھوں ہراساں پایا۔ ایسے میں وہ ہمیں دیکھتے ہی اپنے بچے ہمیں تھما دیتے ہیں اور راحت کے کچھ پل چراتے ہیں۔ ہمیں بھی بچے پسند ہیں لیکن یہ پسند صرف پندرہ منٹ تک محدود رہتی ہے۔ جلد ہی وہ بچے اپنے والدین کی طرف واپس جانے کی ضد کر رہے ہوتے ہیں اور

والدین دامن چھڑاتے ہوئے کہہ رہے ہوتے ہیں ''یہ بڑے اچھے چاچو ہیں، یہ تمہیں باہر لے کر جائیں گے'' ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً تائید میں سر ہلانا پڑتا ہے۔

اپنی تعلیمی اور پیشہ ورانہ زندگی میں، اور اپنے عزیز واقارب میں ہمیں جن خواتین سے واسطہ رہا، یا اپنے شادی شدہ دوستوں کے توسط سے خواتین کے بارے میں جو باتیں سنیں، ان کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کرنے میں ناکام ہی رہے۔ایک دوست کی اہلیہ اتنی سی بات پر مہینا بھر روٹھی رہیں کہ ہمارے دوست کو ٹریفک کے رش کی وجہ سے گھر آنے میں پندرہ منٹ کی تاخیر ہوگئی تھی۔ایک دوست کی اہلیہ نے ان سے چھٹی لے کر میکے چلنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن دفتر سے چھٹی نہ ملی، تو وہ موصوفہ کتنے ہی دن منہ سجائے بیٹھی رہیں۔اور شک کرنا تو ان خواتین کی جیسے گھٹی میں پڑا ہے۔ خوش گمانی چھو کر بھی نہیں گزرتی۔شوہر پرفیوم لگا کر دفتر جا رہا ہے تو یقیناً کوئی چکر ہوگا، واپس آنے کا معمول گڑبڑ ہوا تو یقیناً کسی عشوہ طراز کے گیسوؤں میں الجھا ہوگا، نئی شرٹ پہنی ہے تو کسی کو امپریس کرنے کا ارادہ ہوگا۔۔۔

ایک صاحب کی اپنی اہلیہ سے تادیر بحث چلتی رہی، دونوں جانب سے کف اڑتے رہے، برتن چلتے رہے، آخر صاحب نے کہا ''ہم تو وہ کہہ ہی نہیں رہے جس پر آپ برہم ہو رہی ہیں۔'' جواب آیا، ''لیکن آپ کا مطلب تو وہی ہے نا۔''

ہمیں تو ہول اٹھتے رہتے ہیں کہ شریک حیات مزاجوں والی نکلیں تو ہمارا کیا بنے گا۔اور اگر ہتھ چھٹ بھی واقع ہوئیں، پھر تو ہمارے ولیمے کے چاول کھانے کی خواہش رکھنے والے دوست فاتحہ کے چاول بھی کھائیں گے۔

چلیں جی، ہماری جان گئی اور ان کی خوراک ٹھہری۔۔۔

اوپر سے ہم نے ایک تحقیق پڑھ لی کہ شادی انسان کو موٹا کر دیتی ہے۔ تفصیل یوں ہے کہ شادی کے بعد اگر آپ مطمئن رہیں تو موٹے ہو جاتے ہیں۔تب سے اس فکر میں غلطاں ہیں کہ ہماری شادی کامیاب ہوگئی تو کیا ہوگا۔ یعنی ہم پہلے ہی فربہی کی جانب اچھے خاصے مائل ہیں شادی کے بعد تو پھول کر کُپا بن جائیں گے۔

تو ہم اس مضمون کے ذریعے اپنے تمام ہی خواہوں کو عرض کیے دیتے ہیں، کہ ہم اپنی موجودہ زندگی سے ازحد خوش ہیں۔ معمولات احسن انداز میں چل رہے ہیں، گھر میں مطلوبہ خاموشی میسر ہے جو ہمیں بہت عزیز ہے، جب جی چاہتا ہے موٹر سائیکل کو کک مارتے ہیں اور کہیں بھی نکل کھڑے ہوتے ہیں، ''کہاں جا رہے ہو، واپس کب آؤ گے، مجھے بھی ساتھ لے چلو، مجھے امی کے گھر ڈراپ کر دینا، مجھے باہر کھانا کھلانے لے چلو، آج کل تم کچھ زیادہ ہی باہر نہیں جانے لگے، کون سی ماں سے ملنے جا رہے ہو'' قسم کے سوالات اور فرمائشیں ہم سے کوئی نہیں کرتا۔

بھئی اگر شادی کے بعد یہ حال ہونا ہے تو ہم کہیں بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنی مرضی کا کھاتے ہیں، اپنی مرضی کے وقت پر سوتے ہیں، اور بستر سے اپنی مرضی کی سائیڈ سے اترتے ہیں۔

لہٰذا!!! کیوں کراتے ہو میری شادی؟

■■■

جنگلی مینڈھے کا شکار

شکار تو شکار ہوتا ہے چاہے شیر کا ہو یا مینڈھے کا
ضبط، حوصلہ، صبر اور اعصاب سب کا امتحان ہوتا ہے

مترجم: صبا شفیق

The Wild Ramp

مجھے برسوں سے یہ خواہش تھی کہ پہاڑوں پر رہنے والے شاندار گول گول سینگوں والے مینڈھے کا شکار کروں۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے ماہر شکاری ہونے کے ساتھ ساتھ پہاڑوں پر چڑھنے کا تجربہ ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور یہ تجربہ حاصل کرنے میں مجھے کافی عرصہ لگا۔ کینیڈا کے شمال میں یوکن نامی خوبصورت وادی ان پہاڑی مینڈھوں کا قدیم مسکن ہے۔ سو میں نے اور میرے دوست مائیکل نے اسی کا انتخاب کیا۔ ہم جہاز کے ذریعے برفانی چوٹیوں سے گھری اس وادی میں پہنچے۔ ہمارا گائیڈ ڈین تھا جو کہ کئی سال پہلے اس وادی کی سیر کو آیا اور پھر اس کی خوبصورتی میں اس قدر کھو گیا کہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اب وہ یہاں آنے والے سیاحوں اور شکاریوں کی رہنمائی کرتا تھا اور انھیں وادی کی خوبصورت جگہیں دکھانے کے ساتھ ساتھ شکار کے بہترین مقامات تک بھی لے کر جاتا تھا۔

ہم نے وادی کے اندر تک پہنچنے کے لیے کرائے پر جیپ حاصل کی اور تمام ضروری سامان جس میں خیمے، پانی، ٹن خوراک، پنیر، مونگ پھلی، بسکٹ، مچھلی، سوپ کے ٹن وغیرہ شامل تھے جیپ پر لادے۔ اپنے کیمرے ہم نے اپنے رُک بیگ میں رکھے۔ سامان پر ترپال کسی گئی اور وادی کے دامن تک ہمارے سفر کا آغاز ہوا۔ ہم نے پہلا کیمپ کساوا جھیل کے کنارے لگایا۔ یہاں نظارہ بے حد دلفریب تھا۔ جھیل کے سبزی مائل شفاف پانی میں نظر آتی برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں عجیب منظر پیش کررہی تھیں۔ ہم شکار بھول کر قدرت کی رنگینی میں کھو گئے۔ یوں جیسے ہم طلسم ہوشربا میں ہوں۔ جھیل تک ہم سہ پہر کو پہنچ گئے تھے۔ مگر اب شام ہو چکی تھی، ڈین نے کہا ''اس وقت پہاڑوں پر چڑھنا مشکل اور جان لیوا ہوسکتا ہے، سو آرام کرتے ہیں اور صبح تازہ دم ہو کر مینڈھوں کو ڈھونڈنے نکلیں گے۔ کیونکہ اکثر یہ مینڈھے ایسی جگہ پر نظر آتے ہیں جہاں انسان کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ سو پہاڑوں میں دور تک چلنا پڑتا ہے۔ اس لیے جوانو! آرام کرو اور صبح کے ایڈونچر کے لیے تیار اور تازہ دم ہوجاؤ۔''

ہم نے ڈین کی بات سے اتفاق کیا۔ ہم نے کیمپ میں الاؤ جلایا اور مچھلی کو پکانے لگے۔ برفانی چوٹیوں سے آتی یخ بستہ ہوا اور بھی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ ایسے میں گرم گرم مچھلی کھانے کا اپنا ہی لطف آرہا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے کافی پی اور پھر سونے کے لیے ہم تینوں اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔

اگلے روز ہم علی الصبح ہی بیدار ہو گئے۔ سورج ابھی نکل رہا تھا ہم نے ناشتہ کیا اور جیپ میں سوار ہو گئے۔ ہماری رفتار بہت آہستہ تھی کیونکہ ہم اردگرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جارہے تھے۔ ڈین نے کہا کہ اوپر پہاڑوں پر بھی نظر رکھو کیونکہ صبح صبح وہاں مینڈھوں کے ملنے کے امکانات ہوتے ہیں جب کہ پہاڑوں کے پیچھے تو کسی بھی وقت مل سکتے ہیں مگر وہ جان جوکھوں کا کام ہے۔'' بلندی بتدریج بڑھ رہی تھی اور راستہ بھی تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک نسبتاً کھلی جگہ پر پہنچ کر ہم نے جیپ روک دی کیونکہ یہاں سے ہمیں پیدل اتر کر پہاڑوں پر چلنا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے رُک بیگ اٹھائے۔ بندوقیں تھامیں اور چل پڑے۔ ابھی ہم کچھ ہی دیر چلے تھے کہ ہم نے ایک ڈھلوان پر جنگلی بھیڑیں دیکھیں۔ مگر یہ صرف مادہ اور بچے تھے ان میں کوئی نر مینڈھا نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے انھیں جانے دیا۔ ہم نے شکار کے لیے باقاعدہ پرمٹ حاصل کیا تھا اور اس پرمٹ کے مطابق آٹھ سال سے کم عمر مینڈھا شکار کرنا غیر قانونی تھا۔ ہم دوپہر تک پہاڑ پر چڑھتے رہے مگر ہمیں ہمارے مطلب کا کوئی مینڈھا نظر نہیں آیا۔ دوپہر کو ہم نے ایک چٹان پر بیٹھ کر رک بیگ میں ساتھ لائے ہوئے سینڈوچ کھائے جو ہم نے ناشتے میں ساتھ لے جانے کی نیت سے ہی زیادہ بنائے تھے۔ پھر ہم نے تھرماس سے چائے پی، سورج سر پر آچکا تھا اور اس کی تپش اب جھلسا رہی تھی، سو ہم

چٹان کی اوٹ میں لیٹ کر کچھ دیر سستانے لگے۔

ڈین نے کہا کہ اگر اب ہم مزید اوپر چڑھے تو پہاڑ سے اترتے ہمیں اندھیرا ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ خطرہ مول نہ لیا جائے اور واپسی کا سفر شروع کر دیا جائے۔ میں اور مائیک بھی تھک گئے تھے سو ہم نیچے اترنے لگے مگر ہماری نظریں مینڈھا تلاش کرتی رہیں۔ جب ہم جیپ تک پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ سوجھیل کنارے اپنے کیمپ تک آتے ہمیں رات ہوگئی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم الاؤ کے گرد بیٹھے تھے جب ڈین نے کہا کہ بہتر ہے کہ ہم اپنا کیمپ وادی کے کچھ اور اندر لے جائیں اور مزید آگے جا کر مینڈھے تلاش کریں۔ ہم نے ڈین کی تجویز سے اتفاق کیا۔ اگلے روز ہم صبح سویرے اٹھے۔ ناشتہ کر کے اپنے خیمے سمیٹے اور جیپ پر لاد کر روانہ ہو گئے۔ آج ہم دوسری سمت کے پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ہمیں دور پہاڑوں پر بھیڑوں کا ایک گلہ نظر آیا۔ ہم جیپ روک کر دوربینوں سے دیکھنے لگے۔ اس غول میں مادائیں بچے اور تین خوبصورت نر بھی شامل تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں ہماری مرضی کا مینڈھا تو نظر آ گیا تھا۔ مگر وہ ہم سے بہت دور تھا اور یہاں سے نشانہ لینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پھر غول اوپر کی جانب چڑھ رہا تھا اگر وہ نیچے اتر رہا ہوتا تو تب بھی امید تھی کہ ہم راستے میں چھپ کر ان کے نیچے پہنچنے کا انتظار کرتے۔ مگر اب تو بس ہم ہاتھ ہی ملتے رہ گئے کیونکہ اگر ہم بھی ان کے پیچھے اوپر جاتے تو اتنی دیر میں وہ مزید اوپر پہنچ گئے ہوتے، سو تعاقب بھی بیکار ہی جاتا۔ چنانچہ ہم واپس جیپ میں بیٹھ گئے اور سفر پھر سے شروع ہوا۔ ڈین کے مطابق آج رات ہم ایک برفانی نالے کے قریب کیمپ لگانے والے تھے۔

تقریباً گھنٹہ بھر کی مزید مسافت کے بعد ہم ایک برفانی نالے کے قریب پہنچ گئے۔ اس سے کچھ فاصلے پر ہم نے جیپ روکی اور خیمہ زن ہو گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم ڈین کی رہنمائی میں پیدل ایک سمت کو چل پڑے اردگرد کے مناظر انتہائی خوبصورت تھے۔ گھنٹہ بھر چلنے کے بعد ہمیں ایک غول نظر آیا مگر اس میں مادائیں اور بچے تھے۔ کوئی نر مینڈھا نہیں تھا، ہم مایوس سے ہو گئے۔ اس پر ڈین نے ہمیں بتایا کہ بعض اوقات بہت ہفتوں بعد بھی بہت سے شکاری ناکام ہی لوٹتے ہیں کیونکہ نر مینڈھا مشکل سے ہی ہاتھ آتا ہے۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا ''جوانو! تم تو دو دن میں ہی ہمت ہار گئے۔'' پھر ڈین نے کہا کہ کچھ فاصلے پر ایک ندی ہے اور ندی کے پار ایک دشوار گزار چوٹی ہے۔ چوٹی کا راستہ خطرناک اور پر پیچ ہے مگر وہاں نر مینڈھا یقینی طور پر مل سکتا ہے۔ ہم نے ڈین سے کہا کہ وہ ہمیں فوری طور پر وہاں لے چلے۔ اس پر ڈین نے ہمیں سمجھایا کہ اس کے لیے ہمیں صبح سویرے نکلنا ہوگا تاکہ ہم شام تک واپس آسکیں۔ اور اب تو ویسے ہی شام ہو رہی تھی۔ برف پوش چوٹیوں کے پیچھے ڈوبتا سورج بہت دلفریب لگ رہا تھا ہم کچھ دیر اس نظارے سے لطف اندوز ہوتے رہے اور پھر اپنے

خیموں کی طرف چل دیئے۔

اگلی صبح ہم سورج نکلتے ہی بیدار ہو گئے۔ ناشتہ کر کے اپنے رک بیک تیار کیے اور ندی کی طرف چل دیئے۔ ندی پر ایک سولہ انچ کی ایلومینیم کی کشتی موجود تھی۔ ہم کشتی میں بیٹھ کر ندی کے دوسرے کنارے پہنچے تو ڈین نے سامنے موجود ایک چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آج یہاں تمھیں مینڈھا ضرور ملے گا۔ سورج سر پر آچکا تھا، گرمی بڑھ رہی تھی۔ ہم نے چھوٹی چھوٹی چٹانوں پر چڑھ کر چوٹی کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا۔ راستہ واقعی بہت مشکل تھا، پتھر پیروں کے نیچے سے سرک جاتے تھے سو ہم نے اپنی واکنگ اسٹیکس نکال لیں اور محتاط طریقے سے اوپر چڑھنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں ہم پسینے سے شرابور ہو چکے تھے۔ ہماری پانی کی بوتلیں بھی گرم ہو چکی تھیں اور ان میں پانی بھی کم ہی رہ گیا تھا۔ اب چڑھائی بہت دشوار ہو گئی تھی اور راستہ بے حد تنگ ہو گیا تھا، اتنا کہ ایک وقت میں ایک شخص ہی اوپر چڑھ سکتا تھا سو ہم ایک دوسرے کے پیچھے احتیاط سے قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ابھی تک کوئی مینڈھا تو کیا مادہ اور بچے تک بھی نظر نہیں آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم چوٹی کے اوپر پہنچ چکے تھے مگر یہاں بھی کوئی مینڈھا نہیں تھا۔ مجھے ڈین پر غصہ آنے لگا کہ اگر یہاں مینڈھے نہیں تھے تو وہ ہمیں جان جوکھوں میں ڈال کر یہاں تک لایا کیوں؟ میں ابھی ڈین سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ بائیں طرف موجود ایک چٹان کی طرف بڑھ گیا اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دوربین سے دیکھنے لگا اور پھر جب وہ مڑا تو اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ ہماری ریاضت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ ہم بھی چٹان کے پاس پہنچے اور جب ہم نے آنکھوں سے دوربین لگائی تو ایک دم بے ساختہ ایک ساتھ میرے اور مائیکل کے منہ سے نکلا ''واہ کیا شاندار مینڈھے ہیں۔'' دراصل چٹان کے دوسری جانب ایک وسیع و عریض چراگاہ تھی جس میں ایک بہت بڑا غول چر رہا تھا۔ اس میں بہت سے مینڈھے شامل تھے۔

غول کے اور ہمارے درمیان خاصا فاصلہ تھا، اتنی دور سے نشانہ خطا ہونے کا امکان زیادہ تھا اور ہم ایک بار پھر خالی ہاتھ نہیں رہنا چاہتے تھے۔ سو ہم پیٹ کے بل رینگتے ہوئے غول کے قریب ہونے لگے۔

قریب ہونے پر ہمیں ایک بہت بڑا اور نہایت شاندار مینڈھا نظر آیا۔ ڈین نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''دوست! اس سے شاندار مینڈھا میں نے آج تک خود بھی شکار نہیں کیا۔ چلو، باندھو نشانہ۔'' مگر اچانک اس مینڈھے کو جانے کیا سوجھی وہ چوٹی کے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ ''شاید وہ دوسری طرف اترنے لگا ہے۔'' ڈین بولا۔

مائیک کہنے لگا ''جلدی کرو کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔'' میں نے جلدی سے شست باندھی اور رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی سیدھی مینڈھے کے سر میں لگی۔ وہ بھاگا اور اس کے وہ دو قدم اسے نیچے تنگ چٹانی کھائی میں گرانے کا سبب بن گئے۔

ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور جلدی سے چوٹی کے کنارے تک پہنچ کر نیچے دیکھنے لگے۔ باقی

مینڈھے اور بھیڑیں اس دوران بھاگ اٹھی تھیں۔ مینڈھا جس جگہ گرا تھا وہاں تک پہنچنا بے حد مشکل نظر آ رہا تھا۔ مگر ہم نے چوٹی کے کنارے پر موجود ایک درخت سے رسی باندھی مائیک کو اوپر ہی چھوڑا اور میں اور ڈین کھائی میں اتر گئے۔ قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ مینڈھا تقریباً بارہ سال کا تھا۔ اس کے سینگ شاندار تھے مگر چونکہ نر مینڈھے اکثر سینگ لڑاتے رہتے ہیں سو اس کے سینگوں پر اس کی جنگوں اور فتوحات کے تمغے ثبت تھے۔ وہ کافی وزنی تھا۔ سو ڈین نے کہا کہ ہم کھائی میں ہی اس کی کھال اتارتے ہیں اور سینگ کھوپڑی، کھال اور کچھ گوشت لے کر چلتے ہیں اس کی ہڈیوں کا وزن اٹھا کر چوٹی تک پہنچنا اور پھر وہاں سے نیچے کیمپ تک پہنچنا بہت مشکل ہو جائے گا۔'' میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ہم نے مینڈھے کی کھال اتارنی شروع کی اور پھر اس کا گوشت ہڈیوں سے علیحدہ کیا۔ کھال اور کچھ گوشت میں نے اپنے بیگ میں رکھا جب کہ سینگوں والی کھوپڑی اور باقی گوشت ڈین نے اپنے بیگ میں رکھا۔ جس کھائی میں ہم موجود تھے وہاں موجود پتھر ہمارے حرکت کرنے سے مسلسل سرک رہے تھے اور گوشت بناتے، کھال اتارتے ہم اس جگہ سے سو گز دور آچکے تھے جہاں کہ ہم اترے تھے۔ سو ہم نے محتاط انداز میں واپسی کا سفر شروع کیا۔ مائیک اوپر سے آواز لگا لگا کر ہماری ہمت بڑھا رہا تھا۔ رسی ہمارے بہت کام آئی اور ہم اسے تھام کر چوٹی کے اوپر پہنچ گئے۔ کچھ دیر وہاں لیٹ کر ہم نے گہرے گہرے سانس لیے۔ ڈین نے کہا ''ہمیں جلدی چوٹی سے نیچے اتر جانا چاہیے کیونکہ شام ہونے والی ہے۔ ہم نے جلدی جلدی قدم بڑھائے مگر پھر بھی ہمیں چوٹی سے اترتے اندھیرا ہو گیا۔ اندھیرے میں ہمیں ندی کا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈین نے قطب نما نکال کر اس کی مدد لینے کی کوشش کی اور پھر گھنٹہ بھر بھٹکنے کے بعد ہم ندی کنارے پہنچ چکے تھے۔ کشتی وہیں موجود تھی، ہم نے اپنی ٹارچ جلائی اور کشتی میں چپو چلاتے ہوئے دوسرے کنارے تک پہنچ گئے۔ رات گہری ہو رہی تھی اور ہم بری طرح تھک گئے تھے۔ مگر خیموں تک پہنچنا بھی ضروری تھا۔ رات کے اندھیرے میں برفانی نالے کا شور ہمیں ہمارے خیموں کی طرف لے جانے میں معاون ثابت ہو رہا تھا کیونکہ خیمے نالے سے کچھ ہی دور تھے۔ ہم اپنی ٹارچوں کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے۔ گھنٹہ بھر مزید چلنے کے بعد ہم اپنے خیموں کے قریب پہنچ گئے۔ گو کہ ہم تھکن سے چور اور نڈھال تھے مگر اس تھکن میں بھی ایک سرشاری اور خوشی تھی۔ دو دن خوار ہونے کے بعد آج تیسرے دن ہمیں کامیابی ملی تھی۔ مائیک کہنے لگا ''سننے میں کس قدر آسان لگتا ہے، جنگلی مینڈھے کا شکار..... مگر آج پتا لگا کہ شکار تو شکار ہوتا ہے چاہے شیر کا ہو یا مینڈھے کا..... ضبط، حوصلہ، صبر اور اعصاب سب کا امتحان ہوتا ہے۔''

''جی جی آپ بہت بہادر اور حوصلہ مند ہیں۔'' میں نے کہا اور ہمارے قہقہے فضا میں گونجنے لگے۔ ■■■

ہم دونوں دوست پانیوں اور روشنیوں کے شہر وینس کے ایک نواحی قصبے کی مشہور کافی شاپ پر بیٹھے ہوئے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ کافی شاپ میں ایک گاہک داخل ہوا جو ہمارے ساتھ والی میز کو خالی پا کر وہاں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی بیرے کو آواز دے کر بلایا اور اپنا آرڈر یوں دیا دو کپ کافی لاؤ اور اس میں سے ایک وہاں دیوار پر۔

ہم نے اس شخص کے اس انوکھے آرڈر کو دلچسپی سے سنا۔ بیرے نے آرڈر کی تعمیل کرتے ہوئے محض ایک کافی کا کپ اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس صاحب نے وہ ایک کپ نوش کیا مگر پیسے 2 کے ادا کیے۔ اس گاہک کے جاتے ہی بیرے نے دیوار پر جا کر ایک ورق چسپا کر دیا جس پر لکھا تھا: ''ایک کپ کافی کا دیوار پر۔''

ہمارے وہاں بیٹھے بیٹھے دو اور گاہک آئے جنھوں نے تین کپ کافی کا آرڈر دیا۔ دو ان کی میز پر اور ایک دیوار پر۔ پیئے تو انھوں نے دو ہی کپ مگر ادائی تین کپ کی کی اور چلتے بنے۔ ان کے جانے کے بعد بھی بیرے نے ویسا ہی کیا، جا کر دیوار پر ایک اور ورق چسپاں کر دیا جس پر لکھا تھا، ایک کپ کافی دیوار پر۔

چند دنوں کے بعد ہمیں ایک بار پھر اس کافی شاپ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ یہاں ایک ایسا شخص داخل ہوا جس کے کپڑے اس کافی شاپ کی حیثیت اور یہاں کے ماحول سے قطعی میل نہیں کھا رہے تھے۔ غربت اس شخص کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس شخص نے بیٹھتے ہی پہلے دیوار کی طرف دیکھا اور پھر بیرے کو بلایا اور کہا! ایک کپ کافی دیوار سے لاؤ۔ بیرے نے اپنے روایتی احترام اور عزت کے ساتھ اس شخص کو کافی پیش کی جسے پی کر یہ شخص بغیر پیسے دیے چلتا بنا۔ ہم یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ بیرے نے دیوار پر لگے ہوئے ورقوں میں سے ایک ورق اتار کر کوڑے دان میں پھینک دیا۔ اب ہمیں معاملے کا پتا چل گیا تھا۔ اس قصبے کے باسیوں کی اس عظیم الشان اور اعلیٰ انسانی قدر نے ہماری آنکھوں کو آنسوؤں سے بھگو کر رکھ دیا تھا۔

کافی نہ تو ہمارے معاشرے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ہمارے لیے واجبات زندگی کی طرح اہم کوئی چیز۔ بات تو صرف اس سوچ کی ہے کہ کسی بھی نعمت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آپ ان لوگوں کا تصور ہی کر لیں جو اس نعمت کو اتنا ہی پسند کرتے ہیں جتنا کہ آپ مگر وہ اس کے حصول سے محروم ہیں۔

اس ضرورت مند کو دیکھیے جو اس کافی شاپ میں اپنی عزت نفس کو مجروح کیے بغیر ہی داخل ہوتا ہے اور اسے یہ پوچھنے کی قطعی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آیا اس کو ایک کپ کافی مفت میں مل سکتا ہے یا نہیں۔ اس نے دیوار پر دیکھا، کافی کا آرڈر موجود پا کر، یہ پوچھے اور جانے بغیر ہی کہ یہ کپ کس کی طرف سے ہے۔ موجود ہے، اپنے لیے ایک کپ کا آرڈر دیا، کافی کو سرور کے ساتھ پیا اور خاموشی سے چلتا بنا۔

■■■

فریحہ جاوید

قابلِ ستائش

قریب المرگ مریضوں کے لیے مہربان ''مریض خانے'' کا نیا تصور

دھتکارے ہوئے انسانوں کی
مسیحا ڈاکٹر لزا

کیا ہمیں بھی محبت اور رحم دلی کا کوئی پاکستانی فرشتہ مل سکے گا

عبدالہادی

بدھ کے دن پلوتسکی ریلوے اسٹیشن پر بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔ یہ ماسکو کے پندرہ بڑے ریلوے اسٹیشنوں میں سے ایک ہے۔ بیشتر مسافر اس چہل پہل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، مگر وہاں بسنے والوں کے لیے یہ ہفتے کا سب سے بہترین وقت ہوتا ہے۔

اس دن بھی حسب معمول شام پانچ بجے ایک نیلی منی بس اسٹیشن کے قریب والی گلی میں آ کر رکی۔ اس سے پینتالیس چھیالیس سالہ دبلی پتلی عورت برآمد ہوئی۔ اس نے ایمرجنسی ڈاکٹروں والا لباس پہن رکھا تھا۔ یہ ڈاکٹر لزا تھی۔

اترتے ہی تین درجن بے گھر لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ ''وہ ڈاکٹر لزا، ڈاکٹر لزا'' چلاتے ہوئے اسے اپنے زخمی ہاتھ، بازو یا چہرے دکھانے لگے۔ ہر کسی کی بھرپور کوشش تھی کہ ڈاکٹر اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ وہاں بے انتہا شور، بدبو اور ہجوم تھا۔

لیکن ڈاکٹر لزا کی آنکھوں اور حرکات میں خوف تھا اور نہ ہی کراہت! اس نے اطمینان سے ان لوگوں کو ایک طرف کیا جنھیں فوری علاج کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر نے پہلے کی مرہم پٹی کر کے رستا خون روکا، ایک کی ٹوٹی ناک جوڑی اور تیسرے کو ٹیکہ لگایا۔

جب تک ان مریضوں کا علاج ہوا، وہاں تقریباً دو سو بے گھر مرد، عورتیں جمع ہو گئیں۔ ڈاکٹر لزا پھر ان میں چائے کے پلاسٹک کپ، سینڈوچ، صابن، جوں مار شیمپو وغیرہ تقسیم کرنے لگی۔ اس کے ساتھ آنے والے ڈرائیور اور پانچ رضا کاروں نے لوگوں میں نظم وضبط برقرار رکھا۔ کبھی کبھی بے صبروں میں لڑائی ہوتی تو وہ بہت جلد پھیل جاتی تھی۔

ڈاکٹر لزا نے پھر علاج کرنا شروع کیا تو وہ اپنے مریضوں کا پوچھنے لگی..... ارے وہ چیچنیا سے آنے والا نوجوان کہاں گیا، یہ نیا آدمی کون ہے؟ جو قیدی

پچھلے دنوں رہا ہوا تھا، اس نے رات کہاں گزاری؟ اس نے پھر ایک مہاجر کو ریل ٹکٹ کا کرایہ دیا۔ کسی نے اس کی جیب کاٹ لی تھی اور دوسرے کو بتایا کہ نیا پاسپورٹ کہاں سے بنے گا؟ وہ اپنا پاسپورٹ کھو بیٹھا تھا۔

آخر یہ محبّت اور رحم دلی کا ارضی فرشتہ کون ہے؟ اس کا پورا نام ایلزویتا پتروونا گلینزکا ہے۔ ماسکو میں جنم لینے والی یہ معالج غیر سرکاری فلاحی تنظیم فیئر ہیلپ (Fair help) کی بانی، دوسری تنظیم پوائزنگ ہاسپائس فنڈ کی صدر، ایک کامیاب امریکی وکیل کی بیگم اور تین بچوں کی ماں ہے۔

ڈاکٹر ایلز نے ایسی سخت زندگی کا آغاز کیوں کیا؟ وہ کہتی ہے، ''ہر انسان راہ حیات کا خود انتخاب کرتا ہے۔ ایک قول ہے: وہ غریبوں اور بے بسوں کی مدد کرنا آزادی ہے۔'' چناں چہ مجھے اپنی آزادی بہت پسند ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی زندگی اسی انداز میں بسر کرنی ہے...... لیکن بعض اوقات یہ خاصی سخت بھی محسوس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر لزا

ویتا گلینزکا ایک فوجی افسر اور ڈاکٹر ماں کی بیٹی ہے۔ ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ بھی معالج بننا چاہتی تھی۔ 1986ء میں اس نے ماسکو کے ایک کالج سے طبی ڈگری لی۔ اسی سال اس نے ایک امریکی سیاح سے شادی کر لی اور امریکا چلی گئی۔

امریکا میں وہ کسی عام ہسپتال میں ملازمت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ایک مریض خانے (hospice) کے دورے نے اس کی زندگی بدل ڈالی۔ وہاں اس نے دیکھا کہ موت کا انتظار کرتے ہوئے مریضوں کو کسی قسم کی مشکلات اور پریشانیاں برداشت نہیں کرنی پڑتیں۔ ڈاکٹر مریضوں پر پوری توجہ دیتے اور ان کا خیال رکھتے۔ تبھی ڈاکٹر لزا کو خیال آیا ''روس میں ایسا کوئی مریض خانہ کیوں موجود نہیں؟''

متاثر ہو کر اس نے ایسی اکیڈمی میں داخلہ لے لیا جہاں سکھایا جاتا تھا کہ مرتے ہوئے مریضوں کی دیکھ بھال سائنسی طریق کار اور منظم طور پر کیسے کی جا سکتی ہے؟ یہ تعلیم پا کر پہلے اس نے بطور رضا کار ایک امریکی مریض خانے میں چند ماہ کام کیا۔ پھر اس میں بحیثیت ڈاکٹر ملازمت کر لی۔ جب اسے خاصا تجربہ حاصل ہو چکا تو اس نے سوچا کہ روس میں بھی مریض خانہ کھولا جائے۔

1999ء میں شوہر کی پیشہ ورانہ ضروریات اُسے کیف، یوکرائن لے گئیں۔ ڈاکٹر لزا بھی اس کے ساتھ تھی۔ سویت یونین کی سبھی ریاستوں کے مانند وہاں بھی مریض خانے عنقا تھے۔ چناں چہ غریب اور بے یارو مددگار مریضوں و بوڑھوں کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ سرکاری ہسپتالوں میں جگہ نہ ہوتی تو وہ مجبور تھے کہ فلاحی

اداروں یا اپنے رحم و کرم پر زندگی کی آخری گھڑیاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گزاریں۔

ڈاکٹر لزا نے چاہا کہ یوکرائنی حکومت کی مدد سے دارالحکومت کیف میں کوئی مریض خانہ بنوا دے مگر اسے ناکامی ہوئی۔ سرکاری افسروں کا کہنا تھا، ''ہمارے پاس اپنے ہسپتالوں کے لیے فنڈز نہیں، مرتے ہوئے لوگوں پر وقت اور رقم کیونکر خرچ کریں؟'' یوکرائن میں عام لوگوں کو بھی مریض خانے کی بابت کچھ نہیں پتا تھا۔ انھیں علم نہ تھا کہ ایسے ہسپتال میں قریب المرگ مریض رکھے جاتے ہیں اور انھیں ہر ممکن سہولیات فراہم ہوتی ہیں۔

آخر ڈاکٹر لزا نے خود ہی کمر کسی، اپنے خرچ پر ایک جونیئر معالج ملازمت پر رکھا اور موبائل وین سروس شروع کر دی۔ وہ پھر کیف کے ریلوے اسٹیشنوں، بس اڈوں اور دیگر عوامی مقامات میں مقیم بیمار اور غریب بے گھروں کی مدد کرنے لگی۔ وہ ان کا علاج کرتی اور مالی مدد بھی دیتی۔ اکثر اوقات محض باتیں کرنا بھی انھیں ذہنی طور پر سہارا دے دیتا۔

رفتہ رفتہ ڈاکٹر لزا کیف کے غربا میں مشہور ہو گئی۔ غریبوں کی مدد کرنے پر شہریوں نے اسے داد و تحسین سے نوازا۔ ڈاکٹر نے اس شہرت سے فائدہ اٹھایا اور شہری انتظامیہ پر دباؤ ڈال کر ایک مریض خانہ تعمیر کرا ہی لیا۔ آج وہ مریض خانہ وسیع و عریض دو منزلہ عمارت بن چکا۔ وہاں کل وقتی 45 ڈاکٹر کام کرتے ہیں۔ حکومت ملازمین کو تنخواہ دیتی ہے۔ ادویہ اور آلات کا خرچ مخیّر لوگوں کے عطیات سے پورا ہوتا ہے۔

2007ء میں ڈاکٹر لزا کے شوہر کا تبادلہ ماسکو ہو گیا۔ ماسکو میں صرف کینسر کے مریضوں کی خاطر مریض خانے موجود تھے اور ان میں بھی صرف کھاتے پیتے خاندان کے مریضوں کو داخلہ ملتا۔ لہٰذا ڈاکٹر لزا نے کوششیں کیں کہ شہر میں غربا کے لیے کوئی مریض خانہ تعمیر ہو جائے۔ لیکن ماسکو میں بھی بے حس اور مغرور سرکاری افسروں سے ڈاکٹر لزا کا ٹکراؤ ہوا۔ انھوں نے غربا کے لیے فنڈز جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر غریب دوست معالج دل برداشتہ نہ ہوئی اور اپنے خرچ پر مصیبت زدہ لوگوں کی مدد و علاج کرنے لگی۔

پانچ سال گزر چکے، اس کی قائم کردہ تنظیم، فیئر ہیلپ آج ماسکو کی مشہور فلاحی انجمن بن چکی۔ گو تنظیم کو سرکاری فنڈ نہیں ملتا، لیکن وہاں دس افراد کام کر رہے ہیں۔ وہ سب فلاحی سرگرمیوں میں ڈاکٹر کی مدد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ایک بلاگ ''doctor-liza'' بھی چلا رہی ہے۔ اس میں وہ ستم رسیدہ مرد و زن کے حالات زندگی لکھتی ہے۔

سرکاری افسر آج بھی ڈاکٹر لزا کو دیوانی سمجھتے ہیں لیکن وہ حتی المقدور بے سہارا لوگوں کی دامے درمے سخنے مدد کیے جا رہی ہے۔ اس کا مشن ہے کہ ماسکو میں دکھی انسانیت کے لیے دو مریض خانے تعمیر ہو جائیں۔ چونکہ اس کی نیت صاف ہے لہٰذا وہ راہ میں آنے والی کسی رکاوٹ سے خوفزدہ نہیں اور سمجھتی ہے کہ درست راہ پر گامزن ہے۔

پاکستان میں بھی کسی مخیّر یا سماجی رہنما کو ڈاکٹر لزا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مریض خانے قائم کرنے چاہئیں۔ یوں غریب مریضوں کو نہ صرف سرکاری ہسپتالوں کی اذیت ناک بے نیازی سے نجات ملے گی۔ بلکہ دنیا سے رخصتی بھی باعزت اور آسان ہو گی۔

کیا وہ واقعی مجرم اور ولن تھا

نیڈ کیلی

آئرش ہیرو جسے برطانوی نفرت سے دیکھتے ہیں
کیا آزادی پسندوں سے نفرت سبھی غاصبوں کا وتیرہ ہوتی ہے؟

فتح نیاز

آج مسلمان افغانستان، فلسطین، مقبوضہ کشمیر اور دیگر ممالک میں غاصبوں سے نبرد آزما ہیں۔ ان غاصبوں میں کوئی امریکی ہے، کوئی بھارتی اور کوئی اسرائیلی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ماضی میں تب کی سُپر پاور، برطانیہ کو بھی امریکا، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور دیگر ایسی نوآبادیوں میں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جہاں گوری نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی آباد تھے۔ آسٹریلیا کے باغیوں میں سب سے زیادہ شہرت نیڈ کیلی نے پائی۔ آج اسے بہت سے آسٹریلوی آزادی کا فرستادہ جب کہ دوسرے قاتل اور لٹیرا سمجھتے ہیں۔

نیڈ کیلی کا باپ جان کیلی کیتھولک آئرش تھا۔ 1830ء میں اسے آئر لینڈ سے آسٹریلیا کے قید خانے" بھجوا دیا گیا۔ جان پہ سچا یا جھوٹا الزام تھا کہ اس نے دوسؤر چرائے ہیں۔ جان کے علاوہ بھی ہزارہا کیتھولک آئرش چور ڈاکو اور قاتل قرار دے کر آسٹریلیا بھجوائے گئے۔ آج براعظم آسٹریلیا میں بہت سے لوگ انہی جھوٹے سچے مجرموں وملزموں کی اولاد ہیں۔

یہ کیتھولک آئرش اپنے پروٹسٹنٹ حاکموں کے خلاف بڑا غم وغصہ رکھتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آئرش اور حاکم برطانویوں کے مابین بڑا معاشی تفاوت تھا۔ آئرش غریب کسان یا مزدور تھے یا پھر نچلے درجے کی ملازمتیں کرتے۔ دوسری طرف برطانوی سڈنی، میلبورن، ایڈلیڈ وغیرہ کے شہروں میں ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے۔

مزید برآں آمدن کی تقسیم بھی مساوی نہ تھی۔ آسٹریلوی حکومت کو برآمدات کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی، اس کا بڑا حصہ برطانوی حکومت یا سرمایہ دار ڈکار جاتے۔ یہ دونوں عفریت آسٹریلوی غربا خصوصاً آئرش اور افغان مزدوروں کا استحصال کرتے۔ اسی نظام استحصال کے خلاف نیڈ کیلی کی بغاوت رونما ہوئی۔

نیڈ کیلی 1855ء میں آسٹریلوی ریاست وکٹوریہ کے قصبے بیورتیج میں پیدا ہوا۔ اسے بغاوت کے جراثیم اپنے باپ سے ملے جو 1866ء میں جیل میں چل بسا۔ جان کیلی پر الزام تھا کہ اس نے ایک برطانوی نو آبادیاتی افسر کو قتل کرنا چاہا تھا۔

جب نیڈ کیلی نے شعور سنبھالا تو اس نے اپنے اردگرد پھیلی بے انصافی دیکھی۔ کارخانوں کے مالک مزدوروں کو معمولی تنخواہ دیتے۔ وہاں انھیں کسی قسم کی سہولتیں بھی حاصل نہ تھیں۔ اسی طرح بڑے سرمایہ دار اونے پونے داموں کسانوں سے اناج خریدتے پھر اسے برآمد کر کے خود سارا منافع کما لیتے۔ جب خصوصاً غریب آئرش مزدور یا کسان نو آبادیاتی انتظامیہ سے شکایت کرتے تو وہ ان پر مزید ظلم ڈھانے لگتی۔

جب نوجوان نیڈ کیلی نے یہ ناانصافی دیکھی تو اسے خاموشی سے سہنے کے بجائے اس نے بغاوت کر دی۔ کیلی نے سب سے پہلے ایک بینک لوٹ لیا اور وہاں سے ملنے والی رقم ستم رسیدہ آئرش مزدوروں میں تقسیم کر دی۔ 1878ء میں پولیس سے مقابلے کے دوران اس نے تین سپاہی قتل کر ڈالے۔

برطانوی نوآبادیاتی حکومت کو ایک باغی آئرش کی یہ جسارت بہت کھلی۔ چناں چہ 1880ء میں کئی سو سپاہیوں نے کیلی کے گڑھ، گیلنسروان میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ کئی دن مقابلہ کرنے کے بعد جب کیلی کا اسلحہ ختم ہوا تو اس نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیے۔

حکومت نے نومبر 1880ء میں کیلی کو پھانسی دی اور اس کی لاش میلبورن میں پینٹ رج نامی قید خانے میں دفنا دی۔ رفتہ رفتہ آسٹریلوی معاشرے میں علم پھیلا اور لوگ انصاف، آزادی، مساوات وغیرہ کے ابدی اصولوں سے واقف ہوئے تو نیڈ کیلی کا اصل روپ نمایاں ہوا۔ تب خاص طور پر آئرشوں کو معلوم ہوا کہ وہ کوئی مجرم یا ولن نہیں بلکہ ان کا ہیرو اور آزادی کا متوالا تھا۔

تب آسٹریلیا میں مقیم آئرشوں نے یہ تحریک چلا دی کہ نیڈ کیلی کو عزت و احترام سے دفنایا جائے۔ آخر 2010ء میں پینٹ رج جیل خانے میں مختلف مقامات پر کھدائیاں ہوئیں۔ ایک جگہ سے چار انسانی ڈھانچے برآمد ہوئے۔ تب نیڈ کیلی کے رشتے داروں سے ڈی این اے حاصل کیا گیا۔ ایک ڈھانچے کا ڈین این اے ان سے مل گیا۔ یوں نیڈ کیلی کی باقیات سامنے آ گئیں۔

کچھ عرصہ قبل وکٹوریہ کے اس علاقے میں کیلی کی باقیات دفنا دی گئیں جہاں مقتول نے بغاوت کی تھی۔ ماتمی تقریب میں کیلی کے رشتے دار ہی شریک ہوئے۔ نیز تقریب کی تشہیر زیادہ نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ علاقے میں قتل ہونے والے سپاہیوں کے عزیز واقارب بھی بستے ہیں۔

مزید برآں غیر آئرش آسٹریلویوں کی بڑی تعداد بھی نیڈ کیلی کو مجرم اور قاتل ہی گردانتی ہے۔ چناں چہ اس کے معاملے میں آسٹریلوی معاشرہ تقسیم ہے۔ مگر وکٹوریہ میں مقیم ہزارہا آئرش اسے اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیلی کی زندگی پر کتب لکھی جا چکیں۔ نیز وہ لوک شعرا، گلوکاروں اور موسیقاروں کا محبوب موضوع ہے۔ 1970ء میں اس پر ایک دستاویزی فلم بنی۔ کیلی کا کردار مشہور گلوکار مک جیگر (Mick Jagger) نے ادا کیا۔

نیڈ کیلی اپنے ہم وطن آئرشوں کو برطانوی نوآبادیاتی حکومت کی چیرہ دستیوں سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ ان کا ہیرو بن گیا۔ مگر برطانوی اسے نفرت سے دیکھتے ہیں۔ آزادی پسندوں کو حقارت سے دیکھنا سابقہ ہی نہیں حالیہ سپر پاور، امریکا کا بھی وتیرہ ہے۔ ■■■

ہیڈ کانسٹیبل کا بیٹا انڈر ورلڈ کا بے تاج بادشاہ کیسے بنا؟

کوئی شخص اسکی پیشکش رد کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا

معظم علی

سانولی رنگت، درمیانے درجے کا قد اور خاموش طبع شخص سے ملنے والا کوئی بھی شخص یہ گمان نہیں کرسکتا کہ اس شخص نے امریکی اور بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے افسران کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ جنوبی ایشیاء میں کسی شخص نے جرائم کو باقاعدہ ایک صنعت کی شکل دے کر اس کے ذریعہ بے انتہا دولت اور شہرت حاصل کی ہے تو وہ داؤد ابراہیم کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ جرائم کی دنیا کی روایت کے مطابق یہ شخص مکمل طور پر پُراسرار ہے۔ کوئی شخص اس تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا۔ اس بارے میں تمام لب خاموش ہیں۔ انٹرپول کی 2008ء کی تیار کردہ فہرست کے مطابق اس کا نام 10 سب سے زیادہ مطلوب شخصیات میں چوتھے نمبر پر ہے، جبکہ فوربز کی رپورٹ کے مطابق دنیا کے سب سے طاقتور ترین اشخاص میں داؤد ابراہیم کا نمبر 57 ہے۔ انڈیا کے سب سے بڑے جاسوسی ادارے سی بی آئی کے مطابق داؤد اپنی

شناخت چھپانے کے لیے 13 مختلف ناموں کا استعمال کرتا ہے۔ داؤد ابراہیم کا قد پانچ فٹ چار انچ ہے اور اس کی بائیں ابرو پر کالا تل ہے۔ داؤد ابراہیم کی فیملی کے بارے میں میڈیا کے پاس کوئی خاص معلومات نہیں ہیں۔ اس کی ایک بیٹی مہ رُخ ابراہیم کی شادی مشہور کرکٹر جاوید میانداد کے بیٹے جنید میانداد کے ساتھ ہوئی۔ جاوید میانداد کے مطابق اُس کے بیٹے جنید کی داؤد ابراہیم کی بیٹی مہ رخ سے ملاقات لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہوئی۔ داؤد ابراہیم کا ایک بیٹا قرآن مجید کا حافظ بھی ہے، جبکہ اس کے ایک بیٹے کی شادی برطانیہ میں رہائش پذیر ایک بزنس مین کی بیٹی کے ساتھ 2011 کے شروع میں ہوئی تھی۔ اخبارات میں چھپنے والی خبروں کے مطابق داؤد ابراہیم خود بھی مذہب کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ اطلاعات کے مطابق وہ کسی روحانی شخصیت کا مرید بھی ہے اور ایک بار اس کے کسی حریف سے اس کے پیر صاحب نے صلح بھی کروائی تھی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ صلح کی یہ میٹنگ مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے قریب ہوئی تھی۔

داؤد ابراہیم ایک پولیس کانسٹیبل ابراہیم کاسکر کے گھر، مہاراشٹرا کے شہر رتناگری کے ایک گاؤں مکا میں 27 دسمبر 1955ء کو پیدا ہوا۔ پیدائش کے سرٹیفکیٹ پر اس کا نام شیخ داؤد ابراہیم کاسکر تحریر ہے۔ جبکہ اس کو داؤد ابراہیم اور شیخ داؤد حسن کے ناموں سے بھی بلایا جاتا ہے۔ داؤد ابراہیم کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت تھوڑی معلومات مل سکی ہیں۔ پولیس کے مطابق اسے اسکول سے نکال دیا گیا تھا۔ داؤد ابراہیم کی کہانی کا پتا ممبئی سے چلتا ہے جب وہ انڈر ورلڈ گینگ امیر زادہ پٹھان کے ساتھ منسلک ہوگیا۔ اس نے اپنے مستقبل

کے لئے جرائم کی دنیا کا راستہ اختیار کیا اور ممبئی شہر کے جنوبی حصہ میں واقع ٹمکر سٹریٹ اور محمد علی روڈ کے ایک معمولی بھتہ خور سے جرائم پیشہ دنیا کا بے تاج بادشاہ بن گیا۔ ہفتہ وار بھتے کی وصولی کے ساتھ اس نے منشیات کا کاروبار شروع کیا اور اپنے مخالفین کو رفتہ رفتہ راستے سے ہٹا کر ممبئی کا ڈان بن گیا۔ اطلاعات کے مطابق ابتداء میں اس کا تعلق انڈر ورلڈ کے گینگ امیر زادہ پٹھان اور بعد میں حاجی مستان اور کریم لالہ سے بھی رہا۔

80ء کی دہائی میں جرائم کی دنیا میں حاجی مستان کا طوطی بولتا تھا اور اس نے داؤد ابراہیم کے سر پر ہاتھ رکھا۔ جس کے بعد داؤد ابراہیم نے خود مختار ہونے کے لیے کوششیں شروع کردیں جو امیر زادہ پٹھان گینگ کو انتہائی ناگوار گزریں۔ یہ گینگ دو بھائیوں امیر زادہ اور عالم زیب پٹھان کے سر پر چل رہا تھا۔ یہ دونوں بھائی کریم لالہ کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اس نے جرائم کی دنیا میں ابھرتے ہوئے داؤد کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوششیں شروع کردیں اور 1981ء میں ہونے والے ایک حملے میں داؤد ابراہیم کا بڑا بھائی صابر ان دونوں بھائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

داؤد ابراہیم مقامی طور پر اس وقت مشہور ہوا جب اس پر ممبئی کے دو داداؤں عالم زیب اور امیر زادہ کے قتل میں ملوث ہونے کا الزام عائد کیا گیا۔ 80ء کی دہائی میں ممبئی پولیس نے داؤد ابراہیم کو گرفتار کرلیا تاہم بعد میں ضمانت پر رہا ہوکر وہ دبئی فرار ہوگیا۔ دبئی میں اس نے سونے کی سمگلنگ میں ہاتھ ڈالا، بالی وُڈ کی فلمی صنعت میں سرمایا لگایا، اور جائیداد بنانا شروع کیا۔ اس وقت تک عام لوگ اس کے نام سے اس قدر واقف نہیں تھے۔ 1980 اور 1990 میں داؤد ابراہیم انڈر ورلڈ کا 'سرغنہ' بن گیا اور کھربوں ڈالر کے اثاثے بنالیے۔ اس کے متعلق بننے والی رپورٹس میں اسے جوئے، منشیات اور طوائفوں کے کاروبار سے منسلک کیا جاتا ہے۔

انڈین حکام کا کہنا ہے کہ وہ قانون سے بچنے کے لیے 1986 میں دبئی چلا گیا۔ تاہم اس کی 'انڈر ورلڈ' کارروائیاں جاری رہیں۔ اس کا انڈین فلم انڈسٹری بالی وڈ پر بھی خاصا اثر ہے۔ داؤد ابراہیم پر کئی فلموں کی فلمسازی اور ان میں کام کرنے کے لیے چند مخصوص اداکاروں کو پیسے دینے کا بھی الزام ہے۔ داؤد ابراہیم کے ایک قریبی دوست کا کہنا ہے ''کوئی بھی ان کی پیشکش رد کرنے کی جرات نہیں کرسکتا''۔ داؤد ابراہیم کے بالی وڈ میں اثر ورسوخ کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب بالی وڈ لیجنڈ امیتابھ بچن نے اپنی ایک فلم میں داؤد ابراہیم کے انداز میں ایک ڈائیلاگ بولا تو اس گستاخی کے نتیجے میں ان کی طلبی ہوئی اور داؤد ابراہیم نے انہیں ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ بالی وڈ سے اس کے تعلقات کا راز اس

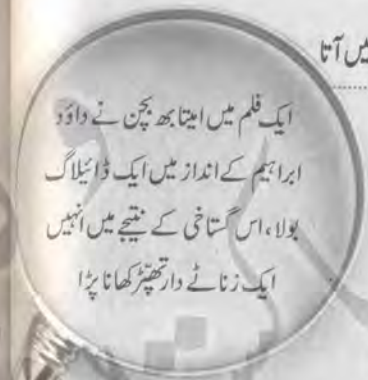

وقت افشا ہوا جب وہ شارجہ میں کرکٹ میچ کی کوریج کے دوران ٹی وی پر کئی فلمی ستاروں کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ سنا ہے وہ آج بھی بھارتی فلم اسٹارز کے ساتھ رابطہ میں ہے۔ داؤد ابراہیم سے ملنے والے بھارتی فلم اسٹارز میں سلمان خان، گووندا، سنجے دت اور دیگر کئی نام شامل ہیں۔ 15 اگست 2012ء کو ہندوستان ٹائمز میں چھپنے والی ایک خبر کے مطابق سنجے دت نے بھارتی سپریم کورٹ میں یہ اعتراف کیا تھا کہ ان کی دبئی میں داؤد ابراہیم سے ملاقات ہوئی تھی، سنجے دت کے مطابق ایک ڈنر میں داؤد ابراہیم سے ملاقات ہوئی تھی لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ داؤد ابراہیم بھی اس ڈنر میں آئے گا۔

سال 1993ء میں ممبئی میں ہونے والے 12 دھماکوں کے بعد اس کو اُس وقت شہرت ملی جب ممبئی پولیس نے الزام لگایا کہ ان دھماکوں کے پیچھے ٹائیگر میمن اور داؤد ابراہیم کا ہاتھ ہے۔ اس وقت داؤد ابراہیم دبئی میں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ممبئی میں اس کے دست راست چھوٹا راجن سے داؤد کے تعلقات انہی

دھماکوں کے بعد ختم ہوگئے تھے۔ چھوٹے راجن پر بعد میں تھائی لینڈ میں قاتلانہ حملہ ہوا۔ بتایا جاتا ہے کہ داؤد ابراہیم کا نمبر دو ''چھوٹا شکیل'' ہے جس کے گروہ میں ابو سالم شامل تھا۔ تاہم بعد میں ابو سالم ان سے الگ ہوگیا تھا۔ چند سال قبل پرتگال کی پولیس نے اعلان کیا تھا کہ اس نے ابوسالم کو گرفتار کرلیا ہے۔ بھارتی پولیس کے مطابق ابو سالم بمبئی میں 1993ء میں ہونے والے بم دھماکوں کا بڑا ملزم ہے۔ ان دھماکوں میں 200 سے زیادہ افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ داؤد ابراہیم کے دیگر قابل اعتماد ساتھیوں میں اس کا بھائی انیس ابراہیم بھی شامل ہے۔ اس کے ایک اور بھائی اقبال کاسکر کو دبئی پولیس نے بھارت ڈیپورٹ کردیا تھا۔ اب وہ ممبئی جیل میں ہے۔

داؤد ابراہیم اس وقت بھارت کے قانونی اداروں کے لیے مطلوب ترین شخص ہے۔ داؤد اور اس کے بھائی انیس ابراہیم پر 1993ء کے ممبئی بم دھماکوں کی منصوبہ بندی کا الزام ہے جس میں 257 لوگ مارے گئے تھے جبکہ 700 کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ خیال ہے کہ یہ بم دھماکے 1992ء میں ان فسادات کے انتقام میں کیے گئے تھے جن میں گجرات میں سیکڑوں مسلمان مارے گئے تھے۔ ان فسادات کا الزام ہندو انتہا پسند تنظیم شیو سینا پر عائد کیا جاتا ہے۔ داؤد ابراہیم کا مقدمہ ممبئی کی خصوصی عدالت میں نہیں چلایا گیا کیونکہ عدالت نے پہلے ہی اپنا فیصلہ دے دیا ہے اور پولیس ریکارڈز میں داؤد 'مفرور ملزم' قرار دیا جا چکا ہے۔ انڈین حکام کا کہنا ہے کہ داؤد ابراہیم اب پاکستان میں رہتا ہے اور اس کے مبینہ روابط القاعدہ اور کالعدم تنظیم لشکر طیبہ کے ساتھ ہیں۔ اطلاعات کے مطابق دہلی نے پاکستان سے اسے بھارت کے حوالے کرنے کا بھی مطالبہ بھی کیا ہوا ہے۔

امریکا بھی داؤد ابراہیم کو 'عالمی دہشتگردوں' میں شمار کرتا ہے اور امریکا داؤد ابراہیم کے والد کو بھی انڈر ورلڈ کے مجرموں میں شامل کرتا ہے۔ امریکی حکام داؤد پر اسامہ بن لادن سے تعلقات کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ امریکی حکام کا یہ دعویٰ ہے کہ داؤد ابراہیم نے 1990 کی دہائی میں ''طالبان کی حفاظت میں'' افغانستان کا دورہ بھی کیا تھا۔ امریکا کے مطابق داؤد ابراہیم وسیع پیمانے پر منشیات کی سمگلنگ کے دھندے میں بھی ملوث ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیا میں منشیات کے مرکز افغانستان سمیت کسی بھی دوسرے ملک میں داؤد ابراہیم کے خلاف منشیات کی سمگلنگ میں ملوث ہونے کا کوئی ایک بھی مقدمہ درج نہیں ہے۔ یہ بات بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ امریکا کو داؤد ابراہیم مشہور امریکی صحافی ڈینیئل پرل کے قتل کی تحقیقات کے لیے بھی مطلوب ہے۔ دراصل امریکی تحقیقات کے مطابق داؤد کا قریبی ساتھی سعود میمن

سعودی عرب میں کالعدم الرشید ٹرسٹ کی مالی معاونت کرتا تھا۔ یہ شخص کراچی میں کپڑے کا امیر ترین تاجر تھا۔ امریکی خفیہ اداروں کے مطابق یہ سعود میمن ہی تھا جو فروری 2002ء میں ڈینیل پرل کو دھوکے سے ایک فلیٹ میں لایا تھا اور وہیں ڈینیل پرل کی گردن کاٹ دی گئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد سے اب تک سعود میمن پراسرار طور پر غائب ہے جبکہ 2008 میں ممبئی میں ہونے والے دہشت گرد حملے میں بھی داؤد ابراہیم کو ملوث کیا جاتا ہے۔ بھارتی اخبار ''انڈیا ٹوڈے'' میں چھپنے والی ایک رپورٹ کے مطابق حملہ آوروں کو داؤد ابراہیم نے لاجسٹک سپورٹ فراہم کی تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق ممبئی حملہ میں گرفتار ہونے والے واحد دہشت گرد اجمل قصاب نے تفتیش کے دوران اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ دہشت گردی کے لیے اسلحہ اور دھماکہ خیز مواد ان کو داؤد ابراہیم کی تنظیم نے ہی مہیا کیا تھا۔

گزشتہ سال اخبارات میں چھپنے والی ایک رپورٹ کے مطابق داؤد ابراہیم سخت بیمار ہے اور گزشتہ دو سالوں کے درمیان اسے دو بار ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور محسوس یہ کیا جا رہا ہے کہ اب اس کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ 58 سالہ داؤد ابراہیم ڈاکٹروں کی مسلسل نگہداشت میں ہے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ داؤد ابراہیم نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس کے دفن کے لیے ممبئی یا ضلع رتنا گری میں واقع اس کے آبائی علاقے خد میں جگہ تلاش کریں۔ داؤد ابراہیم نے اپنی خرابی صحت کی وجہ سے ہی اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی مؤخر کر دی تھی۔

انڈر ورلڈ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ داؤد ابراہیم ایک پراسرار کردار ہے جو بیک وقت مجرم، دہشت گرد اور غریب پرور بھی ہے۔ اس کی نجی زندگی کے بارے میں عورتوں اور شراب سے اس کے لگاؤ کا ذکر بھی آتا ہے مگر اس سے ملاقات کے دوران آپ کو اس بات کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ سننے میں آرہا ہے کہ داؤد ابراہیم کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آچکا ہے اور وہ مذہب کی جانب بہت مائل ہو چکا ہے۔ داؤد ابراہیم کے بارے میں بھارتی مسلمانوں بالخصوص گجرات کے مسلمانوں میں اچھے جذبات پائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آج بھی ممبئی اور دہلی میں داؤد بھائی کا خفیہ راج قائم ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بھارت، پاکستان، دبئی، بنگلہ دیش اور سری لنکا میں با اثر ترین حکومتی شخصیات داؤد کے ذاتی دوستوں میں شامل ہیں۔ بھارتی سی بی آئی کا دعویٰ ہے کہ داؤد ابراہیم کراچی اور دبئی میں رہتا ہے لیکن وہ کہاں ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں اور جسے کچھ معلوم ہے اسے بولنا نہیں آتا۔

■■■

داؤد ابراہیم کی زندگی پر بننے والی بالی وڈ کی فلمیں

کمپنی۔ داؤد ابراہیم، ایم پی سندھو اور چھوٹا راجن کے درمیان علیحدگی پر مبنی فلم

رسک۔ داؤد ابراہیم کی زندگی پر بننے والی فلم

ڈی۔ داؤد ابراہیم کا شروع سے لے کر انڈر ورلڈ کے ڈان بننے تک کا سفر

بلیک فرائیڈے۔ 1993 میں ممبئی میں ہونے والے بم دھماکوں پر مبنی فلم

شوٹ آؤٹ ایٹ لوکھنڈوالہ۔ 1991 کے مشہور پانچ گینگوں کے متعلق بننے والی فلم

ونس اپون اے ٹائم ان ممبئی۔ داؤد ابراہیم اور حاجی مستان کے متعلق فلم

ونس اپون اے ٹائم ان ممبئی 2۔ داؤد ابراہیم اور چھوٹا راجن کے متعلق فلم

کیریئر کونسلنگ

تعلیمی دنیا میں سب سے زیادہ اسکالرشپ اسی شعبے کو ملتے ہیں

نیچرل سائنسز

(جنرل سائنس)

اس شعبے میں آنے کیلئے نویں جماعت سے سائنسی مضامین کا انتخاب کرنا پڑتا ہے

انسانوں کے جس بھی گروہ یا قوم کو دنیا کی قیادت کرنی ہو اسے انسانی زندگی کی سہولت اور معاشرتی ترقی کے لیے اسباب جیسے کار، ریلوے، بس، ٹرک ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر ایجاد کرنے ہوں گے۔ اسی طرح فون، TV، کمپیوٹر، فیکس اور موبائل فون پیش کرنے ہوں گے۔ خطرناک بیماریوں کے علاج کے لیے الٹرا ساؤنڈ، سی ٹی سکین، ایم آر آئی، انجیوگرافی، انجیو پلاسٹی، لیزر اور ریڈیو تھراپی جیسے پیچیدہ آلات تیار کرنے ہوں گے اور دشمن کے مقابلے کے لیے تلوار، بندوق، توپ، کلاشنکوف، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، زہریلی گیسیں اور لڑاکا طیارے پیش کر کے حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ مذکورہ تمام اشیاء تو انجینئرنگ سے تعلق رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس مختلف شعبوں کی تحقیق ہے اور عملی تصویر انجینئرنگ کی ہے۔

رہا یہ سوال کہ سائنسی ایجادات کے فوائد اور نقصانات تو اس کا تعلق استعمال کرنے والے کی ذہنی ساخت سے ہے۔ شخصی، انسانی، دینی اور معاشرتی اقدار کی پختگی سے ہی سوچ اور فکر کے زاویے بنتے ہیں اور غلط اور درست کی تمیز کرنے کا فہم ملتا ہے۔ انسان کو اشیاء کا علم دینے کا مطلب یہ

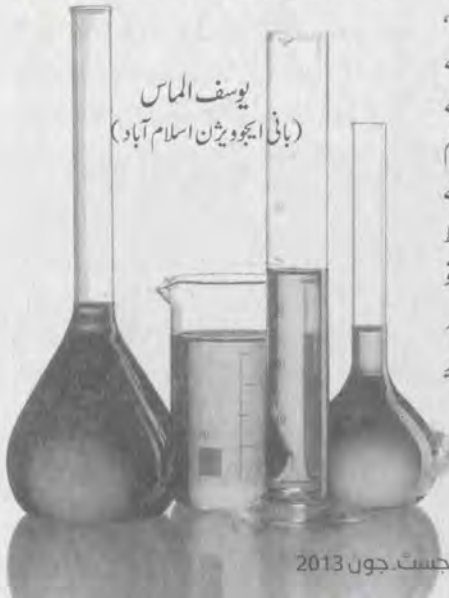

یوسف الماس
(بانی ایجوویژن اسلام آباد)

ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز اندھیرے میں نہیں روشنی میں ہوا تھا لہٰذا زمین پر زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی سائنس کا آغاز ہوگیا تھا۔ عاد، ثمود اور دیگر اقوام کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ قرآن مجید میں ملتا ہے جبکہ مروجہ سائنس کا باقاعدہ تذکرہ 500 سال قبل مسیح میں یونانیوں کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن 600-1400ء کے درمیان میں دھاتوں کو پگھلانا، فولاد تیار کرنا، چمڑا بنانا، گندھک کا تیزاب بنانا، لوہے کو زنگ سے بچانا، طب انسانی کی جملہ بنیادیں، بیشمار جڑی بوٹیوں پر تحقیق، روشنی کی خصوصیات اور قوانین، علم نجوم، فلکیات، ریاضی اور جغرافیہ کے علوم کی ترقی اور ہر سائنسی نظریہ کو تجربہ سے پرکھنے کی پابندی کا اطلاق بلاشبہ مسلمانوں کا اہم کارنامہ ہے۔

بلاشبہ یہ کام بڑا صبر آزما اور کٹھن ہے مگر جو لوگ دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور قوموں کی ترقی جن کا مطمح نظر ہوتی ہے ان کے لیے یہ سب باتیں چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ ملک و قوم کے عروج کا داعیہ اس قدر طاقتور ہے جو راستے کی ہر مشکل برداشت کر کے آگے بڑھنے کا جذبہ تازہ فراہم کرتا ہے۔ ہر چیز کو محتاط مشاہدے اور تجربات کی کسوٹی پر پرکھنے والا یہ علم تجسس، صبر آزما انتظار کے ساتھ ساتھ لمحوں کی خطا اور سرمو حرکت کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اخلاقیات کی سان پر چڑھا کر اور اقدار کا پابند کر کے ہی سائنس کے استعمال کو مفید بنایا جاسکتا ہے۔ اپنے دامن میں سوالات کا وافر ذخیرہ رکھنے والے اور نئی تحقیقات کا دروازہ کھولنے والے یہ لوگ ہر عمل اور ردعمل کے پس منظر میں وجوہات اور دلیل تلاش کرتے ہیں۔ معاشرے کی ترقی کے لیے نئی نئی ایجادات جو زندگی کو ہر آنے والے دن کے حقائق سے ہم آہنگ کر سکیں، قدرت ان کے ہاتھوں کروا دیتی ہے۔

سائنس کی اقسام

طبعی علوم (Natural Sciences) آج ترقی یافتہ اور بہت وسیع علوم ہیں ان کی بنیادی تین اقسام ہیں:

۱۔ فزکس ۲۔ کیمسٹری ۳۔ بائیولوجی

بعض لوگ ریاضی کو بھی طبعی سائنس کی بنیادی شاخ مانتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ریاضی سائنس کا شعبہ تو ہوسکتا ہے مگر طبعی سائنس کا شعبہ نہیں ہے۔

اسی طرح ارضیات اور ماحولیات کے شعبے بھی بالواسطہ سائنس سے تعلق رکھتے ہیں۔

سائنسی تعلیم

سائنسی شعبوں میں تعلیم کے اعتبار سے پاکستانی طلبہ و طالبات بڑے خوش قسمت ہیں کہ بہت کم اخراجات کے ساتھ اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ خوش قسمتی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ملک کے طول و عرض میں مختلف تعلیمی اداروں میں یہ شعبہ جات دستیاب ہیں۔ آپ اپنی شخصی خصوصیات کی بنا پر جس بھی شعبے کا انتخاب کریں گے آپ کو اپنے ہی علاقہ میں یا قریب ترین مقام پر مطلوبہ تعلیم کے مواقع میسر ہوں گے۔

اس شعبے میں داخلے کے لیے نویں جماعت سے ہی سائنسی مضامین کا انتخاب کر کے ایف ایس سی (پری میڈیکل یا پری انجینئرنگ) کے ساتھ بی ایس اور بی ایس سی کے طریق کار سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ پاکستان کی تعلیمی دنیا میں یہ وہ واحد شاخ ہے جس میں سب سے زیادہ اسکالرشپ موجود ہیں۔ لہٰذا طلبہ و طالبات کو توجہ سے ان اسکالرشپ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

بائیولوجی (Biology)

زندگی کسے کہتے ہیں؟ زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟ یوں تو یہ سوال ایک فلسفہ ہے جس پر وقت کے ہر بڑے دانشور نے اپنے خیالات کا اظہار کرنا ضروری سمجھا ہے اور اس کی حقیقت کی جانب قدم بڑھانے سے کچھ اور سوالات ابھرتے ہیں۔ ایک زندگی وہ ہے جو انسانوں کے علاوہ حیوانات، چرند اور پرند میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پودوں کی دنیا میں بھی یہ زندگی موجود ہے۔

ان سب میں مشترک اقدار ہمیں ایک جانب ان کی حقیقت کا فہم دیتی ہیں اور دوسری جانب ان تمام اشیاء کو الگ کر دیتی ہیں جو یہ اقدار نہیں رکھتیں۔ زندہ اجسام میں نشو ونما اور افزائش نسل کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں بہترین تنظیم پائی جاتی ہے۔ توانائی کا حصول، استعمال اور ہر بیرونی عمل پر ردعمل زندہ اشیاء کا خاصہ ہے۔

سائنس کے بے شمار شعبہ جات میں سے اہم ترین شعبہ بائیولوجی ہے جس میں جاندار اشیاء کی اصل کو سمجھنا، تجزیہ کرنا، ترکیب کو جاننا اور ان کی بہتری اور نشو ونما کے لیے درکار عناصر پر غور کرنا، ان کے باہمی تعلقات اور کائنات میں موجود دیگر تمام اشیاء اور حالات کے اثرات کے ساتھ تعلق اور نتائج پر تحقیق کرنا ہے اور بہترین حل پیش کر کے کائنات میں زندگی کو آسان اور بہتر بنانا شامل ہے۔

یہ شعبہ بہت اہم ہونے کے ساتھ ساتھ صبر آزما بھی ہے۔ لمبے عرصہ کے لیے تن تنہا محنت کرنا عام سی بات ہے۔ دور دراز علاقوں میں کام کرنے والوں میں جسمانی مشقت برداشت کرنے کی ہمت ضروری ہے۔ تحریری اور تقریری ابلاغ کی

اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبیعت میں تجسس اور خوب سے خوب تر کی تلاش رکھ دی ہے اور دوسری جانب انسانی ہدایت کا آخری نسخہ (قرآن مجید) ہمیں اس بات کی بار بار تلقین کرتا ہے کہ آفاق وانفس میں غور وفکر کرو۔ آفاق انسان کے باہر کی تمام کائنات ہے۔ خواہ وہ چاند، ستارے، سورج، ہوا اور فضا ہو یا زمین اور اس میں موجود خزانے وسمندر اور اس کی تہوں میں بے شمار مخلوقات ہوں۔ جبکہ انفس انسان کی اندرونی کائنات ہے۔ آفاق وانفس کا علم ہی وہ علم ہے جو کہ حضرت آدمؑ کو دیا گیا تھا۔ اسی علم اور اس کے بہترین استعمال کے ساتھ کائنات میں اس کے خالق کا نام روشن کرنے کی وجوہ کی بنا پر بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات کا اعزاز عطا ہوا اور فرشتوں کا مسجود ٹھہرایا گیا۔

کائنات کی وسعتوں میں قدرت کے پوشیدہ رازوں اور قوانین کا باریک بینی سے مشاہدہ اور انسانی زندگی کے لیے مفید معاشرہ کی ترقی اور ان سے استفادہ کے لیے تحقیق وتدریس کے اہم ترین شعبے، سائنس میں نمایاں مقام حاصل کیے بغیر یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

صلاحیت بھی اہمیت کی حامل ہے۔

مضامین

گریجوایشن اور پوسٹ گریجوایشن کی سطح پر پڑھائے جانے والے مضامین اور ذیلی مضامین کی فہرست یہ ہے۔

بائیولوجی، بائیو کیمسٹری، بائیو ٹیکنالوجی، بائٹی، فیزیالوجی، فریش واٹر بائیولوجی اینڈ فیشری، زوالوجی، مائکروبائیولوجی، مولیکیولر جینیٹکس، مائکولوجی اینڈ پلانٹ پیتھالوجی، ویرالوجی، امیونالوجی پلانٹ سائنسز، اینیمل سائنسز، ایکولوجی، جینیٹکس۔

کیمیا کیوں ضروری ہے

اللہ تعالیٰ کی اس حسین وجمیل کائنات سے متعلق غور وفکر کے نتیجے میں ہم اس نکتہ پر پہنچتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو انسان کے لیے مفید، انسان کو سہولت دینے والی اور اس کی مشکلات کو ختم کرنے والی ہے وہ پسندیدہ اور ہر وہ کوشش جو اس سلسلے میں کی جائے گی دنیا اسے عزت کا مقام دے گی اور اسے یاد رکھے گی یا یوں کہیں ساری کائنات محض اس انسان کے لیے ہے۔ تاہم سوال یہ ہے کہ انسان کا مقصد حیات کیا ہے؟ یہ سوال اس مضمون کے موضوعات کا حصہ نہیں ہے لیکن یہ بنیادی سوال ذہن میں آتا ضرور ہے۔ انسانی زندگی اپنے دامن میں بے شمار ضروریات، مشکلات، خواہشات اور لوازمات رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کا آغاز خوراک، لباس اور رہائش سے ہوتا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر خوراک کی فراہمی صحت کے اصولوں کے مطابق بنانا اور نت نئے انداز اور ذائقے پیش کرنے کے لیے فوڈ انڈسٹری کا وسیع جال، کیمیائی تعامل ہی کا نتیجہ ہے۔ اس طرح انسان کے پہننے کو انواع و اقسام کے نفیس اور دیدہ زیب لباس کی پیش کش کے پیچھے بھی ماہرین کیمیا کا ذہن کارفرما ہے۔ تیسری بنیادی ضرورت رہائش کے تمام تر لوازمات خواہ وہ سیمنٹ ہو یا لوہا، شیشہ ہو یا سرامکس، پلاسٹک ہو یا دیگر اشیاء، تمام کی تمام اس شعبے کی مرہون منت ہیں۔ مزید برآں امراض سے بچاؤ اور علاج اور دیگر تفریح اور آسائش کا سامان۔ کیمیائی عمل کے ذریعہ توانائی کا حصول، مختلف عناصر اور ان کی خصوصیات کا تجزیہ، مختلف مادوں کا ایک دوسرے سے ملنا اور نتائج اخذ کرنا، گندھک، نمک اور شورے کے تیزاب کی تیاری اور ان کا مفید استعمال اور مختلف قسم کے محلول کا تجزیہ اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں استعمال میں لانا شامل ہے۔

معیار اور مقدار کو معیاری رکھتے ہوئے پیداوار میں اضافے یا محض علم کے اضافے کے لیے کیمیائی تجربات، جاندار اشیاء کے اہم مرکبات اور دیگر اشیاء کے مرکبات کی کیمیائی ترکیب، خصوصیات، باہمی تعلق اور ایک دوسرے کے ساتھ ردعمل کا تجزیہ، ادویہ سازی میں بنیادی کردار، پیداواری عمل کو صاف شفاف اور معیاری بنانے کے لیے مختلف صنعتی اداروں میں ذمہ داریاں، فارمولا، آلات اور طریق کار وضع کرنا اور بہتری لانا، کیمیا یا اس کے کسی ذیلی شعبے میں آنے والوں

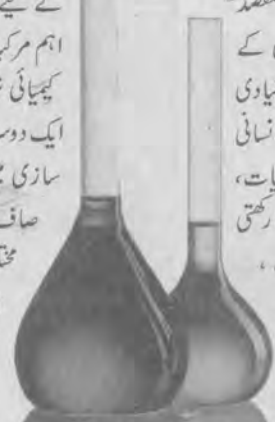

میں تجسس، تجزیہ، عملی بنیادوں پر متعین سوچ کے ساتھ ساتھ بہترین تجزیہ اور مضبوط قوت فیصلہ بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ الغرض کہیں اجزاء کو ملا کر کل (مرکب) کی شکل میں انسان کے لیے مفید بنایا گیا اور کہیں اس کل کو اجزاء میں تحلیل کر کے مفید بنایا گیا۔ اس نے کائنات کو حسن دیا، ترقی دی، استحکام اور دوام بخشا۔ یہ سب علم کیمیا کی دین ہے۔

فزکس سے متعلق مضامین

گریجوایشن اور پوسٹ گریجوایشن کی سطح پر پڑھائے جانے والے مضامین اور ذیلی مضامین کی فہرست یہ ہے:۔

کیمسٹری، اپلائیڈ کیمسٹری، آرگینک کیمسٹری، ان آرگینک کیمسٹری، میٹریل کیمسٹری، انڈسٹریل کیمسٹری، اینالیٹیکل کیمسٹری، ٹیکسٹائل کیمسٹری

فزکس (Physics)

آپ اگر اپنے روز و شب پر غور کریں، صبح سے شام اور رات کا اندازہ کریں، آپ کے کام آنے والی ہر چیز اور آپ کو سہولت پہنچانے والی ہر دریافت کا تانا بانا فزکس کے ساتھ جڑے گا۔ خواہ وہ گھریلو استعمال کی مشینری ہو یا ذرائع آمد و رفت، کاروبار دنیا کو چلانے والے سارے آلات ہوں یا انسانی تفریح کے لیے استعمال ہونے والا ساز و سامان ہو۔ اسی طرح اگر آپ اپنے سے ذرا دور اور کھلی کائنات کا مشاہدہ کریں تو معلوم ہوگا کہ سورج، چاند، ستاروں اور سیاروں کی ساری دنیا، آسماں کی وسعتوں میں پھیلا یہ جہان، سمندروں کی دنیا اور نسیم بحری کا چلنا، آواز کے زیر و بم اور آئینے میں رخ زیبا کی جھلک کیونکر نظر آتی ہے۔ الغرض اس آفاق کی اشیاء کی حقیقت اور اس کا فہم اور بالآخر قدرت کے اس کارخانے کی تسخیر فزکس کی انتہا ہے۔ یہ سب کچھ مادہ اور توانائی کی مختلف خصوصیات کا مطالعہ ہے اور باہمی تعلق کی بنیاد پر واقع ہونے والی ہر تبدیلی کے نتائج ہی ہیں۔

ہر چیز کی مقدار اور خصوصیات کا تعین بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مقدار، وقت، لمبائی، چوڑائی، شدت، رفتار، حجم، قوت، حرارت اور برقیات وغیرہ میں سے کسی کی بھی ہوسکتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک معیار کا تعین بھی

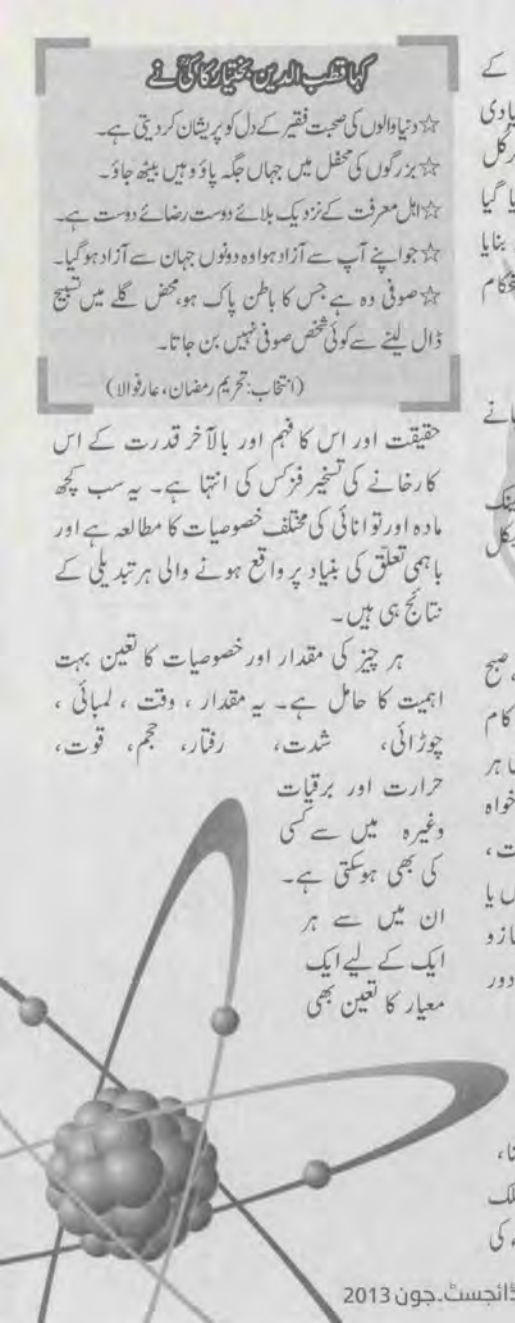

کہا قطب الدین بختیار کاکیؒ نے

☆ دنیا والوں کی صحبت فقیر کے دل کو پریشان کر دیتی ہے۔

☆ بزرگوں کی محفل میں جہاں جگہ پاؤ وہیں بیٹھ جاؤ۔

☆ اہل معرفت کے نزدیک بلائے دوست رضائے دوست ہے۔

☆ جو اپنے آپ سے آزاد ہوا وہ دونوں جہان سے آزاد ہو گیا۔

☆ صوفی وہ ہے جس کا باطن پاک ہو، محض گلے میں تسبیح ڈال لینے سے کوئی شخص صوفی نہیں بن جاتا۔

(انتخاب: تحریم رمضان، عارفوالا)

ضروری ہے۔ اس کائنات میں بے شمار چیزیں حرکت کررہی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر کیا، کیوں اور کیسے کے سوالات ابھرتے ہیں۔ اسے ہم مکینکس کا نام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ قوت اور حرکت کے باہمی تعلق، ان کے مومینٹم اور رگڑ کا تجزیہ، استحکام اور ہر طرح کی صورت حال میں توازن کا مادہ قائم رکھنا ہے۔ کام کا حقیقی تصور، طاقت کا موازنہ اور کام کی صلاحیت کا درست تجزیہ اور اس کے مطابق مشینوں کا میکنزم تیار کرنا، مشینوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا اور معاشرے کے لیے مفید بنانا۔ مادہ کی خصوصیات کا مطالعہ خواہ وہ ٹھوس، مائع یا گیس کی حالت میں ہو، اور مختلف اشیاء کے بننے میں اس کا کردار اس کائنات کے نظام میں حرارت کا کردار مسلمہ ہے، اس کی مختلف جہتیں اور سمتیں کیا کیا ہیں؟ یہ سب ماہرین طبیعات کی خاص دلچسپی کے متقاضی ہیں۔

ہم اپنے گھر میں بیٹھے ٹی وی چینلز کے ذریعہ دنیا بھر کی خبروں سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح انٹرنیٹ نے تو بالکل ہی دنیا کو ایک عالمی گاؤں بنا دیا ہے۔ ان سب کے پیچھے ماہرین طبیعات کی جدو جہد موجود ہے۔ انہوں نے ہی سیٹلائٹ کے ذریعہ یہ سب کچھ ممکن بنایا ہے۔ پاکستان میں اس وقت فزکس کی تعلیم ہر سطح پر عام ہے اور ملک کے ہر خطے میں دستیاب ہے۔

مضامین

گریجوایشن اور پوسٹ گریجوایشن کی سطح پر پڑھائے جانے والے مضامین اور ذیلی مضامین کی فہرست یہ ہے۔

فزکس، کمپیوٹیشنل فزکس، سپیس سائنسز، سالڈ سٹیٹ فزکس، ہائی انرجی فزکس، نیوکلیئر فزکس، آسٹروفزکس، نینوٹیکنالوجی، اپلائیڈ فزکس وغیرہ ■■■

یوسف الماس

ممبر امریکن سائیکالوجیکل ایسوسی ایشن ممبر نیشنل کیریئر ڈویلپمنٹ ایسوسی ایشن فیلو، رائل سوسائٹی آف میڈیسن برطانیہ

پاکستان میں کیریئر پلاننگ کے پہلے ادارے ایجوویژن (Eduvision) کے بانی ہیں۔ چالیس ہزار سے زائد طلبہ و طالبات کی کیریئر کونسلنگ اور ان کے ذہنی رجحان و قابلیت کی پیمائش۔ ان خدمات سے پاکستان میں تعلیم کے خواہاں، یورپ، امریکا، کینیڈا اور عرب ممالک میں مقیم پاکستانی اور غیر ملکی طلبہ و طالبات نے بھی استفادہ کیا۔ یوسف الماس نے قومی و بین الاقوامی اسکولز، کالجز اور یونیورسٹیز میں تقریباً 200 سیمینارز، ورکشاپس اور معروف اخبارات و جرائد میں 90 سے زائد آرٹیکلز کے ذریعے طلبہ و طالبات، والدین واساتذہ، ماہرینِ تعلیم اور حکومتی نمائندوں کو کیریئر پلاننگ کی ضرورت و اہمیت سے آگاہ کیا اور انھیں میٹرک سے پی ایچ ڈی تک کی تعلیمی معلومات آسان، جدید اور سائنٹیفک انداز میں فراہم کیں۔ وہ پی ٹی وی نیوز کے ہفتہ وار پروگرام ''کیریئر ویژن'' سے بطور کیریئر ایڈوائزر بھی منسلک رہے اور انہوں نے سو سے زائد کیریئرز پر طلبہ، طالبات اور والدین کی تعلیمی اور پروفیشنل رہنمائی کی۔

طنز و مزاح

ایسی خوب صورت تحریر کہ آپ داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے

سوزشِ جگر سے سوزِ جگر تک

ایک حکیم صاحب اور ان کے دوستوں کا پرلطف ماجرا حکیم صاحب کرید کرید کر ایسے ایسے سوال کرتے کہ مریض پہلے چوکنا پھر حواس باختہ اور آخر میں برانگیختہ ہو جاتا

مبشر الحق عباسی

سیف دواخانہ علاج معالجہ کی نسبت راستے بتانے کے حوالے سے زیادہ مشہور تھا کیونکہ علاقے کی قدیم ترین دکان ہونے کے ناطے مقامی لوگ اجنبیوں اور شاذونادر اِدھر آنے والے قریبی رشتہ داروں کو اس کے منفرد بورڈ کے حوالے سے گھر کا راستہ سمجھاتے تھے۔ بورڈ اس لحاظ سے منفرد تھا کہ باقی دکانوں پر اجلے حروف میں کمپیوٹر سے ٹائپ شدہ رنگین پینا فلیکس (Pana Flex) سے بنے بورڈ آویزاں تھے اور حکیم سیف کی دکان، معاف کیجئے گا دواخانے کی پیشانی پر خط نسخ میں ہاتھ سے لکھے بڑے بڑے الفاظ ''حکیم عظمت اللہ میرٹھی'' اور دوسری سطر میں ''سیف دواخانہ'' اس دور کی یاد دلاتے جب بورڈ صرف سیاہ اور لکھائی سفید ہوا کرتی تھی۔ ابھی سفید بورڈ کو سیاہی سے گہنانے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ بائیں جانب 1350ء نسبتاً چھوٹے الفاظ میں لکھا دواخانے کے قیام اور اس دور کے زوال کا سَن بتلا رہا تھا۔

گردوغبار اور دھوئیں کے نجانے کتنے طوفانوں کے بعد سیاہی سُرمئی رنگ میں

اور سفید رنگ زرد رنگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اتنا زرد اور سُرمئی کہ تیز بارش کے بعد بھی اصل رنگ واپس نہ آتے۔

حکیم سیف کے دوست تحسین خان جب بھی اس دواخانے کو دکان کہتے تو حکیم صاحب برہم ہو جاتے۔ کہتے بدبخت آج دواخانے کو دکان کہتا ہے کل کلاں مدرسے کو بھی دکان کہے گا۔ آڑھتیوں منافع خوروں اور حکماء وعلماء میں کوئی فرق تو روا رکھ۔ تم ہی وہ لوگ ہو جو روشنائی کو سیاہی کہتے ہیں۔

تحسین بھی ایسی ڈانٹ ڈپٹ کے عادی تھے کہ انکے پاس شام گزارنے کیلئے اس کے علاوہ کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ یہی نہیں بلکہ شمس الدین اور جوزف برائن بھی ملازمت کے اوقات کے علاوہ دواخانہ بند ہونے کے وقت تک حکیم سیف کے ساتھ ہی رہتے۔ صبح شام کی رفاقت اس بورڈ جتنی پرانی تو نہیں البتہ صرف چند برس ہی کم تھی۔ تحسین حکیم سیف کے ہم مدرسہ بلکہ ہم جماعت تھے اور یہ بات بڑے فخر سے بتاتے کہ ہم دونوں اکٹھے مرغا بنتے تھے۔ جس کے بارے میں شمس کہتے تھے کہ اسکے بعد سیف تو انسان بن گیا لیکن تحسین ارتقائی عمل سے گزر کر گدھا بن گیا۔ اِن دوستوں کی تمام محفلیں ایسی نوک جھونک سے سجتیں اور قہقہوں سے گونجتیں۔ جوزف برائن سفارتخانے میں ملازم تھے اور اس علاقے میں کئی دہائیوں سے آباد تھے۔ شمس الدین یوپی کے کسی غیر معروف قصبے سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے اور کسی بڑی کمپنی میں اکاونٹس کے شعبے سے وابستہ تھے۔ تحسین گورنمنٹ ملازم تھے جنہیں حکیم سیف نمک حرام ملازم کہتے تھے کہ وہ گورنمنٹ کی پالیسیوں پر برمحل وبے محل لیکن بے رحم تنقید کے عادی تھے۔ اس معاملے میں وہ حکیم صاحب کو بھی نہ بخشتے۔ کہتے تھے یہ سیف دواخانہ دراصل انگریزی Un-safe دواخانہ ہے۔ جس پر جوزف کہتا یار تحسین تمھارا نام تکذیب، تکفیر یا تنقید ہونا چاہئے تھا۔ نام اور شخصیت میں اتنا تضاد پہلے نہیں دیکھا۔ حکیم صاحب بھی اپنی متانت اور بردباری کے باوجود کسی پر چوٹ کرنے سے باز نہ آتے۔ ایک دن شمس الدین سے کہنے لگے تمہارے اعمال کی سیاہی کم ہے جو تم ہر اتوار کو منہ کالا کر کے آجاتے ہو۔ غضب خدا کا پچاس کے پیٹے میں جھریوں بھرے ہاتھوں سے کالا خضاب، مجھے تو ایسے لوگ جوان سے زیادہ بچے لگتے ہیں۔ سر کالا ہے اور سوچ تاریک، ظاہر جوانوں کی طرح اور خیالات دقیانوسی، جسم میں زندگی کی رمق نہیں اور دل عمر رفتہ کے فتنوں میں گرفتار ہے۔ فطرت مصر ہے کہ آپ کی جوانی کی سیاہی کو بزرگی کی سپیدی میں بدل دے اور آپ ہیں کہ اندھیرے میں ہی خوش ہیں۔ لیکن حکیم یہ بتا کہ چالیس سال بعد انسان بن باس لے کر پیپل کا درخت تلاش کرے اور اُس کے نیچے آسن مار کر بیٹھ جائے کیا؟ اسے حق نہیں کہ جوان اور توانا نظر آئے؟ تحسین بولے۔ ارے سیاہ کار (ہر خضاب لگانے والے کے لئے حکیم صاحب کے پاس یہی اصطلاح تھی) جوانی جسمانی توانائی کا نام ہی نہیں خیالات کی ندرت، عمل کی بے باکی اور سوچ کے بانک پن کا نام بھی ہے۔ مایوس شخص تو بیس برس کا بھی ہو تو بوڑھا ہے اور انداز فکر میں جدت اور پُر امیدی ہو تو ستر برس کا بزرگ بھی جوان ہے۔ جسم کی جھریوں کو تو کپڑے سے چھپایا جا سکتا ہے لیکن سوچ کی سلوٹیں الفاظ سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ قدرت آپ سے کہہ رہی ہے کہ لوگوں کو امید اور عمل کا سبق دو اور آپ ہیں کہ خود دولھا بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اسکی ناممکن تعبیر کے منتظر ہیں۔ سینے میں ریشہ، ہاتھ میں رعشہ اور اس پر منہ کالا۔

یہ زبانی چپقلش بے باک اور بے مہر ہوتی مگر نشتر کے گھاؤ کی طرح گہری نہیں بلکہ پھانس کی معمولی چبھن سے بھی کم، جس کے نکلنے کے بعد نہ اسکا نشان باقی رہتا ہے نہ جگہ یاد رہتی ہے۔

اس دیرینہ رفاقت، جو اکثر رقابت محسوس ہوتی اب کئی دہائیوں پر محیط تھی۔ شب وروز اکٹھے گزارنے سے باقی تینوں دوست بھی نیم حکیم تو ہو ہی گئے تھے۔ بلکہ از راہ مذاق کہتے کہ سیف تو خود نیم حکیم ہے ہم اسکے ساتھ رہ کر ثلث حکیم ہو گئے ہیں۔ ان میں مرض شناسی تو نہ آسکی لیکن مریض شناس تھے جانتے تھے۔ کہ حکیم صاحب نے کسے کون سی دوا دی تھی۔

حکیم صاحب قدامت کا نمونہ نظر آتے لیکن جدید طریقوں سے آشنا بھی تھے۔ ہر مریض کا ریکارڈ ایک بوسیدہ سے رجسٹر پر تحریر کرتے۔ باپ دادا کے نام، جائے پیدائش، جدی امراض، پڑوس کے امراض، خود مریض کا نام پتہ، سماجی تعلقات، ازدواجی زندگی، ملازمت، پیشے کا اندراج اور آمدنی لکھتے۔ نسخے پر اپنا عربی وفارسی الفاظ کا کوڈ بھی تحریر کرتے اور آئندہ مریض کے آنے پر فوراً مطلوبہ صفحہ سامنے رکھ کر بات کا آغاز کرتے۔

کہتے تھے آبادی بڑھ رہی ہے اور لوگ تنہا ہوئے جا رہے ہیں۔ ذرائع آمدورفت ہیں کہ انکی سبک رفتاری سے تخت سلیمان شرمائے اور دل ہیں کہ اتنے

اصیل مریض

دواخانہ رات دیر تک کھلا رہتا کیونکہ اصل مریض جسے حکیم صاحب اصیل مریض بھی کہتے تھے، عشاء کے بعد ہی آتے۔ یہ دکاندار اور درمیانی و بالا افسران کا طبقہ تھا جو اپنے کاروبار زندگی سے فارغ ہو کر یا ڈاکٹروں کی سطحی تشخیص سے مایوس ہو کر یا ہر دو وجوہات کی بناء پر حکیم صاحب سے رجوع کرتا۔ محرم کے چند دن دواخانہ مکمل طور پر بند رہتا، کیونکہ روایتی طور پر اس بازار سے جلوس گزرتا۔ دس محرم کو حکیم عظمت اللہ مرحوم کی شروع کردہ روایت کے مطابق شرکاء جلوس کیلئے زعفرانی دودھ تقسیم کیا جاتا۔ کئی دہائیوں قبل شروع کی جانے والی دودھ کی سبیل اب گڑ کے شربت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ لیکن یہ روایت اس نئے روپ ومشروب کے ساتھ حکیم سیف نے زندہ رکھی۔ عید، بقرعید کی چھٹی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ حکیم صاحب کا خیال تھا کہ یہی تو دن ہیں جب انسانی ہوس اپنے عروج پر ہوتی ہے اور امراض کا سبب بنتی ہے۔ رمضان میں روزے، افطار اور تراویح کے وقفے کے بعد دواخانہ کھولتے۔ حکیم صاحب دور جدید کی ایجادات، ان کے استعمال اور خون خرابے کے علاوہ خون خرابی یعنی خون کی سفیدی سے بھی نالاں رہتے۔ کہتے تھے ہمارے خطے کے امراض، مسائل اور علاج ہی بدل ڈالے ہیں اس افرنگی یلغار نے۔ پہلے اکھاڑے میں کشتی ہوا کرتی تھی۔ کسی کی ہڈی ٹوٹ گئی، کسی کا بازو کھسک گیا کسی کی ٹانگ میں بل آگیا اور اب دیکھو انگلی کے پور جتنی گولی بازو سے داخل ہوئی پسلی سے پار نکل گئی۔ اب کیجئے ہلدی پھٹکری سے علاج۔ پہلے صرف انگارے سے انگلی جل جاتی تھی اب ذرا ڈیزی کٹر (Daisy Cutter) سے مکمل جھلسنے کا علاج تلاش کیجئے۔

دور کہ اوج ثریا کو مات ہے۔ سو کہنے کو تو یہ دنیا گلوبل ولیج (Global Village) ہے لیکن جسم نزدیک ہوتے جارہے ہیں اور انسان دور۔ قرابت داروں میں قربت نہیں، دوستی مروت اور ایثار کی بجائے give and take کے ستونوں پر کھڑی ہے۔ اولاد والدین سے نالاں ہے کہ وہ انکی تندو تیز ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ والدین اولاد سے مایوس کہ یہ بچے خود اپنی ذات کا سہارا بن رہے ہیں۔ بہت لائق اٹھ گئے تو ہمارے اخراجات کی ذمہ داری لے لیں گے، مگر یہ یقینی بات ہے کہ ہم ان کی صورت کو ترسیں گے۔ اولاد بھی Facebook، موبائل فون کو اپنا نعم البدل سمجھ کر والدین کو نئی ٹیکنالوجی کی افادیت کی تربیت دیتی رہتی ہے۔ مگر انہیں کون بتائے کہ انکے چہرے کے لمس اور ہاتھوں کی گرمی میں والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ نئی نسل کو اپنے مائیکرو اور نینو سیکنڈ بچانے کا خبط ہے۔ نادان بھول جاتے ہیں کہ انکی تمام زندگی کا حاصل بھری جیب اور ایک تشنہ روح ہوگی۔ تمام سفر دولت اور سنہری مواقع کی پگڈنڈیوں پر کرتے گزار دیں گے یہ لوگ۔ بخدا بزرگ مریضوں کی اکثریت اسی مرض جدائی میں مبتلا ہے، انہیں تو کوئی خاص دوا کی ضرورت نہیں ہوتی، مجھے البتہ فشار خون کی دوا کھانی پڑتی ہے ان کا حال سن کر۔ میں تو اس قربانی سے کانپ جاتا ہوں کہ پہلے اپنا پیٹ کاٹ کر ان کو یہاں تک لائے اور اب اپنا دل کاٹ کر اپنے ہاتھوں سے آزاد کر رہے ہیں ہمیشہ کے لئے۔

ہمیشہ کے لئے کیوں؟ آغا حشر انگیز!! تحسین نے پوچھا۔ بھئی نیا چمن نت نئے طیور، انکی فغاں ہمارے

ہم مزاج مریضائیں

بعض مریض تو جاتے جاتے کہہ جا
صاحب اب تو آپ میرے بارے میں اتا
گئے ہیں کہیں مناسب رشتہ ہی کروادیں۔ حکیم
بھی شگفتگی سے جواب دیتے کیوں نہ
مریضائیں تمھاری ہم مزاج اور ہم کردار ہیں
گی۔ ضرور رشتہ کروادوں گا۔

لئے نغمہ سرور، انکے معاشرے کی تیرگی خیرہ
میں پنہاں اور چمک بھی ایسی کہ واپس آ
کے آگے اندھیرا ہی چھایا رہتا ہے۔ لہذا
وہاں چھوڑ آتے ہیں اور انکی راہ تکنے وال
یہاں رہ جاتی ہیں۔

حکیم صاحب مرض کی تشخیص بروزن م
تفتیش کرتے۔ کرید کرید کر ایسے سوالات
مریض پہلے تو چوکنا پھر حواس باختہ اور آخر میں
ہو جاتا۔ لیکن اس سے پہلے وہ اتنا کچھ بتا چکا
متعلق کہ اس کی بیوی اور ماں کو ملا کر بھی
معلوم نہیں ہوگا۔ جسمانی احوال و جغرافیہ، ما
معمولاتِ فطری، اہل خانہ سے تعلقات، ہ
گفتگو کا انداز، ذریعہ معاش، آمدنی و خرچ
مصروفیات، مذہب اور سیاست سے شغف
اور دوستوں سے میل جول، دوستوں کے
حدود، غرض جسم اور شخصیت کا کون سا گوشہ
جو تشنہ رہ جاتا ہو اس دوران حکیم صاحب کا ہا
مریض کی نبض پر رہتا۔

رشتہ کروانے کی ذمہ داری بھی ایک
اور پھر ایسا کانوں کو ہاتھ لگایا کہ اب

اصرار پر بھی نکاح پڑھانے یا رشتہ کروانے کی حامی نہیں بھرتے۔ کئی برس قبل ایسے ہی کسی مریضِ دل نوجوان کا نکاح اپنے تینوں رفقاء کار کو گواہ بنا کر پڑھا دیا تھا۔ لڑکی والوں نے اغواء کی رپورٹ درج کرادی۔ زوجین عجلت میں دوسرے شہر کو سدھارے اور ان چاروں نے رات جیل میں بسر کی۔ اس واقعہ کے بعد ہی یہ اپنے آپ کو ہم پیالہ اور ہم نوالہ کہنے لگے۔ جس پر جوزف یاد کرواتا کہ بستر اور کنستر بھی ایک ہی تھا۔ جسکا ذکر تحریر و تقریر پر گراں ہونے کے سبب عوام میں نہ کیا جاتا۔ اس مکمل واقعے کو یہ فوجداری ہی مون کہتے، جس میں ان چاروں کے حصے میں صرف فوجداری آئی۔

جگر بھی اہم ہے لیکن میرے ماموں، استاد اور مربی حکیم عظمت فرماتے تھے کہ مرض کی تشخیص کرنے کیلئے مریض کی ظاہری علامات میں نہ الجھو۔ تپتے جسم کی حرارت اس کی دوزخ نما زندگی میں تلاش کرو۔ پھولتا سانس اس بات کی نمازی کرتا ہے کہ اسکے روز وشب سنگلاخ میدانوں میں جدوجہد کرتے گزر رہے ہیں۔ آنکھوں کے آگے چھایا اندھیرا اسکی قسمت کی تاریکی بھی ہوسکتا ہے۔ دل کا نامانوس ارتعاش ان دھکوں اور ہچکولوں کے سبب بھی ہوسکتا ہے جو بچپن سے لیکر آج تک اسے لگے ہوں۔ ہر مرض کی جڑ انسان کی روح میں پیوست ہوتی ہے۔ بدزبان اور بسیار گو بک بک کر یہ جڑ تھوکتے رہتے ہیں اور دوسرے ضبط کرتے ہیں اور آخر میں خون تھوکتے ہیں۔

حکیم سیف اس حوالے سے علاقے میں حکمت سے زیادہ ہمدری و شفقت کیلئے مشہور و معروف تھے۔ ماموں کی تربیت اور کریمانہ فطرت کی بنا پر دن میں خواتین اپنے بچوں کی دوا لینے آتیں تو اپنے روز مرہ

نبض جھوٹ پکڑنے کا آلہ

تحسین کہتے ہیں کہ سیف خاندانی حکیم نہیں بلکہ خاندانی راز دان ہیں۔ لوگ ان کے ہاتھوں بلیک میل ہوکر ہر ماہ بھتہ دینے آتے ہیں، مصنوعی زکام اور کھانسی کا بہانہ کرکے۔ سیف! یہ بتا کہ تو مریض کا ہاتھ اتنی دیر تک پکڑ کر کرتا کیا ہے؟

حکیم صاحب بولے یہ نبض جھوٹ پکڑنے کا آلہ ہوتی ہے۔ مریض کے دل کی ایک بے ہنگم دھڑکن وہ کچھ کہہ دیتی ہے جو مریض خود بھی نہیں کہتا۔

تحسین بولے، ارے جالینوس! (جسے وہ جعلی کے وزن پر ادا کرتے) مگر تمھارے قبیلے میں تو جگر ہی تمام امراض کی آخری اور پہلی جائے پیدائش ہے پھر اتنی تحقیق کی کیا ضرورت؟

جھگڑوں کی پوٹلیاں بھی اٹھا لاتیں۔ حکیم صاحب بچے کی دوا اور غذا کی ہدایات کے علاوہ اس کی ماں باپ، ساس نند اور چچا، چچی کی دوائیں بھی بنا ڈالتے۔ اور بتاتے کہ یہ چڑ چڑ اہٹ اور غصے کی وجہ سماجی نہیں جسمانی ہے۔ سمجھاتے، کہ دیکھو تمھارے میاں کے پیٹ میں گرانی ہوگی تو سر میں درد ہوسکتا ہے۔ سر میں درد ہوگا تو وہ کام کرنے نہیں جائے گا۔ گھر میں رہے گا تو لامحالہ کسی نہ کسی بات پر اعتراض کرے گا۔ سو اس کے پیٹ کا علاج کراؤ۔ اعتراض اور لڑائی تک بات ہی نہیں جائے گی۔

حکیم کی اس منطق سے تحسین بہت جھنجھلاتے۔ کہتے اس نیم حکیم کا فلسفہ دیکھو۔ مریض مرض سے ہلکان ہو تو اسکی نفسیاتی وجہ بتا کہ دم درود پر لگا دیتا ہے۔ سماجی مسئلہ پیش کرتے ہیں تو اسے جسمانی مرض بتاتا ہے اور

معجون تجویز کرتا ہے۔ ذرا فرمائیے کہ مسلمانوں کی اس پستی کا علاج کسی معجون سے ہوگا؟ حکیم صاحب اس طنز سے دامن بچاتے ہوئے سنجیدگی سے بولے، خوش خوراکی سے پرہیز یعنی سادہ غذا کا استعمال اور بعد از نماز فجر سیر۔ اگر مسلمان صرف سادگی اپنا لیں تو کایا پلٹ جائے گی۔ اور باقی چار نمازیں کیا ہوئیں؟ تحسین نے پوچھا۔

میاں جو شخص فجر کے وقت اٹھے گا تو اس نے مشکل ترین مرحلہ تو طے کر لیا باقی نمازیں تو نسبتاً آسان اوقات میں ہیں۔ اور جو فجر کو اٹھنے کا ارادہ کرے گا تو عشاء کے بعد جلدی سوئے گا۔ یہی وقت لغویات میں مشغولیت کے عروج کا ہے۔ غرض لغویات سے بچا، اچھی نیند پوری کی، کچھ سیر کی، اب خوش خوراکی سے بھی اجتناب کر لے تو سبحان اللہ۔

خیر مجھے بھی اتفاق ہے کہ اقبال کا شاہین اب فارمی بٹیر بن چکا ہے لیکن اس بڑے کام کا بیڑا کون اٹھائے؟

حکیم صاحب بولے اشرافیہ اور کون۔ وہ جن پر اللہ کے انعامات ہیں۔ جائیداد ہے۔ ماہانہ خرچے کی فکر نہیں۔ وقت استعمال کرنا جانتے ہیں۔ عہدہ ہے۔ سیاسی و سماجی قوت ہے۔ دوسرے ممالک کی ترقی اور اس ترقی کے راز سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ ان نعمتوں کی زکوٰۃ نکالیں۔ ان نعمتوں میں دوسروں کو شریک کریں۔ اس دھرتی کا قرض ادا کریں چاہے یہاں رہ کر چاہے کسی اور ملک میں رہ کر۔ ہوگا تو وہ جو اللہ باری تعالیٰ چاہے لیکن سعی میں برکت تو وہی دے گا۔ بازی تو وہ لے جائے گا جو اس امت کا مقدر سنوارنے کی کوشش کریگا۔ ابتک جس نے اس کام میں جان لگائی، شہید کہلایا۔ مال لگانے والا سخی و دریا دل مشہور ہوا۔ جس نے جان و مال اور کچھ وقت لگایا حواری اور صحابی کہلایا اور جس کو اللہ نے جان مال کی زندگی کے ساتھ منتخب کر لیا وہ رسول کے نام نامی سے محترم ہوا۔

تحسین کہنے لگے حکیم پڑھے تو ہم ایک ہی سکول

افسران بالا اور زوجہ کا غصہ

میری جان جڑ کو پکڑو۔ یہ جگر میں نہیں دل و دماغ کے اندر کہیں ہوتی ہیں۔ تحسین مبہوت رہ گئے۔ کہنے لگے یار! یہ حکیم عظمت تو بڑی غضب کی شخصیت تھے۔

ہاں بس یہ سمجھو کہ اپنے علاقے کے لوگوں کو انکے دادا پردادا کے امراض سمیت جانتے۔ نواسوں پوتوں کو انکے خاندانی امراض سے آگاہ کرتے اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی نصیحت کرتے۔ علاقے کے تھانیدار بھی ملزم کو میڈیکل چیک اپ کی بجائے تفتیش کیلئے تھانے سے پہلے انکے دواخانے لاتے۔ کہ یہ معصوم ہے کہ خطا وار۔ حکیم صاحب چند سوالات کے بعد بتا دیتے کہ اس نے کھانا کیا کھایا، کب کھایا اور کس جگہ کھایا۔ یہ کس وقت کیا کر رہا تھا۔ اگر شک ہوتا تو تھانیدار کو ہدایت دیتے کہ اسکے سونے جاگنے اور بیت الخلا جانے کے اوقات سے مطلع کرو اور یوں حکیمی تفتیش سے ثابت ہو جاتا کہ ملزم وقت واردات کہاں تھا۔ گھر پر یا موقع واردات پر۔ اس کے بعد تھانیدار اپنی تسلی یا قانونی ضرورت پوری کرنے یا ہاتھوں کی خارش دور کرنے یا افسران بالا اور زوجہ کا غصہ ملزم پر نکالنا چاہتا تو اسے آزادی تھی۔

میں تھے۔ یہ علم تم میں کہاں سے آ گیا؟ حکیم صاحب بولے تمھاری صحبت و گفتگو سے۔ علم و عرفان بلکہ وجدان بھی اسی کا مرہون منت ہے۔ تحسین نے پوچھا یار سیف! کیا واقعی؟ شمس بولے گھاس کھا گیا ہے کیا؟ سیف کہہ رہا ہے کہ عالم جاہلوں سے ہی سیکھتے ہیں ان کے عمل کے مخالف عمل کر کے۔ حکیم صاحب مسکرا کر چپ ہو گئے۔ سیف دواخانہ قدامت کی یادگار تھی۔ اردو، ہندی، فارسی اور عربی الفاظ و تراکیب سے مزین ٹین کے ڈبے جن میں سے اکثر خالی تھے۔ کچھ محلول جو خشک ہو کر سفوف بن چکے تھے۔ بہت سے معجون جو خشک ہو کر نئی ہیت ترکیبی کے مرحلے سے گزرے اور کھنگ وار ٹھیکریاں بن گئے تھے۔ دوائیں بنانے کا جو قدیمی کام شمس الدین، جوزف اور ایک کل وقتی ملازم کے ہاتھ تھا۔ خالی ڈبے کے کونوں میں چند تولے وزن کی کوئی بوٹی، کوئی پتھر نما ٹھوس مادہ، کسی میں مختلف اقسام کے بیج کہیں خشک پھولوں کی بکھری پتیاں، غرض بادام اخروٹ کے علاوہ ان کے چھلکے اور ایسی نباتات اور بیج موجود تھے جن میں سے اکثر کی نسل معدوم ہو چکی تھی۔ تحسین اسے نباتاتی میوزیم یا Botanical Archives بھی کہتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک دوا کا ڈبہ ایک مکمل تاریخ رکھتا تھا۔ حکیم سیف کو نہ صرف اسکے خواص سے آگہی تھی بلکہ اس جدوجہد کی داستان بھی ازبر تھی جس کے نتیجے میں یہ حاصل ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بھی کبھی ترنگ میں آ کر یہ داستانیں تازہ کرتے رہتے۔ جسے شمس الدین "Thousand and one nights" کا نام دیتے۔

برائلر مرغی اور امتِ مسلمہ

ویسے اس دور کی خوش خوراکی سے مراد مرغ خوری کے علاوہ کچھ نہیں۔ ذرا یہ بتاؤ کہ وہ جاندار جو پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکتی، پروں سے اڑ نہیں سکتی دب جائے تو احتجاج نہیں کر سکتی، مر رہی ہو تو شور نہیں کر سکتی۔ ہمسائی اور عزیزہ مر جائے تو ماتم نہیں کرتی۔ کیا ہے؟ بولو؟ حکیم صاحب نے پوچھا۔ "برائلر مرغی" تحسین فوراً بولے۔ نہیں جناب امت مسلمہ۔ حکیم صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔

حکیم ہنری کسنجر! آپ یہ فرما رہے ہیں کہ یہ سب کچھ برائلر مرغی کھانے سے ہوا ہے کہ ہم میں بحیثیت امت مرغی کے خصائص آ گئے ہیں۔ لیکن برائلر مرغی تو پچاس برس پہلے تھی ہی نہیں اور زوال کی مدت تو 500 برس سے زائد ہے۔ تحسین بولے، میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ امت دیسی مرغی کھائے تو حب الوطنی پیدا ہوگی یا دیسی لہسن کی چٹنی سے روحانیت بلند ہوتی ہے۔ میں تو طرز فکر اور طریقہ رہن سہن میں تبدیلی کی بات کر رہا ہوں۔ ہر شخص اپنا محاسبہ کرے۔ ہر ماہ کے خرچے کا تجزیہ کرے۔ اصراف نکال باہر کرے اور اخراجات پر دھیان رکھے۔ دیسی چیزوں کا استعمال کرے۔ اب لگائے کوئی تجارتی پابندیاں یا کرے معاشی بائیکاٹ۔ پھر تو یہ ایسا ہی ہوا کہ کوئی مجھے یا تمھیں دھمکی دے کہ فلاں کام نہ کیا تو شراب اور سور کی سپلائی بند کر دوں گا۔

تحسین ذرا سوچوں میں گم ہوئے۔ کہنے لگے معاف کرنا میں تمھیں ہنری کسنجر کہہ گیا۔ دراصل اس وقت مجھے نیلسن منڈیلا کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔

خالی ڈبوں سے دوا کے ختم ہونے کے بعد بھی انکی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ جن کے بارے میں حکیم صاحب کہتے کہ اب وہ امراض ہی بدل گئے ہیں جن کی یہ ادویہ تھیں۔ اب پرانے مسائل ہیں لیکن خوراکیں نت نئی اور امراض پیچیدہ ہیں۔ اس سے بڑھ کر مریض کی معلومات زیادہ، علم واجبی اور بے چینی و بے صبری بے حساب۔ جب تک چار پانچ ٹیسٹوں پر کئی ہزار روپے خرچ نہ کر ڈالے تسلی ہی نہیں ہوتی۔ پرانے مسائل کا انداز بدلا ہو تو ہو لیکن نوعیت وہی ہے۔ وہی انسان وہی رشتے وہی تخیل کی پستی، وہی گمراہی۔ کہتے تھے مجھے یقین ہے اہرام مصر کی دیواروں پر ساس بہو کے جھگڑے کی تصویر اور بابل کی مٹی کی تختیوں پر نند بھابی کی چپقلش کی تحریر ضرور ہوگی۔

حکیم صاحب کا طریقہ علاج دواؤں پر ہی منحصر نہیں تھا بلکہ پرہیز اور خوراک میں تبدیلی اور اس سے بڑھ کر روزمرہ معمولات اور معاملات کی بنیاد درستی کی تھا۔ شمس الدین کہتے تھے کہ حکیم صاحب کے پاس آنے والے اکثر مریض صحت مند ہونے کی بجائے تائب ہو کر جاتے ہیں۔

حکیم صاحب بھی مریض سے اتنی شفقت آمیز گفتگو اور تفتیش کرتے کہ اسے اپنے مرض سے زیادہ اپنی ذات سے آگہی ہو جاتی۔

رہی بات دواؤں کی افادیت کی تو ایک روز شمس الدین دیسی ادویہ اور انگریزی ادویہ کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ حکیم صاحب نے ایک ماشہ معجون چکھنے کیلئے دی۔ باتوں باتوں میں شمس الدین اسے نگل تو گئے مگر پھر زبان ایسی سن ہوئی کہ بڑ بڑاہٹ کے سوا کوئی بات ہی نہ نکلی۔ اس پر سوا یہ کہ حکیم صاحب نے

حکیم کا رجسٹر یا ہسٹری شیٹ

جوزف برائن کہتا تھا کہ ہمارے چرچ میں بھی ایک ایسا کونہ گناہوں کے اعتراف کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کی دکان بھی یہی کام کرتی ہے۔ ویسے بھی یہ نفسیاتی و روحانی تھراپی شاذ و نادر ہی ناکام جاتی۔ حکیم صاحب کہتے تھے کہ ہم دوا نہیں بیچتے، دوائے دردِ دل کرتے ہیں۔ سوزش جگر کا علاج نہیں کرتے۔ سوز جگر کا ساماں کرتے ہیں۔ نبض پر ہاتھ نہیں رکھتے مریض کا ہاتھ تھامتے ہیں اور اس بات کے قائل تو انکے سب دشمن یعنی تینوں دوست بھی تھے۔ حکیم صاحب کی دکان کے وسط میں اونچا تخت اور اس پر ناریل کی چھال کی گدی تھی جس پر حکیم صاحب قیلولہ فرماتے تو گدا سمجھ کر نیم دراز ہو جاتے۔ ذرا سی اونگھ آئی اور کوئی مریض نمودار ہوا۔ حکیم صاحب بھی نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے۔ پہچان لیتے تو مغرب کے بعد کا وقت دے دیتے۔ نو وارد ہوتا تو اٹھ بیٹھتے اور تشخیص و تفتیش شروع ہو جاتی۔ تمام ریکارڈ بھورے رنگ کے جزدان نما کپڑے میں لپٹے رجسٹر میں اور حکیم صاحب کے دل میں نقش ہوتا جاتا۔ یہ رجسٹر علاقے اور وہاں کے باسیوں کی ہسٹری شیٹ سے بھی بڑھ کر تھا۔ گویا انسان کی بشریت، انسانیت، حیوانیت اور عبودیت سب کچھ یکجا تھی۔

کسی کی اولاد کی نافرمانی کا ذکر، بچوں کی یتیمی کی تاریخ، پیدائش کی تاریخ و احوال و ضرورت، شادی کے حالات، مجبوری اور کیفیات۔ غرض، جسمانی کوائف اور سماجی اذکار اسی رجسٹر سے مل جاتے۔

اگلے روز سب کو مٹھائی کا ایک ڈبہ پیش کیا۔ دوستوں نے پوچھا کہاں سے آیا ہے تو فرمانے لگے شمس کی بیگم دے گئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں ہر ماہ ایک خوراک دے دیا کریں انہیں۔

حکیم صاحب اخبار کے مطالعے کے شوقین تھے۔ بسم اللہ پڑھ کر خبر پڑھتے مگر فلمی صفحہ پڑھتے ہوئے لاحول کا ورد پہلے خفی پھر جلی انداز میں کرتے۔ تحسین کہتا ثم فلمی صفحہ پڑھتے ہوئے لاحول کی تسبیح پڑھ جاتے ہو۔ آخر چار ایکٹر سوں کیلئے چار بار لاحول کیوں کافی نہیں ہو سکتی۔ فرماتے، تحسین! ہر فلمی خبر اور سکینڈل پر پچیس بار سے کم لاحول پڑھوں تو وہ قصہ میرے دماغ میں ہی گھومتا رہتا ہے اور دو بار سے کم سکینڈل پڑھوں تو اخبار کے پیسے ہی وصول نہیں ہوتے۔

اپنی جوانی سے پری چہرہ نسیم اور مدھوبالا پر فریفتہ تھے۔ تحسین کا خیال ہے کہ حکیم صاحب کے گلے میں پڑا تعویز دراصل مدھوبالا کی تصویر کا چرمی فریم ہے۔

ایک روز تینوں اپنے اپنے دفاتر سے گھروں کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ حکیم سیف انتقال کر چکے ہیں۔ آنسوؤں کی لڑیاں پروتے دیر تک قبر پر بیٹھے رہے یہاں تک کہ تینوں تنہا ہو گئے۔ سرخ پھولوں کی پتیوں کے ڈھیر کے نیچے انہی کے دواخانے کے عرق گلاب سے تر بتر مٹی تھی۔ تحسین نے اپنی واسکٹ کی جیب سے بھورے رنگ کا ایک رجسٹر نکالا اور قبر کے ایک طرف جگہ بنا کر نرم و تر مٹی میں دبا دیا۔ مٹی کی تری رجسٹر میں جذب ہونے لگی۔ برسوں کی روشنائی کاغذ کے ہم رنگ ہو رہی تھی۔ تحریر شدہ الفاظ دھندلا رہے تھے۔ عرق گلاب تھا یا گیلی مٹی کا اثر رجسٹر یوں خالی ہو رہا تھا جیسے اسکی روح پرواز کر رہی ہو۔ برسوں کی لکھی سطریں ایک ایک کر کے معدوم ہو رہی تھیں۔ ایک صفحے پر بوسیدہ کاغذ پہلے خشک سے تر ہوا پھر اس پر روشنائی پھیلنے لگی اس تحریر کی جگہ ایک مبہم ہیولا کسی بوڑھی عورت کے جھریوں بھری پرنور پر تمکنت چہرے کی طرح نمودار ہونے لگا۔

کاغذ پر لکھا تھا۔

جنس: عورت (بیوہ)

عمر: 75 برس سے زائد

اولاد: ایک ملک سے باہر عرصہ دس برس ایک ملک میں لیکن ملاقات کا عرصہ آٹھ ماہ سے زائد

ذریعہ آمدنی: دو ہزار روپے ماہانہ بذریعہ منی آرڈر

صحت: عمر کے لحاظ سے بہت مناسب

مسئلہ: کوئی خاص نہیں صرف بات سننے اور بات کرنے والا کوئی بھی نہیں۔ ■■■

رازداں حکیم

دن میں آنے والے مریض غریب، بوڑھے، نادار اور مجبور طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو ڈھیر ساری دعاؤں اور معمولی فیس ہی ادا کرنے پر قادر تھے۔ رات میں آنے والے مریض مکمل راز داری کی یقین دہانی کے ساتھ خطیر معاوضہ پیش کرتے۔ رات کو مریضوں کی پراسرار قطار دیکھ کر تحسین اور شمس الدین حکیم صاحب پر طرح طرح کے الزامات لگاتے۔ کوئی کہتا یہ کالا جادو کرتے ہیں۔ کوئی کہتا حکیم صاحب کے پاس عقد اول والے مغرب سے پہلے اور عقد دوئم والے عشاء کے بعد آتے ہیں۔ کوئی کہتا شریف بے اولاد مغرب کے بعد اور عشاء کے بعد شرارتی بااولاد حضرات آتے ہیں۔ حکیم صاحب ان باتوں کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے تھے بھئی ہم تو ان کے رازدان ہیں۔ اپنے دل کی بات اپنی زبان کو بھی نہیں بتاتے۔

وہاں سب سے بڑا مسئلہ نوکری، روٹی یا شادی نہیں

تووالو

صفحۂ ہستی سے مٹتے بدقسمت ملک کا تذکرہ وہاں پانی زمین سے فوارہ کی صورت نکلنے لگا ہے

- وہاں کے لوگ جان چکے ہیں کہ پانی بلند ہونے پر درختوں پر چڑھ کر جان نہیں بچائی جاسکتی
- ملک کے واحد ائیر پورٹ پر فٹ بال میچ جاری تھا جو ہمارا جہاز دیکھ کر روکنا پڑا

عالیہ احمد

ہمیں فضا میں پرواز کرتے کئی گھنٹے بیت چکے تھے۔ آخر جنوبی بحرالکاہل کے سینے پر مسکراتے ہونٹ جیسی سفید لکیر نمودار ہوئی۔ رفتہ رفتہ وہ بڑی ہوتی گئی اور اس نے سرسبز درختوں سے ڈھکے جزیرے کا روپ دھار لیا۔ جلد ہی ہمارا ہوائی جہاز تووالو (Tuvalu) کے فونافوتی بین الاقوامی ہوائی اڈے پر جا اترا۔ یہ مملکت کا اکلوتا ہوائی اڈہ ہے۔ رن وے پر فٹ بال کا میچ جاری تھا، چناں چہ جہاز اتارتے ہوئے اُسے روکنا پڑا۔

میں پہلی بار تووالو آیا تھا، جزائر کا مجموعہ جو آسٹریلیا اور ہوائی کے درمیان بحرالکاہل میں واقع ہے۔ مجھے اس کی زمین اتنی سپاٹ اور نچلی معلوم ہوئی کہ میں ڈر سا گیا۔ لگتا تھا، چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا سمندر کسی بھی لمحے خشکی کے اس نقطے کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔

اس روز جزیرے پر معمول کی سرگرمیاں تھیں۔ کچھ لوگ مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ بعض درختوں کے ناریل اتارنے میں مصروف تھے۔ بظاہر ماحول پُرسکون تھا، لیکن سبھی باشندوں کے چہروں پر پھیلی پریشانی اور غم وغصہ بھی چھپائے نہ چھپتا تھا۔

دراصل تووالو سمیت وسطی بحرالکاہل میں واقع سبھی جزائر مثلاً کیری باتی، گلبرٹ جزائر، مارشل جزائر وغیرہ کی بیشتر زمین سمندر سے صرف دو تین میٹر (ساڑھے چھ یا دس فٹ) بلند ہے۔ عالمی سطح پر جنم لیتی تبدیلیاں اسی خطے پر سب سے زیادہ منفی اثر ڈالیں گی۔۔۔ وہ یہ کہ مستقبل میں بیشتر جزائر سمندر برد ہو سکتے ہیں۔

دس ہزار لوگوں کا بڑا مسئلہ

چناں چہ آج بلکہ تووالوالوں کا سب سے بڑا مسئلہ روٹی، نوکری یا شادی نہیں اپنی بقا بن چکا۔ عالمی آب و ہوائی تبدیلیاں رفتہ رفتہ اس ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر رہی ہیں اور یہ خطرہ موجود ہے کہ تووالو کی منفرد تہذیب و ثقافت، فطری طرز زندگی، حتیٰ کہ زبان ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائے۔

یہ 1990ء کی بات ہے، جب تووالو والے عالمی گرماؤ (گلوبل وارمنگ) کے عجوبے سے آگاہ ہوئے۔ انہیں معلوم ہوا کہ رکازی (Fossil) ایندھن سے خارج ہوتی گیسیں کرہ ارض میں گرمی بڑھا رہی ہیں۔ صنعتی اور مغربی ممالک سب سے زیادہ یہ خطرناک گیسیں خارج کرتے ہیں۔ اس لیے 2002ء میں وزیراعظم تووالو نے امریکی اور آسٹریلوی حکومتوں کو دھمکی دی کہ اگر دونوں ممالک نے گیسوں کا اخراج کم نہ کیا تو وہ ان پہ ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ کھڑا کر دے گا۔

دراصل کرہ ارض میں بڑھتی حدت قطبین اور پہاڑی علاقوں میں ہزاروں برس سے منجمد اربوں ٹن برف پگھلانے لگی ہے۔ اور پگھلتی برف کا پانی رفتہ رفتہ سمندروں میں داخل ہو رہا ہے، اس لیے ان کی سطح بڑھ رہی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگلے 100 برس میں سمندروں کی سطح ایک دو میٹر تک بلند ہو سکتی ہے۔ تب تووالو سمیت کئی جزائر میں انسانوں کے لئے رہائش رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔

مذاق کی بات نہیں

تووالو کے لوگوں کو پہلی بار یہ علم ہوا کہ ان کا دیس سمندری پانی میں ڈوب سکتا ہے، تو وہ بہت محظوظ ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ جب بھی پانی بلند ہوا، تو وہ درختوں پر چڑھیں گے۔ لیکن صرف بیس برس گزرنے کے بعد انہیں احساس ہو چکا کہ یہ مذاق کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے امیر باشندے ہجرت کر کے نیوزی لینڈ یا آسٹریلیا میں آباد ہو چکے۔ دس سال قبل تووالو میں گیارہ ہزار لوگ آباد تھے، آج آبادی دس ہزار رہ گئی ہے۔

میں امریکا سے سیر و سیاحت کرنے کے علاوہ تحقیق کرنے بھی تووالو آیا تھا۔ اس لیے شام کو مملکت کی چیف ماہر موسمیات سے ملنے پہنچ گیا۔ ہالیہ ویوک دبلی پتلی اور متوسط قامت کی خاتون ہے۔ اس نے آسٹریلیا میں موسمیاتی سائنس کی تربیت پائی تھی۔ ہالیہ سے مل کر مجھے خاصی حیرانی ہوئی کیونکہ وہ مسلمان تھی۔ تووالو ایک عیسائی ملک ہے اور وہاں کم ہی مسلمان آباد ہیں۔

ہالیہ نے بتایا "حالات آہستہ آہستہ خطرناک رخ اختیار کر رہے ہیں۔ سمندری طوفان آنا معمول بن چکا۔ پھر اکثر نیچے سے بھی سمندری پانی فوارے کی صورت نکل آتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ سمندر بتدریج تووالو کی سرزمین نگلتا جا رہا ہے۔"

77 سالہ مچھیرا، فالیولا گے بچپن سے مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ وہ بتاتا ہے "جب میں نوجوان تھا تو صرف نومبر دسمبر میں طوفان آیا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ تقریباً ہر ماہ حملہ کرتے ہیں۔ لہروں، تیز ہواؤں اور طوفانوں کی وجہ سے جزائر کی زمین رفتہ رفتہ سمندر برد ہو رہی ہے"۔ چناں چہ کئی جزیروں میں ساحل دس تا بیس فٹ زمین سے محروم ہو چکے۔

عالمی آب و ہوائی تبدیلیاں پاکستان کو بھی متاثر کر رہی ہیں۔2010ء کا خوفناک سیلاب اسی آفت کی نشانی ہے۔لیکن ہماری سرزمین مٹنے کے خطرے سے دوچار نہیں۔اور پھر ہر پاکستانی کو کسی نہ کسی طرح کھانا مل ہی جاتا ہے۔مگر تووالو اور دیگر قریبی جزائر کے باشندے تو اب تباہی اور موت کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

ان جزائر میں میٹھا پانی صرف بارش لاتی ہے۔لیکن آب و ہوائی تبدیلیوں نے بارشوں کے وقفے طویل کر ڈالے۔ چناں چہ پچھلے برس تووالو میں آٹھ ماہ تک بارش نہ ہوئی۔اس امر نے حکومت کو متوحش کر ڈالا۔لہٰذا اب وہ ہر انسانی آبادی میں ذخیرہ آب بنا رہی ہے۔

تووالو والوں کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ سمندری پانی نیچے سے میٹھے پانی میں داخل ہونے لگا ہے۔یہی نہیں، وہ فصلیں بھی خراب کر رہا ہے۔ اب ظاہر ہے، ملک میں میٹھا پانی نہ رہا، تو خود بخود زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔

سپر پاورز سے ٹکر

ان جزائر کی حکومتیں عالمی سطح پر کوئی نمایاں مقام نہیں رکھتیں۔ پھر بھی وہ صنعتی ممالک سے ٹکر لینے کی کوشش کر رہی ہیں۔۔۔ وہ ممالک جو سب سے زیادہ خطرناک گیسیں خارج کرتے ہیں۔ مثلاً امریکا اور برطانیہ میں ہر شہری تیسری دنیا کے شہریوں سے تین چار گنا زیادہ آلودگی پھیلاتا ہے۔لیکن مغربی ممالک کی اکثریت خطرناک گیسوں کا اخراج کم کرنے کو تیار نہیں کیونکہ یوں ان کی معاشی ترقی رک جائے گی۔

2009ء میں عالمی آب و ہوائی تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے کی خاطر کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تھی۔ تووالو سمیت ڈوبنے کے خطرے سے دوچار تمام جزائر کی حکومتوں نے وہاں بڑے رقت آمیز اور جذباتی انداز میں اپنا کیس پیش کیا۔ان کی الم ناک اپیل سن کر پتھر دل مرد عورتوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔تب ان حکومتوں نے بھی محسوس کیا کہ دنیا والے انہیں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن اگلے ہی ہفتے امریکی صدر بارک اوباما نے سبز مکانی (گرین ہاؤس) گیسوں کا اخراج کم کرنے سے انکار کر دیا۔اس پر بحر الکاہل کے جزائر نے بڑی مایوسی اور غم و غصہ کا اظہار کیا۔

یہ واضح رہے کہ دنیا بھر میں برف تیزی سے پگھلنے کا مظہر عالمی گرماؤ کی سب سے بڑی نشانی ہے۔مثلاً بحیرہ آرکٹک میں اب موسم گرما میں بہت سی برف پگھل جاتی ہے۔ چناں چہ ماہرین کا کہنا ہے کہ چند دہائیوں بعد وہاں جہاز رانی ممکن ہو گی اور یوں نیا

تووالو ایک نظر میں

تووالو بحر الکاہل میں مونگے کے تین جزائر اور چھ مرجانی جزیروں (Atolls) پر مشتمل ہے۔کل رقبہ 26 مربع کلومیٹر (10 مربع میل) ہے۔ گویا تووالو بہ لحاظ رقبہ دنیا کا چوتھا سب سے چھوٹا ملک ہے۔اس سے صرف ویٹیکن سٹی (0.17 مربع میل)، مناکو (0.76 مربع میل) اور ناؤرو (8.1 مربع میل) چھوٹے ہیں۔

کیری باتی، ناؤرو، ساموا اور فجی تووالو کے پڑوسی ہیں۔ تووالو کے تو جزائر میں تقریباً دس ہزار لوگ مختلف بستیوں میں رہتے ہیں۔ یہ آبادی کے لحاظ سے دنیا کی تیسری سب سے چھوٹی مملکت ہے۔صرف ویٹیکن سٹی اور ناؤرو ہی اس سے بہ لحاظ آبادی چھوٹے ہیں۔

تووالو میں سب سے پہلے جزائر بحر الکاہل کے باشندے (پولی نیشین) آباد ہوئے۔برطانوی بحری جغرافیہ داں، الیگزنڈر جارج فینڈلے (1812ء۔1876ء) کے نام پر ان جزیروں کا نام ایلس جزائر رکھا گیا۔

سمندری راستہ کھل جائے گا۔

اسی طرح دنیا بھر کے تمام پہاڑوں میں جمے گلیشیئر سکڑ رہے ہیں۔کوہ کینیا کا سب سے بڑا گلیشیئر 90 فیصد تک پگھل چکا۔اسی طرح مشہور افریقی چوٹی، کلیمنجارو پر جمے 70 فیصد گلیشیئر پگھل چکے۔ ہسپانوی پہاڑوں سے تو پچھلے چالیس برس میں 30 گلیشیئر غائب ہو گئے ہیں۔

حدت میں اضافے کے باعث پودے اور جانور ہجرت کر کے بلند (سرد) علاقوں کی طرف جا رہے ہیں۔ اُدھر سمندروں میں بڑھتے درجہ حرارت اور بڑھتی تیزابیت کے باعث مونگے کی چٹانوں کو خطرات لاحق ہیں۔

باشندوں کی ہجرت

تووالو حکومت اب کوشش کر رہی ہے کہ مملکت کے زیادہ سے زیادہ باشندے نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور ہوائی (امریکا) میں آباد ہو سکیں۔اس کا کہنا ہے کہ خرابی صنعتی اور بڑے ممالک کی پیدا کردہ ہے، لہٰذا وہی حل بھی نکالیں۔تاہم نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا صرف 75 تووالین باشندوں کو ہر سال ویزے دیتے ہیں۔یوں ساری آبادی کو نئے ممالک میں آباد ہوتے طویل عرصہ لگے گا۔

آج تووالو کے باسی امریکا اور دوسری سپر پاورز کو اٹھتے بیٹھتے لعنت ملامت کرتے ہیں جنہوں نے ان کے ملک اور قوم کا مستقبل تباہ کر ڈالا۔ یاد رہے، آج کاربن ڈائی آکسائڈ اور دیگر سبز مکانی گیسوں کا اخراج رک بھی جائے، تو کم از کم دو تین صدیوں تک کرہ ارض کے درجہ حرارت میں کمی نہیں آئے گی۔تووالو کی ایک پریشان حال ماں، نیہارا خوئی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہتی ہے:

''جب طوفانِ نوحؑ آیا تھا، تو ساری دنیا تباہ ہو گئی۔لیکن جب پانی اترا تو زندگی نے پھر جنم لیا۔لیکن آج کی دنیا بدل چکی ہے۔ خدا نے بہترین شکل میں دنیا بنائی تھی، لیکن انسان نے اُسے ناقص بنا ڈالا''۔

9 اکتوبر 1892ء کو برطانوی مہم جو، کیپٹن گبسن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایلس جزائر پہنچا۔ اس نے علاقے کو برطانوی نو آبادی بنا لیا۔ چناں چہ جلد ہی وہاں انگریز کمشنر (گورنر) آ پہنچا۔انگریز پھر جزائر کے قدرتی وسائل سے استفادہ کرنے لگے جو ان کی پرانی ریت ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں امریکیوں نے یہاں قدم دھرے۔ امریکی بحریہ نے جاپانیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے یہاں اپنے جنگی اڈے قائم کیے۔ان اڈوں نے جزائر کے فطری ماحول کو نقصان پہنچایا۔ آخر یکم اکتوبر 1978ء کو آزادی کا سورج طلوع ہوا اور جزائر کے پولی نیشین باشندوں کو برطانوی غاصبوں سے نجات مل گئی۔

ماہی گیری اور ناریل کے درخت اگانا تووالو کے باشندوں کا بنیادی ذریعہ معاش ہے۔ پولی نیشین اپنی تہذیب و ثقافت رکھتے ہیں۔ سیاحوں کی آمد بھی موثر ذریعہ آمدن ہے۔ ■■■

پانی سے پانی

پچھلے دو تین سال تووالو والوں پر بڑے بھاری گزرے کیونکہ بارش نہ ہونے سے میٹھے پانی کا قحط پڑ گیا۔عام انسان روزانہ مختلف سرگرمیوں میں 50 تا 100 لیٹر پانی استعمال کرتا ہے۔لیکن تووالو میں پانی کی شدید کمی کے باعث فی شہری روزانہ محض 10 لیٹر ہی استعمال کرتا رہا۔

پانی کی شدید کمی دیکھ کر اب تووالو ین حکومت ہر جزیرے میں بڑے بڑے ذخیرہ ہائے آب تعمیر کر رہی ہے۔ ایسا پہلا ذخیرۂ آب پچھلے ماہ لوفیگائی جزیرے میں مکمل ہوا۔ اس میں سات لاکھ لیٹر پانی ذخیرہ کرنا ممکن ہے۔یوں ذخائر آب کی موجودگی سے بارش نہ ہونے کے ادوار میں زیادہ پریشانی نہیں ہو گی۔

لیجیے ہم بابل کے گھر سے پیا کے دیس یعنی پاکستان سے براستہ دبئی مانچسٹر (برطانیہ) پہنچ ہی گئے۔ دوران سفر ہمارا ننھا سا دل مستقبل کے انجانے خدشے لیے، ہوائی سفر کے خوف سے بھی لرزتا رہا۔ نو گھنٹے کا طویل سفر طے کر کے ہوائی اڈے پر اترے تو ہمارے منہ سے یہ کپکپاتا جملہ نکلا، ''اُف! یہاں تو بہت سردی ہے۔'' سردی تو لگنی ہی تھی، ہم اکتوبر کی پاکستانی گرمی چھوڑ کر برطانوی ٹھنڈ میں جو آ گئے تھے۔ ادھر میاں جی کو خیال ہی نہ رہا، منزل کے آغاز پہ نہ سہی، منزل پہ پہنچ کے تو سردی لگے گی، لہٰذا کوئی سوئیٹر ہی رکھ لیں۔ وہ تو صد شکر کہ گھر والے لینے آئے ہوئے تھے۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھے اور گھر سدھارے۔ ایک دو دن بعد سفر کی تھکن اتری تو گردوپیش کا جائزہ لیا اور آج تک لے رہے ہیں۔ گوروں کی دنیا نرالی اور لوگ بھی نرالے۔ لو بھلا بتاؤ، ہر سڑک کے دونوں اطراف میں ایک جیسی گلیاں اور ہر گلی میں ایک ہی جیسے گھر..... بندہ گھبرا کے کسی اور کے گھر میں نہ گھسے تو اور کیا کرے؟ اس پہ مستزاد یہ کہ کسی گھر پہ کوئی نیم پلیٹ نہیں ہوتی، بس گھر کا نمبر یاد ہو یا پھر میاں جی کا نمبر۔ کچھ اور نہ سمجھیں! تاکہ گم ہو جائیں تو روہانسی آواز میں انھیں فون کیا جا سکے۔

''جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں'' یہ محاورہ انسانوں پر لاگو ہوتا ہو یا نہیں، پاکستان اور برطانیہ کے موسموں پہ ضرور لاگو ہوتا ہے۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجیے، پاکستان میں بادل آتے، خوب گرج گرج کے دلوں کو سہماتے اور عموماً ایک بوند بھی گرائے بغیر کسی بے وفا معشوقہ کی طرح سر اٹھائے چلے جاتے ہیں اور برطانیہ کا موسم! اس دیس میں جتنی خاموشی سے بارش برستی ہے، شاید ہی کہیں اور برستی ہو۔ آپ اگر گھر کے اندر ہوں تو اندازہ ہی نہیں لگا سکتے، کہ باہر کیسی جھڑی لگی ہے۔ لوگ کہتے ہیں برطانیہ کا موسم اور محبوبہ دونوں ہی بے وفا ہیں۔ محبوبہ کا تو پتا نہیں لیکن موسم بھی بھر کے بے وفا ہے۔ آپ صبح اٹھ کے کھڑکی سے باہر جھانکتے اور چمکتی دھوپ و صاف آسمان دیکھ کر پکنک منانے پارک جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ باہر نکلتے وقت چھتری کی طرف بڑھتا ہاتھ پلٹ آتا ہے کہ آج تو دھوپ نکلی ہے، اس کی کیا ضرورت ہے؟ آپ یقین کریں، یہ عظیم غلطی آپ کو بہت مہنگی پڑے گی۔ غالب امکان ہے کہ کچھ ہی دیر بعد جب آپ پارک میں چادر بچھا کر کھانے پینے کی چیزیں سجا رہے ہوں گے تو اچانک مینہ برسنا شروع ہو جائے گا، بغیر کسی قسم کی پیشگی اطلاع کے! یہ دھوکہ ہے۔ بوکھلائے واپس آتے ہیں۔ اس دیس میں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ گھر سے نکلتے وقت آپ کے پاس چھتری ضرور ہو، ورنہ نقصان کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔

برطانیہ کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہاں آپ کسی کو گھور نہیں سکتے۔ اس قانون کی وجہ سے ہمارے میاں تنگ ہیں اور ہم خوش۔ کوئی آپ کو کتنا ہی عجیب یا مضحکہ خیز لگے، کوئی کتنی ہی بڑی آفت کا پرکالہ جا رہی ہو، جیسے ہی آپ نے اسے گھورا، اس نے پولیس کو جا شکایت لگائی۔ پولیس بھی فوراً جن کی طرح سائرن بجاتی کسی کونے سے نمودار ہو کر آپ کو جرمانہ کر دے گی جو آپ کو ہر حال میں ادا کرنا ہی ہوگا۔ وہ آپ کو جرمانے کے نوٹس پہ نوٹس بھیجیں گے یہاں تک کہ آپ ادا کر کے اپنی جان چھڑوا نہیں لیتے۔ قانون سب کے لیے برابر ہے۔ اگر آپ نے ''نو پارکنگ'' والی جگہ پہ گاڑی پارک کی اور خود شاپنگ کرنے چلے گئے تو واپس آنے پر آپ کے لیے ایک تحفہ منتظر ہو گا..... جرمانے کا نوٹس! اگر آپ نے جرم ماننے سے انکار کیا تو پولیس آپ کو گاڑی کی تصویر دکھا دے گی جو بطور ثبوت کھینچی جاتی ہے۔

برطانیہ کے لوگ بھی ہمارے جیسے انسان ہیں، آسمان سے نہیں اترے کہ پیدائشی طور پر قانون کو سمجھ سکیں۔ قانون پہ عمل درآمد نہ ہو تو برطانوی بھی وہی کریں جو ہم اپنے ملک میں کرتے ہیں۔ لیکن یہاں سختی ہے اور قوانین ایسے سخت کہ آپ جتنی کوشش کر لیں، ان سے دور نہیں بھاگ سکتے۔ مثال کے طور پر آپ کسی بھی شاپنگ سینٹر میں چلے جائیں، عمارت کے آغاز میں ہی ٹرالیوں کی قطار لگی ہوتی ہے اور ہر ٹرالی ایک زنجیر کے ذریعے دوسری سے منسلک ہے۔ اگر آپ کو ٹرالی کی ضرورت ہے تو زنجیر پہ بنی جگہ پہ ایک پاؤنڈ کا سکہ رکھیے۔ آپ کا پاؤنڈ زنجیر کے خفیہ پیٹ میں اور ٹرالی آپ کے پاس آ جائے گی۔ اب آپ جتنی دیر چاہے شاپنگ کریں اور ٹرالی بھرتے جائیں۔ لیکن خیال رکھیے گا، خراماں خراماں ٹرالی گھسیٹتے شاپنگ سینٹر سے باہر نہ چلے جائیں۔ تب دو باتیں ہوں گی، ایک تو بل ادا کیے بغیر جانے پہ سکیورٹی الارم خود ہی چیخ پڑے گا، دوسرا آپ کی ٹرالی ایک قدم بھی آگے بڑھنے سے انکار کر دے گی۔ اگر آپ نے بل ادا کر دیا، پھر بھی آپ ٹرالی ایک 'سند' کی صورت گھر نہیں لے جا سکتے۔ وجہ وہی کہ ہر شاپنگ سینٹر کی ٹرالیاں اس علاقے سے باہر قدم (بلکہ اپنے پہیے) رکھنے سے قاصر ہیں۔ گوروں نے پکا بندوبست کر رکھا ہے۔ ورنہ شاید ایک بھی ٹرالی شاپنگ سینٹر میں نہ ہوتی۔ ارے اس ایک پاؤنڈ کو تو ہم بھول ہی گئے جو آپ نے ٹرالی کے بدلے زنجیر کے حوالے کیا تھا۔ یہاں ہم یہ بتا دیں کہ پاؤنڈ کی قدر و قیمت کیا ہے؟ آپ ایک پاؤنڈ میں سادہ چکن برگر کھا سکتے ہیں، فلش صاف کرنے کا لیکوئڈ لے سکتے ہیں یا بدن کو مہکانے

ساجدہ غلام محمد

گوروں کے دیس میں

اپنے پیارے بہت یاد آتے ہیں

کے لیے خوشبو خرید سکتے ہیں۔ اس لیے کون اپنا پاؤنڈ زنجیر کے حوالے کرے؟ آپ واپس اسی جگہ جائیں گے جہاں سے آپ نے ٹرالی مستعار لی تھی۔ زنجیر کو ٹرالی سے منسلک کریں گے اور کھٹ کی آواز کے ساتھ پاؤنڈ آپ کے اور ٹرالی زنجیر کے حوالے! یہ طریقہ ہمیں تو بہت اچھا لگا کیونکہ اس طرح نہ تو ہوا کے زور پہ ٹرالیاں اِدھر اُدھر بھاگتی نظر آتیں اور نہ ہی چوری ہوتی ہیں۔ اس طریقے کی ضرورت ہمیں کراچی ہوائی اڈے پہ بے تحاشا محسوس ہوئی جہاں سامان لادنے کے بعد مسافر ایک ادائے بے نیازی سے ٹرالی بیچ راہ میں چھوڑ کر دوسروں کے لیے کوفت کا باعث بنتے ہیں۔

ویسے تو گوروں کے پاس خاصی عقل ہے لیکن دو مواقع پہ وہ گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ ایک ان کے گھر اور دوسرے گھروں میں لگے نل! رخصتی سے قبل جب فون پہ ہمارے میاں ہمیں برطانوی گھروں کا حجم بتانے کے لیے انھیں مرغی کے ڈربوں سے تشبیہ دیتے تو ہم حیرت سے چچا کے گھر میں بنے مرغی کے ڈربے کو دیکھتے ہوئے پوچھتے، ''ہائیں..... واقعی؟'' اب یہی سوال ہماری بہنیں اور سہیلیاں کرتی ہیں جب ہم انھیں اپنے گھر کا حدود اربعہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیں، بھلا یہ کیا گھر ہوا جس میں سامان رکھنے کو کوئی دیوار گیر الماری نہ ہو اور نہ اسٹور ہو، کمرے میں ڈبل بیڈ رکھ کے سوچنا پڑے کہ الماری کی جگہ کیسے بنائیں، ٹوائلٹ جانا ہو تو اندر کیسے داخل ہوں؟ شومئی قسمت کپڑے بچا کے اندر داخل ہو بھی گئے تو نکلیں کیسے؟ یقین کریں، ہمیں ایک ہسپتال کے ٹوائلٹ کو استعمال کرنے کا اتفاق ہوا۔ اندر تو چلے گئے، اب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ سجھائی دے کہ کپڑے فلش پہ نہ لگیں اور عین سامنے لگا دروازہ بھی کھول لیں۔ بڑی سوچ بچار کی، ایک طرف کھڑے ہو کر دروازہ کھولتے تو دروازے تک پہنچنے کے لیے فلش آڑے آتا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر کوشش کریں تو دروازہ کسی صورت نہیں کھلتا۔ آخر بہت تنگ آئے تو فلش کے اوپر کھڑے ہو کر دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگائی۔

گوروں کی عقل کو مزید سراہنا ہے تو باورچی خانے اور غسل خانے کے نل دیکھ لیں۔ طبیعت اش اش کر اٹھے گی۔ پاکستان میں تو ٹھنڈا اور گرم پانی آپ ایک ہی نل کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں، لیکن یہاں گرم پانی کا الگ نل اور ٹھنڈے کا الگ! ٹھنڈا کھولیں تو یخ ٹھنڈا پانی آئے، گرم کھولیں تو جہنم کی یاد ذہن میں تازہ ہو جائے۔ گورے تو سنک بند کر کے ٹھنڈا اور گرم نل کھول کر اسی میں سارے برتن انڈیل دیتے ہیں (یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ دھوتے کیسے ہیں؟)۔ غسل خانے میں بھی اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے پانی بھرے سنک میں تمام کاموں سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ لیکن مسئلہ تو ہمیں ہوا، اور بہت ہوا۔ اصل میں یہاں گرمائش نظام (Heatning System) بھی پاکستان کے گیزر کی طرح ہے، بس یہاں کسی ماچس کی ضرورت نہیں پڑتی، صرف ایک بٹن گھمانے سے آپ پانی کا درجہ حرارت کنٹرول کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں اگر آپ نے گیزر چلایا ہے تو گرم پانی کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے پانی کا نل کھول کر ضرورت کے مطابق درجہ حرارت حاصل کر لیں۔ لیکن یہاں دونوں نل الگ ہونے سے بعض اوقات بہت کوفت

ہوتی ہے۔ اگر پانی کا درجہ حرارت تیز کیا تو ہر جگہ تیز گرم پانی ہی آئے گا۔ اس لیے اگر کوئی نہا رہا ہو تو ہر جگہ نل کھولنے پہ پابندی ہوتی ہے۔ نہانے والا نکلے گا، پانی کا درجہ حرارت کم کرے گا، تبھی آپ نارمل درجہ حرارت پہ برتن دھو سکیں گے۔

برطانیہ میں ہم نے ترقی کی دوڑ میں بھارتیوں کو آگے اور پاکستانیوں کو ذرا پیچھے ہی دیکھا اور سچ مانیے تو ہمیں بہت بُرا لگا۔ آپ گوروں کے بڑے سپر اسٹورز میں چلے جائیں، بھارتی کمپنیوں کے مصالحے، چٹنیاں اور آٹے کے تھیلے بآسانی دستیاب ہوں گے۔ جب بھی ہم خریداری کرنے جاتے، حسد کے مارے جلتے بھنتے واپس آتے، لیکن ایک دن دل میں ٹھنڈک سی اتر گئی جب ہم نے ایک بڑے سپر اسٹور پہ نیشنل اور شان کے مصالحہ جات بھی دیکھے۔ لیکن ابھی پاکستانی کمپنیوں کو جگہ بنانے کے لیے بہت محنت کی ضرورت ہے۔ خریدنے والے بہت ہیں، بس کوشش جاری رکھیے۔

البتہ ایک شعبے میں پاکستانیوں نے اپنی دھاک بٹھا ہی لی...... وہ ہے ہوٹلنگ کا شعبہ۔ مانچسٹر میں تو ایک سڑک کا نام 'mile curry' رکھ دیا گیا ہے کیونکہ وہاں ایک میل تک سڑک کے دونوں جانب کھانے پینے کے چھوٹے بڑے ایشیائی ہوٹل بنے ہیں۔ اگرچہ ان میں گورے زیادہ پائے جاتے ہیں۔

جی ہاں! ہم نے انھیں بھی اپنے دیسی ذائقوں کا گرویدہ بنا لیا ہے۔ کانوں سے دھواں نکل رہا ہے، سوں سوں کر کے ناک صاف کر رہے ہیں لیکن پھر بھی بریانی ضرور کھانی ہے۔ برگر بھی چیپتا ہوا اور ساتھ میں مرچیلی چٹنی بھی ہو تو کیا ہی بات ہے! اب تو ان کے گھروں میں بھی ہمارے مصالحہ جات کے ڈبے ملتے ہیں۔ شاید وہ اُبلے مٹر، آلو اور پالک وغیرہ کھا کھا کے تنگ آ گئے ہیں۔

ہمارے میاں کی گاڑی ایک دن خراب ہو گئی۔ باوجود کوشش کے نہ چلی۔ صورتِ حال دیکھ کے گورا ہمسایہ مدد کرنے پہنچا اور کچھ ہی دیر میں گاڑی چل پڑی۔ میاں نے ازراہِ مروت پوچھ لیا کہ کوئی کام ہے تو بتائیں؟ ہمسائے نے فوراً بریانی کی فرمائش کر دی اور اگلے دن مزے لے لے کے کھائی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جب یہ بیچارے انگریزی لہجے میں دیسی کھانوں کے نام لینے کی کوشش کرتے ہیں، تو ہمارے دیسی

ویٹر بیچارے منہ چھپا کے بمشکل ہنسی چھپاتے ہیں۔ یہ لکھتے ہوئے ہمیں نجانے کیوں وہ لطیفہ یاد آرہا ہے جس میں ایک گورے نے بڑی حیرت سے جلیبیاں بنانے والے سے کہا، ''تم لوگ اس ٹیوب میں رس کیسے بھرتے ہو؟''

ایک نامور پاکستانی نیوز چینل کے مشہور دعوے 'ہر جگہ، ہر وقت، سب سے پہلے...... نیوز' کی بدولت پاکستان کی پل پل کی خبریں ہم تک پہنچتی رہتی ہیں اور ہم دل تھامے کڑھتے رہتے ہیں۔ ایک دن بجلی کے بحران پر میاں صاحب نے ایک حل بتایا اور واقعی خوب تھا۔ برطانیہ میں بجلی کا بل ادا کرنے کے دو طریقے ہیں: ایک تو یہ کہ مہینے بعد گھر پہ بجلی کا بل آجایا کرے (جیسا کہ پاکستان میں ہوتا ہے) اور دوسرا طریقہ یہ کہ موبائل کارڈ کی طرح کا ایک کارڈ ہے جس میں آپ کسی بھی پٹرول اسٹیشن یا دکان پہ جا کر بیلنس ڈلواتے ہیں۔ گھر آ کے وہ کارڈ بجلی کے میٹر میں لگاتے ہیں۔ یہ بیلنس دس پاؤنڈ کا ہوسکتا ہے اور سو پاؤنڈ کا بھی۔ جب بیلنس ختم ہونے لگے تو کارڈ نکالیے اور دکان پہ جا کے دوبارہ بھروا لیجیے ورنہ آپ بھی کہیں گے، 'اوہ! بجلی چلی گئی!' بجلی تب تک نہیں آئے گی جب تک دوبارہ بیلنس بھرا کارڈ میٹر میں نہ لگ جائے...... میاں صاحب کی رائے ہے کہ پاکستان میں یہی دوسرا طریقہ متعارف ہونا چاہیے۔ پھر کسی میٹر ریڈر کو گھر جا کے میٹر نہیں چیک کرنا پڑے گا اور نہ ہی کنڈے کے ذریعے کوئی مفت میں بجلی کے مزے لوٹے گا۔ تجویز بری نہیں بشرطیکہ کوئی آزمانے کو تیار ہو۔

دلوں کے حال تو اللہ ہی جانے، لیکن انگلستان میں آپ کو ہر جگہ مساوات ضرور نظر آئے گی۔ کوئی حجاب میں ملبوس کسی خاتون کو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کسی کو نوکری سے اس لیے نہیں نکالا جاسکتا کہ اس کی داڑھی کیوں ہے اور نہ ایک دوسرے کے ساتھ کسی طرح کا امتیازی سلوک کرسکتا ہے۔ ہمیں یورپ کے سب سے بڑے کینسر ہسپتال میں کام کرنے کا موقع ملا۔ وہاں بھی ہم نے یہی بات دیکھی کہ آپ چاہے کسی بھی رنگ اور نسل کے ہوں، آپ کے ساتھ برابر کا سلوک ہوگا۔ ایک دفعہ ہم عید کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو باہر ایک تنظیم کے کچھ انگریز ہمیں عید کی مبارک باد دینے کھڑے تھے۔

اتنا کھلا دل بہت کم اقوام کے پاس ہے اور برطانوی اس معاملے میں شاید سب سے آگے ہیں۔ اب تو اسکولوں میں عید کی چھٹی بھی دی جانے لگی ہے۔ لیکن مسئلہ پھر وہی دو عیدوں کا، جی ہاں! یہ مسئلہ صرف پاکستان میں نہیں پایا جاتا بلکہ شاید جہاں جہاں پاکستانی پہنچیں، یہ مسئلہ بھی پہنچتا ہے۔

لیکن کچھ بھی ہو، جب انگلستان میں گرمیوں میں دوپہر ڈھلے تو پاکستان میں لگے آموں کے بور کی خوشبو دیارِ غیر میں بے چین کردیتی ہے۔ کان یہ آواز سننے کو ترس جاتے ہیں، ''ٹھنڈے میٹھے فالسے لے لو، امب لئی جا، قلاقند لئی جا''۔ نری کھنڈ لئی جا۔ پھر ہم پاکستانی بار بار ایشیائی سپر اسٹوروں کے چکر لگانا شروع کردیتے اور پوچھتے ہیں، ''بھائی! پاکستانی آم کب آئیں گے؟'' یا جب برف پڑ رہی ہو تو پاکستان کی مونگ پھلیاں، ساگ، مکھن اور مکئی کی روٹیاں اور کینو بے تحاشا یاد آتے ہیں اور اپنے پیارے تو ہمیشہ ہی یاد آتے رہتے ہیں۔

■■■

خوبصورت شہر الخبر

سعودی عرب کا مشرقی کنارہ

تمیرا لیاقت، سعودی عرب

سعودی عرب دنیا کا واحد ملک ہے جس کا جھنڈا کسی موقع پر بھی سرنگوں نہیں ہوتا کیونکہ اس پر لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ تحریر ہے۔ تیل کی دولت سے مالا مال اس ملک کی آبادی دو کروڑ 61 لاکھ اور رقبہ 22 لاکھ 50 ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے پڑوسی ملکوں میں مصر، یمن، سوڈان، کویت، عراق، اومان، متحدہ عرب امارات، قطر، ایران، اریٹریا، بحرین اور اُردن شامل ہیں۔

سعودی عرب کا قومی دن 23 ستمبر کو منایا جاتا ہے۔ جسے ''یوم وطنی'' کہتے ہیں۔ پورے سال میں صرف تین موقعوں پر چھٹی ہوتی ہیں۔ 23 ستمبر عیدالفطر، حج و عیدالاضحیٰ، باقی سارا سال کام کام اور بس کام ہوتا ہے۔ قائداعظم کے اس فرمان کو سعودی عرب نے اپنا لیا ہے اس لیے روز بہ روز ترقی کررہا ہے۔ اس کی شرح خواندگی 78.8% ہے۔

سعودی عرب کے تیرہ صوبے ہیں، دارالحکومت ریاض ہے جو سب سے بڑا شہر ہے۔ دوسرے بڑے شہر دمام، الخبر اور دہران ہیں۔ یہ تینوں شہر باہم ایک دوسرے سے ایسے ملے ہوئے ہیں کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کب ایک شہر ختم ہوا اور دوسرا شروع ہوگیا۔ اس لیے ان تینوں شہروں کو The Triplet Cities بھی کہتے ہیں۔ دمام اور خبر ساحلی شہر ہیں اور خلیج عربی Arabian Gulf پر واقع ہیں۔ یہ خلیج عربی دائیں طرف مڑ کر بحیرہ عرب سے مل جاتی ہے۔

ابتدا میں ''خُبر'' ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی۔ 1930ء میں جب یہاں تیل دریافت ہوا تو یہ جگہ ترقی کرنے لگی پھر 1940ء سے ''الخبر'' نام کا شہر آباد ہوگیا۔ 1942ء میں پہلا اسکول بنا، اس وقت یہاں 100 سے زائد سرکاری اور نجی اسکول موجود ہیں۔

الخُبر کی موجودہ آبادی تقریباً 4 لاکھ 12 ہزار ہے۔

میں ایک سال سے اپنے شوہر کے ساتھ الخُبر میں مقیم ہوں میرے شوہر لیاقت خاں یہاں بطور انجینئر کام کرتے ہیں۔ الخبر

کشادہ سڑکوں، دلکش عمارتوں، خوش نما پارکوں اور دیدہ زیب شوپنگ مالز کا ایک خوبصورت ساحلی شہر ہے۔ ساحلی علاقوں کا موسم عام طور پر سارا سال معتدل رہتا ہے۔ مگر الخبر کے سارے موسم بھرپور ہوتے ہیں۔ سردیوں میں شدید سردی پڑتی ہے اور گرمیوں میں شدید گرمی۔ موسم گرما میں تو نلکوں میں اتنا تیز گرم پانی آتا ہے کہ چائے کی پتی ڈال دیں تو قہوہ تیار۔ مارچ، اپریل میں موسم خوشگوار ہوتا ہے بہار اپنے جوبن پر ہوتی ہے۔ بارش یہاں کم کم ہوتی ہے۔ مگر اس سال ماشاءاللہ خوب بارشیں ہوئی ہیں۔

الخبر کی سڑکیں کشادہ ہیں اور فٹ پاتھ کھلے کھلے، ناجائز تجاوزات سے پاک، آمدورفت کے لیے بس گاڑیاں ہیں، چھوٹی گاڑیاں، بڑی گاڑیاں، رکشہ، تانگہ، گدھا گاڑیاں سب ناپید۔ موٹر سائیکل اور سکوٹر بھی آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ کسی مین سڑک پر ایک گھنٹہ کھڑے رہیں تو مشکل سے ایک موٹر سائیکل نظر آتی ہے، وہ بھی زیادہ تر ایک سیٹ والی، کیونکہ سعودی عرب میں خواتین کا موٹر سائیکل پر بیٹھنے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس کے علاوہ خواتین کے گاڑی چلانے پر بھی مکمل پابندی ہے۔

سعودی عرب کے دوسرے شہروں کی طرح الخبر میں بھی ٹریفک کا نظام بہت منظم ہے۔ ٹریفک قوانین بہت سخت ہیں اور ٹریفک پولیس امیر غریب میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ اگر کوئی کسی جگہ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرے تو یہ نہ سمجھے کہ اسے کسی نے دیکھا نہیں۔ گھر پہنچنے تک اس کے موبائل پر میسیج آجائے گا کہ آپ نے فلاں جگہ قانون توڑا ہے۔ اتنے ریال جرمانہ ادا کریں ورنہ آپ کی گاڑی بند کر دی جائے گی۔ سڑکوں پر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے کیمرے لگے ہیں۔ جو خود تو کم ہی نظر آتے ہیں مگر ان کی آنکھ سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

یہاں کالی پیلی نہیں بلکہ سفید رنگ کی ٹیکسیاں ملتی ہیں، جن کی چھت پر کالے رنگ سے اُجرۃ لکھا ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ٹیکسی کو ''اُجرۃ'' کہتے ہیں۔ زیادہ تر ٹیکسی ڈرائیور غیر ملکی ہیں۔ پاکستانی، بھارتی، مصری، بنگلہ دیشی وغیرہ، کیونکہ سعودی عرب میں پٹرول بہت سستا ہے۔ ایک ریال میں سوا دو لیٹر پٹرول ملتا ہے۔ اس لیے بہت سے غیر ملکی یہاں آکر ٹیکسی چلاتے ہیں۔ الخبر میں پاکستانیوں کی تعداد کافی زیادہ ہے، اس لیے یہاں اجنبیت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا ہے۔

ساحل کے سنگ سنگ

کورنیش روڈ (Corniche Road) الخبر کی سب سے خوبصورت اور بارونق سڑک ہے۔ 13 کلومیٹر لمبی یہ سڑک الخبر شہر کے مشرق میں واقع ساحل کے سنگ سنگ چلتی ہے۔ یہ ساحل تفریح کا بہترین مقام ہے۔ کورنیش روڈ

اور ساحل کے درمیان 70 میٹر چوڑا یہ ایریا، بہت سرسبز اور شاداب ہے۔ یہاں کہیں گرین بیلٹ اور کہیں دلکش پارک موجود ہیں۔ جس میں بچوں کے لیے پلے گراؤنڈ، پلے لینڈ ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بڑے ریستوران، سفید رنگ کی مسجدیں اور پارکنگ ایریا موجود ہیں۔ ساحل پر کہیں چھوٹی سی دیوار بنی ہے جس پر بیٹھ کر لوگ قدرتی حسن کا نظارہ کرتے ہیں اور کہیں سفید رنگ کے بڑے بڑے پتھر پڑے ہیں جن کے آگے حد نگاہ تک پانی ہی پانی ہے۔ سرشام کورنیش روڈ پر گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ جاتی ہیں اور اہل شہر اس گرین بیلٹ پر بیٹھ کر سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ویک اینڈ پر تو یہاں میلے کا سا سماں ہوتا ہے کیونکہ دوسرے شہروں سے بھی لوگ آکر یہاں ڈیرے ڈال لیتے ہیں۔ عربی لوگ زیادہ تر بڑی بڑی گاڑیاں رکھتے ہیں جس کی وسیع ڈگی میں وہ Folding میز کرسیاں، قالین، کھانے پینے کا سامان رکھ کر آتے ہیں اور سارا دن یہاں گزارتے ہیں۔ کوئی Fishing کر رہا ہے۔ کوئی اکیلا ہی کنارے پر بیٹھا پانی کی گہرائیوں اور آسمان کی وسعتوں میں کھویا ہوا ہے۔ کوئی باربی کیو کی بھینی بھینی خوشبو سے ماحول کو مہکا رہا ہے۔ سمندر میں آبی پرندے اور ساحل پر رنگ برنگی پتنگیں اڑتی پھرتی ہیں۔ سائیکل چلاتے ہیں، جھولے جھولتے ہیں اور فٹ بال کھیلتے ہیں۔ اگر کچھ نوجوان بچے انجوائے کرتے کرکٹ کھیلتے نظر آئیں تو سمجھ لیں کہ وہ پاکستانی ہیں یا ہندوستانی۔ دیار غیر میں بھی یہ نوجوان کرکٹ سے اپنی محبت کا عملی ثبوت دیتے ہیں۔

یہ منظر کشی شہر کے اندر ساحل کی ہے۔ الخبر شہر کے جنوب شمال کی جانب بہت وسیع اور کھلا سمندر ہے۔ یہاں لوگ تیراکی بھی کرتے ہیں اور غوطہ خوری بھی۔ چھٹی کے دن یہاں خوب رونق ہوتی ہے۔ ساحل پر چھوٹے چھوٹے ہٹ بنے ہوئے ہیں جو صبح ہی بھر جاتے ہیں۔ 400 میٹر طویل Half moon bay beach سیاحوں کی دلچسپی کا خاص مرکز ہے۔

دوطرفہ سڑک کے ایک طرف پانی میں کشتی رانی ہوتی ہے تو سڑک کی دوسری جانب ریت کا وسیع میدان ہے جس میں چھوٹے بڑے ریت کے ٹیلے ہیں جن پر نوجوان دباب چلاتے نظر آتے ہیں۔ چار پہیوں کی بھاری بھرکم یہ موٹر سائیکل جسے دباب کہتے ہیں، اب پاکستان میں بھی کہیں کہیں موجود ہے۔ یہاں سیکڑوں کی تعداد میں کھڑی ہوتی ہیں اور 50 ریال فی گھنٹہ کے حساب سے مل جاتی ہے۔ کچھ شوقین مزاج سعودیوں نے تو اپنی ذاتی دباب خرید رکھی ہیں۔ ریتلے ٹیلوں پر دباب چلانے کا یہ کھیل بہت مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

دوستی کا پُل (The Bridge of Friendship)

خُبر شہر کی سب سے بڑی خصوصیت انفرادیت اور دلچسپی کی حامل جگہ King Fahad Causeway ہے۔ الخُبر کی شان اور خوبصورتی کو چار چاند لگاتا یہ پُل جدید انجینئرنگ کا حسین شاہکار ہے۔ یہ پل مڈل ایسٹ کا سب سے لمبا اور بڑا اور دنیا کا دوسرا بڑا پل ہے۔ یہ پل الخبر سے بحرین کے دارالحکومت منامہ تک خلیج عربی کے اوپر بنایا گیا

ہے۔سعودی عرب میں اس پل کو "King Fahad Causeway" اور بحرین میں اس پل کو "Bahrain Bridge" کہتے ہیں۔

بحرین ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کی سمندری حدیں سعودی عرب سے ملتی ہیں۔ چنانچہ دونوں ملکوں کے درمیان باہمی رابطے بڑھانے کے لیے دوستی کا یہ پل تعمیر کیا گیا ہے۔ 25 کلومیٹر لمبے اس پل کا سنگ بنیاد 11 نومبر 1982ء میں رکھا گیا اور 26 نومبر 1986 کو اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔ اس منصوبے کی تکمیل پر 102 ارب ڈالر لاگت آئی اور یہ تمام خرچہ سعودی حکومت نے اٹھایا۔ کنگ فہد پل کے اوپر تین Lane کی دوطرفہ کشادہ سڑک بنائی گئی ہے جس پر روزانہ ہزاروں گاڑیاں آتی اور جاتی ہیں۔

جب ہم اس دلفریب اور بے مثل پل کے اوپر سفر کر رہے تھے تو میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی اوپر کھلا نیلا آسمان اور نیچے ہر سو گہرا نیلگوں پانی جس پہ اڑتے پھرتے آبی پرندے، ایسی قدرتی رعنائی دیکھ کر دل خود بخود اپنے رب کی بڑائی اور نیلا کرنے لگا۔

الخُبر سے جزیرہ نسان تک اس کا پہلا حصہ ہے۔ یہاں سعودی حکومت کی سمندری حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ دائیں طرف خوبصورت پارک ہے، مسجدیں، ریستوران، دکانیں ہیں۔ یہاں لوگ پکنک بھی منانے آتے ہیں، دائیں جانب بحرین کی چیک پوسٹ ہے اس کو کراس کریں تو Kingdom of Bahrain کی سمندری حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ بہت سے عرب شہزادے اور اہل ثروت لوگ اپنا ویک اینڈ منانے اسی راستے سے بحرین چلے جاتے ہیں۔

King Fahad Causeway کا ٹول ٹیکس 20 ریال ہے جو پاکستانی کرنسی میں 500 روپے سے زیادہ ہے۔ دوستی کا یہ پل الخُبر شہر کے ماتھے کا جھومر اپنی مثال آپ ہے۔ رات کے وقت روشنیوں سے جگمگاتا یہ پل دور سے دکھائی دیتا ہے۔

مصلّی النساء

سعودی عرب کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہاں لوگ بڑی پابندی اور باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں۔ اذان بلند ہوتے ہی دکانیں بند ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ شٹر گرنے لگتے ہیں، دکان دار صلوٰۃ صلوٰۃ پکارتے ہیں اور گاہک دکانوں سے باہر نکل جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے کاروبار زندگی معطّل ہو جاتا ہے۔ فرض نماز کے ادا ہوتے ہی معمول کا کاروبار دوبارہ رواں دواں ہو جاتا ہے۔

جمعہ کے دن تو عید جیسا ماحول ہوتا ہے۔ جمعہ کے وقت سڑکوں پر ٹریفک تقریباً مفقود ہو جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اجلے اجلے کپڑے پہنے اپنے بڑوں کی انگلی پکڑے جمعہ پڑھنے جاتے ہیں۔ نماز کے بعد مسجدوں کے

باہر خوب چہل پہل ہوتی ہے۔ پھل، سبزیاں اور دیگر اشیا کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں جو سستے داموں بکتے ہیں۔

زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کے لیے نماز پڑھنے کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ پارکوں میں، ساحل سمندر پر، شوپنگ مالز پر، یہاں تک کے ہائی وے پر بھی مصلّی النساء موجود ہوتی ہے یعنی "عورتوں کی نماز پڑھنے کی جگہ"۔ ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے راستے میں ٹھہرنے کے مقام جنھیں "محطہ" کہتے ہیں۔ وہاں بھی پٹرول پمپ، ریستوران، سپر اسٹورز کے علاوہ مردوں اور عورتوں کی علیحدہ علیحدہ مسجدیں بنی ہوتیں ہیں۔

ایک مرتبہ جب ہم جدہ سے الخُبر آ رہے تھے تو مغرب کے وقت ایک محطہ پر رُکے وہاں بھی حسب دستور مصلّی النسا موجود تھی جس میں لائٹیں جل رہی تھیں پنکھے چل رہے تھے اور اے سی بھی کام کر رہے تھے۔ مگر اتفاق سے وہاں اس وقت کوئی مسافر خاتون نہیں تھی۔ میں نے ڈرائیور کے اکیلے نماز پڑھی، واپسی پر اے سی بند کرنا نہ بھولی کیونکہ انرجی کسی ملک کی ہو اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔

عورتوں کی یہ مساجد ائر کنڈیشنڈ ہوتی ہیں۔ خوبصورت قالین بچھے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک رکھے ہوتے ہیں، جو عورتیں کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکیں ان کے لیے کرسیاں رکھی ہوتی ہیں، بعض مصلّی النساء میں تو خوبصورت فانوس اور قیمتی پردے بھی لگے ہوتے ہیں۔

خواتین کی یہ مساجد کسی نعمت سے کم نہیں، نماز پڑھنے کے علاوہ خواتین یہاں کچھ دیر کے لیے آرام بھی کر لیتی ہیں۔ جب مارکیٹ میں نماز کے وقت تمام دکانیں بند ہو جاتیں اور مردوں اور خواتین کے لیے مسجدیں بھی ہوں گی تو تب تمام خواتین و حضرات میں نماز پڑھنے کی تحریک پیدا ہو گی۔ اس کے علاوہ ہمارے بچوں میں بھی نماز پڑھنے کی عادت پڑے گی اور ترغیب ملے گی۔

چلتے ہو تو شاپنگ کو چلیے

الخُبر میں بہت سے چھوٹے بڑے شاپنگ مالز اور شاپنگ سنٹر ہیں، الراشد مال، الخُبر مال، طابا سنٹر، لولو سنٹر وغیرہ۔ اسے امیروں کا شاپنگ مال کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ غریب آدمی تو یہاں آتا ہی نہیں، مڈل کلاس بھی زیادہ تر اس کی خوبصورتی دیکھنے اور ونڈو شاپنگ کرنے آتی ہے۔ سیل لگی ہو تو شاید کچھ خرید لیں۔

خُبر کی کنگ عبداللہ روڈ پر واقع یہ مال 1995ء میں بنا۔ "Y" Shape میں بنے، اس مال کے پانچ فلور اور 1000 اسٹور ہیں جہاں خوبصورت ترین اور مہنگی ترین اشیا موجود ہیں۔ جن میں گھڑیاں، جیولری، جوتے، گارمنٹس، کاسمیٹکس، پرفیوم اور عبایے وغیرہ شامل ہیں۔ یورپ اور امریکا سے آئے ہوئے سیاح زیادہ تر یہاں سے شاپنگ کرتے ہیں۔

راشد مال میں تین خوبصورت فوارے بھی ہیں۔ Basement میں جو فوارہ ہے اس کا پانی مال کی چھت کے قریب تر جاتا ہے۔ اس وقت چھت اپنا رنگ تبدیل کرتی ہے یوں لگتا ہے کہ چھت سے دھواں اٹھ رہا ہے اور بارش

ہو رہی ہے۔ یہ فوارے رات کو خاص طور پر نگاہوں کا مرکز بنتے ہیں۔

مال کے تیسرے فلور پر جدید طرز کے کیفے ٹیریا بنے ہوئے ہیں۔ ٹاپ فلور پر بچوں کے لیے پلے لینڈ بھی ہے اور سارا ہنگامہ یہیں برپا ہوتا ہے۔ سیکڑوں بچے یہاں روزانہ آتے ہیں پھر بھی سارے مال کی صفائی ستھرائی تعریف کے لائق ہے۔ راشد مال کی مصلّی النسا بھی بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔

ایسے ہی ایک مہنگے مال میں مجھے ایک عبایہ پسند آیا جس کی قیمت 180 ریال تھی۔ عبایہ کا صرف نیچے کا برقع تھا اوپر کا حجاب یا دوپٹہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے شوہر لیاقت سے کہا کہ 150 ریال کہہ دیں مگر دکان دار نے اپنا بڑا سا سر نفی میں ہلا دیا، واپسی پر Escalator سے نیچے اترتے ہوئے میرے دماغ نے حسب عادت 180 ریال کو پاکستانی کرنسی میں تبدیل کیا تو عبایہ بہت مہنگا لگا۔ دل میں سوچا کہ اچھا ہوا کہ دکان دار نے انکار کر دیا بغیر حجاب یا دوپٹے کے اتنا مہنگا عبایہ خریدنے کی کیا تک بنتی ہے۔ شاپنگ کرتے وقت کبھی جلدی نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ بالکل وہی چیز کسی دوسری جگہ کم قیمت پر مل جائے تو پھر بڑا افسوس ہوتا ہے۔

سعودی عرب میں ہم پاکستانیوں کی ایک عجیب عادت بن جاتی ہے ہم لوگ جو بھی چیز خریدنے لگتے ہیں یا خرید لیتے ہیں تو اسے پاکستانی روپوں میں تبدیل کر کے دیکھتے ہیں کہ کتنے کی ہے۔ یہ اچھی عادت ہے، کیونکہ اکثر اشیا اپنے ملک میں کم قیمت پر دستیاب ہیں۔

باتھ روم کے اندر باتھ روم کی تلاش

Mall of Dahran پرنس فیصل بن فہد روڈ اور کنگ سعود روڈ پر واقع ہے۔ دہران مال کا صرف ایک ہی گراؤنڈ فلور ہے مگر اتنا طویل ہے کہ چلتے چلتے پاؤں دکھنے لگتے ہیں۔ دونوں اطراف میں خوبصورت اشیا سے سجی دکانیں ہیں درمیان میں کافی چوڑی راہداری ہے اس راہداری کے درمیان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف شکلوں کی بنی نشستیں جن پر بیٹھ کر لوگ دم بھر کر سانس لے لیتے ہیں۔

دہران مال کا 500 ریفریشمنٹ ایریا سکوئر میٹر ہے۔ جو سعودی عرب کے تمام مالز سے بڑا ہے۔ اس مال کے 200 اسٹور ہیں۔

چند دن پہلے ہم لوگ دہران مال گئے تو کافی دیر گھومتے پھرتے رہے۔ واپسی پر مجھے باتھ روم جانا تھا، چنانچہ باتھ روم کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تھوڑے فاصلے پر دو دکانوں کے درمیان ایک تنگ سا بغیر دروازے کا راستہ تھا جس کی دیوار پر Female Toilet لکھا تھا۔ میں اس تنگ سے راستے میں داخل ہو گئی، چند گز کے فاصلے پر راستہ کافی کھلا ہو گیا اور سامنے ایک بڑا سا دروازہ نظر آیا ایسا طویل القامت دروازہ جیسا مغل بادشاہ اپنے ہاتھیوں کے لیے بنوایا کرتے تھے۔ خیال تو یہی تھا کہ جونہی میں دروازہ کھولوں گی آگے واش رومز ہوں گے۔ مگر یہ کیا؟ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا بالکل سامنے ایک دکان تھی، چند لمحے تو میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ واش روم کے اندر دکان کہاں سے آ گئی؟ بائیں طرف دیوار پر بڑی سی گھڑی لگی تھی جس پر پورے سات بجے تھے مگر واش روم کے اندر دکان دیکھ کر میرے بارہ بجنے لگے۔ یہ دکان ایک عربی عورت عبایہ پہنے چھوٹا سا بچہ گود میں اٹھائے چلا رہی تھی۔ کچھ خواتین اور بچے اس دکان سے چیزیں خرید رہے تھے۔ دکان کے سامنے سے گزرتی ہوئی میں آگے بڑھی آگے بہت اونچی سی دیوار تھی وہاں ایک بینچ پر کچھ خواتین بیٹھی کپڑے

پل رہی تھیں۔ یاالٰہی یہ میں کہاں آ گئی؟ دائیں طرف کچھ فاصلے پر پھر ایک بڑا سا دروازہ تھا دل میں آیا کہ اس دروازے کے اس پار باتھ روم ہوں گے اس سے پہلے کہ میں دائیں طرف قدم اٹھاتی ایک نظر بائیں طرف دیکھا چند گز کے بعد راستہ بند تھا مگر وہاں سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ دیوار پہ لکھا تھا Toilet اور اوپر کی طرف تیر کا نشان تھا۔

میں نے سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔ دس بارہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک چھوٹا سا راستہ تھا جو دائیں طرف گھوم رہا تھا گمان یہی تھا کہ اب باتھ روم آئے گا مگر جیسے ہی میں دائیں طرف گھومی آگے مزید سیڑھیاں تھیں۔ چار قسطوں میں سیڑھیاں چڑھنے اور تین دفعہ راستہ گھومنے کے بعد جب میرا سر بھی گھومنے لگا تو اچانک سیڑھیاں ختم ہو گئیں۔ سیڑھیاں ختم ہونے کی خوشی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اوپر کا منظر دیکھ کر ایک بار پھر میرا سر چکرا گیا۔ جائیں تو جائیں کہاں؟

میرے دائیں طرف پھر ایک دکان تھی جس کے شیشے کے دروازے سے دو خواتین مجھے حیرت زدہ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ اب میں انھیں کیا بتاتی کہ کیا ہوا ہے؟ بالکل سامنے دیکھا تو آگے ایک دیوار تھی جس کے پار ایک ہی لائن میں سات آٹھ چھوٹے چھوٹے کمرے نظر آئے یقین کامل ہو گیا کہ منزل مقصود آ گئی ہے وہاں پہنچی ایک دروازہ کھولا تو ایک بار پھر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہاں ایک چھوٹی سی میز رکھی گئی اور دیوار پر ایک بڑا سا آئینہ لگا تھا۔ یہ تو Dressing rooms تھے۔ ان dressing rooms میں خواتین اپنے خریدے ہوئے کپڑے پہن کر ان کا سائز وغیرہ چیک کرتی ہیں تاکہ چھوٹا بڑا ہونے کی صورت میں تبدیل کرا لیں۔ میں نے تو کوئی کپڑے نہیں خریدے تھے اس لیے یہاں سے آگے بڑھی تو سامنے ایک وسیع برآمدہ تھا جس کے آخر میں دیوار کے ساتھ کالے رنگ کا لیدر کا ایک بڑا سا صوفہ رکھا تھا اور اس کے ساتھ خواتین کی مسجد تھی۔ مسجد کے قالین پر ایک موٹی سی عورت غالباً سو رہی تھی۔

میں نے ابھی تک کسی سے باتھ روم کی بابت نہیں پوچھا تھا۔ شاید میں خود ہی کولمبس کی طرح امریکا دریافت کرنا چاہتی تھی۔ مسجد سے آگے نگاہ کی تو سیدھے ہاتھ پر ایک لمبا سا برآمدہ تھا جس میں بچے بھاگ دوڑ رہے تھے اور خواتین کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ سوچا کہ اس طرف چلنا چاہیے اسی اثناء میں میرے بائیں جانب سے ایک چھوٹے سے راستے پر جو بظاہر نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ ایک عورت عبایہ پہنے ہوئے نکلی اور میرے پاس سے گزر گئی۔ سعودیہ میں عورتوں کے باتھ روم ان کے لیے بڑی محفوظ جگہ ہے یہاں نہ تو کوئی مرد آتا اور نہ ہی آنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اس لیے کچھ خواتین یہاں اپنا عبایہ اتار دیتی ہیں۔ میرے قدم بھی اس تنگ سے راستے کی جانب بڑھنے لگے آگے بہت کھلی جگہ تھی۔ دائیں طرف وضو کرنے کے لیے بہت سے نلکے لگے تھے۔ باتھ رومز کی آمد کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ مزید آگے بڑھی تو وہاں خوبصورت جدید طرز کے واش بیسن لگے تھے اور پھر آخر کار وہ مقام آ گیا جس کے لیے میں نے اتنی مسافت طے کی تھی۔

ان بڑے بڑے شاپنگ مالز کے باتھ رومز بھی بڑے صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ صفائی پر مامور خواتین ہر وقت اپرن باندھے، وائپر پکڑے مستعد نظر آتی ہیں۔ وضو کرنے کی جگہ ہو یا واش بیسن کے فرش کہیں پانی کھڑا نہیں ہوتا۔

سعودی عرب میں پٹرول سستا اور پانی مہنگا ہے۔ نلکوں میں جو پانی آتا ہے وہ پینے کے قابل نہیں ہوتا۔ پینے کا پانی بند بوتلوں میں ملتا ہے۔ اس بوتل بند پانی کی وجہ

سے قبض کی بیماری ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بال گرنے کی بھی عام شکایت ہے۔

سعودی عرب میں ٹرین کا سفر

سعودی عرب میں چار بین الاقوامی اور 21 مقامی ایئر پورٹ ہیں۔ اس کے علاوہ سات بندرگاہیں بھی ہیں مگر کچھ لوگ نہیں جانتے کہ سعودیہ میں ٹرین بھی چلتی ہے۔ چلتی ہے اور خوب چلتی ہے، دمام سے ریاض کے درمیان ریلوے نظام موجود ہے جس کا نام ''سعودی ریلویز آرگنائزیشن ہے۔ اس ریلوے لائن کا افتتاح 20 اکتوبر 1951ء کو شاہ عبدالعزیز نے کیا۔ ابتدا میں پٹری بچھانے کا مقصد یہ تھا کہ دمام کی بندرگاہ سے غیر ملکی سازوسامان دارالحکومت ریاض تک بآسانی لے جایا جائے۔ 1985ء میں ایک اور ٹریک بچھایا گیا اور یوں مسافر گاڑی بھی چل پڑی۔

اور اب سعودی حکومت اس ریلوے نظام کو مزید وسعت دینے جا رہی ہے۔ جبیل سے دمام اور ریاض سے جدہ ٹرین چلانے کا منصوبہ ہے جب کہ حاجیوں اور زائرین کی سہولت کے لیے مکہ سے مدینہ ٹرین چلانے کے منصوبے پر کام جاری ہے جو 14-2013 تک ان شاء اللہ پایہ تکمیل تک پہنچے گا اور پھر سعودی عرب میں بھی ریلوے کی ریل پیل ہو جائے گی۔ فی الوقت پورے سعودیہ میں ایک ہی ٹرین چل رہی ہے۔ دمام سے ریاض جانے والی یہ ریل گاڑی 450 کلومیٹر کا فاصلہ 4 گھنٹے 46 منٹ میں طے کرتی ہے۔ سارے دن میں چار ٹرینیں دمام سے ریاض آتی اور جاتی ہیں۔ میرے دیور ڈاکٹر شوکت محمود خان اپنی فیملی کے ساتھ ریاض میں رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی ان سے ملنے کے لیے اس ٹرین سے بارہا سفر کرنے کا موقع ملا۔ پہلی مرتبہ جب ہم ریاض جانے کے لیے دمام کے ریلوے اسٹیشن جا رہے تھے تو میرے ذہن میں پاکستان کے ریلوے اسٹیشن گھوم رہے تھے۔ جہاں اسٹیشن کے اندر اور باہر ہر طرف گہما گہمی ہوتی ہے۔ لوگوں کی آمدورفت، مسافروں کے تعاقب میں صدا لگاتے گداگر۔ سر پر دو تین منزلہ سوٹ کیس اٹھائے قلیوں کی بھاگ دوڑ۔ پلیٹ فارم پر کھڑکی کے راستے ٹرین میں منتقل ہوتی اشیائے خوردونوش اور ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگتے دوست اور رشتے دار..... ہر طرف شور، اک ہنگامہ۔

مگر یہاں سعودی عرب میں ٹرین کا تجربہ ذرا مختلف ثابت ہوا۔ ہماری اجرہ (ٹیکسی) الخُبر شہر سے نکلی اور بڑی شاہراہ سے ہوتی ہوئی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہوگئی اور ایک خاموش عمارت کے برآمدے میں جا ٹھہری۔ اس جگہ صرف دو تین کاریں کھڑی تھیں۔ مجھے لگا کہ شاید ٹیکسی ڈرائیور کسی غلط جگہ آ گیا ہے۔ ایسی خاموشی، ویران اور

مکہ سے مدینہ جانے والی ٹرین کا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچنے والا ہے

پراسرار عمارت تو کسی خفیہ ادارے کی ہو سکتی ہے ریلوے اسٹیشن کی نہیں، مگر جب ڈرائیور بڑے اعتماد سے ہمیں اتار کر چلا گیا تو ہم بھی سامان اٹھائے عمارت کے مین دروازے کی طرف چل پڑے اور وہاں شیشوں کے چکر کھاتے دروازوں میں گھومتے اندر داخل ہو گئے۔

اندر کا منظر کچھ ریلوے اسٹیشن جیسا ہی تھا۔ بائیں طرف ایک بہت بڑا ہال تھا جس میں صرف دس بارہ لوگ بیٹھے تھے۔ دائیں طرف لکڑی کی دیوار تھی جس کے آخر میں ایک خالی کاؤنٹر تھا۔ ناک کی سیدھ میں ٹکٹ گھر تھا۔ میں ہال کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور میرے شوہر لیاقت ناک کی سیدھ میں ٹکٹ لینے چلے گئے۔ ٹکٹ دینے کے لیے پانچ کاؤنٹر تھے نہ کوئی لائن نہ کوئی دھکم پیل۔ لوگ ایک مشین سے اپنا نمبر نکال کر بیٹھ جاتے اور جب کسی کھڑکی کے اوپر ان کا نمبر روشن ہوتا تو اٹھ کر ٹکٹ لے لیتے۔

ٹرین کا فی کس کرایہ 60 ریال تھا۔ میرے شوہر لیاقت ٹکٹ لے کر آئے تو پتا چلا کہ ٹرین جانے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ چنانچہ ہم بڑے Easy ہو کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنی دوست طاہرہ کو جدہ فون کیا اور اسے بتایا کہ میں اس وقت ریلوے اسٹیشن پر بیٹھی ہوں تو وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی کہ تم کون سے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھی ہو؟ جب میں نے اسے بتایا کہ یہاں دمام سے ریاض تک ٹرین چلتی ہے تو وہ حیران ہوئی۔ میری دوست دس سال سے جدہ میں رہ رہی ہے اسے بھی نہیں پتا کہ سعودی عرب میں کوئی ٹرین بھی چلتی ہے۔

آہستہ آہستہ ہال مسافروں سے بھرنے لگا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا توں توں بے چینی اور تجسس بڑھتا جا رہا تھا کہ جانا کس طرف ہے۔ پلیٹ فارم کدھر ہے؟ انفیئر خالی کاؤنٹر پر آ کھڑے ہوئے اور اپنے پیچھے لکڑی کی دیوار سے ایک دروازہ کھول دیا۔ تمام مسافروں کے ساتھ ہم نے بھی اس کی طرف پیش قدمی کی اور ٹکٹ چیک کرا کر اس نومولود دروازے میں داخل ہو گئے۔ آگے راستہ دو حصوں میں تقسیم تھا۔ دائیں طرف مردوں کی لائن تھی اور بائیں جانب عورتوں کی سائیڈ پر ایک پردہ لگا تھا۔ جس کے اندر ایک ذمہ دار عربی خاتون مسافر خواتین کو اوران کے ہینڈ بیگز کو چیک کر رہی تھی۔

مگر کچھ عرصہ بعد جب دوبارہ یہاں آنا ہوا تھا اور میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی تو کرسی پر ایک خوبصورت عرب دوشیزہ میز پر ٹانگیں رکھے بیٹھی تھی اور موبائل فون پر کسی سے محوِ گفتگو تھی۔ میں نے حسب معمول اپنا ہینڈ بیگ اس کے آگے کر دیا مگر اس نے اسی شان بے نیازی سے مجھے آگے جانے کا اشارہ کر دیا اور میں بغیر چیکنگ کے یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھ گئی کہ شاید اس کی کال چیکنگ سے زیادہ ضروری تھی۔

آگے دائیں طرف صرف مردوں کا ویٹنگ لاؤنج تھا اور بالکل سامنے فیملی انتظار گاہ تھی۔ چند منٹ ہم یہاں بیٹھے، ایک شیشے کے دروازے کو ریلوے ملازم نے باہر سے چابی لے کر کھولا تمام مسافر اس طرف لپکے۔ باہر دائیں سے بائیں کافی لمبا برآمدہ تھا۔ جس کی چھت پر بہت بھاری بھرکم فانوس لگا ہوا تھا۔ اس برآمدے کو ہم نے درمیان سے کراس کیا تو سامنے ایک ویران سے پلیٹ فارم پر چپ چاپ سی ٹرین ریاض کی طرف منہ کیے اور ہماری طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ سب سے پہلے Family Compartment تھا ہم اس میں سوار ہو گئے۔

گرے رنگ کی اس ٹرین کی کھڑکیوں کے پردے بھی گرے رنگ کے تھے۔ گاڑی مکمل ایئر کنڈیشنڈ تھی اور نشست گاہیں بہت آرام دہ۔ چونکہ ٹکٹ کے اوپر کوئی سیٹ

نمبر نہیں ہوتا اس لیے جس کا جہاں دل چاہے بیٹھ سکتا تھا۔ جب تمام مسافروں نے اپنی نشستیں سنبھال لیں تو دروازے بند ہوگئے نہ کوئی وسل نہ کوئی ہارن نہ چھک چھک نہ کوکو۔ بڑی آہستگی اور خاموشی سے ٹرین اپنی منزل کی طرف چل پڑی، ویران پلیٹ فارم پر ہاتھ ہلا کر الوداع کہنے والا کوئی نہیں تھا۔

ٹرین کے سپیکر سے کسی نے عربی زبان میں مسافروں کو خوش آمدید کہا اور سفر کی دعا پڑھی۔ ڈبے میں پاکستانی، انڈین، عربی، مصری سوڈانی فیملیز ہماری ہمسفر تھیں۔ ہمارا ڈبہ نجانے کتنے ملکوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ بڑے پرسکون ماحول میں سفر جاری تھا۔ نماز کا وقت ہوا تو اذان ہوئی۔ دمام سے ایک گھنٹے کی مسافت پر سب سے پہلے بقیق (Baqeeq) کا ننھا منا ریلوے اسٹیشن آیا ایسا لگتا تھا کہ ٹرین کسی کے گھر کے سامنے جا کھڑی ہوئی ہے۔ اندر سے اسٹیشن ماسٹر ایک مسافر کے ساتھ برآمد ہوئے اسے ٹرین میں سوار کرایا اور دو خواتین اور ایک بچہ جو ٹرین سے اترے تھے انھیں ہمراہ لے کر واپس اپنے ننھے منے اسٹیشن میں داخل ہوگئے۔ یہ ساری کارروائی دو منٹ میں ہوگئی اور ریل گاڑی دوبارہ چل پڑی۔

بقیق گزرنے کے آدھے گھنٹے بعد ھفوف (Hafuf) کا ریلوے اسٹیشن آیا۔ ھفوف بقیق سے بڑا شہر ہے اس کا پلیٹ فارم بھی کافی طویل تھا۔ یہاں ٹرین دس منٹ رکی، آدھے سے زیادہ مسافر اتر گئے اور اتنے ہی سوار ہوگئے اس کے بعد ٹرین ھفوف سے ریاض تک نان سٹاپ چلی۔ یہ سارا راستہ صحرائی تھا کہیں ریت کے چٹیل میدان تھے اور کہیں چھوٹے بڑے ریت کے ٹیلے۔ ٹرین کے دونوں اطراف ریت کا سمندر لہرا رہا تھا۔ راستے میں ایک مقام پر سرخ رنگ کی ریت آتی ہے جسے (Sand Dew) کہتے ہیں یہ سرخ ریت عام ریت سے موٹی ہوتی ہے اور جوتوں سے خود بخود جھڑ جاتی ہے۔ یہ لال رنگ کی ریت دیکھنے میں بھی بڑی خوش نما لگتی ہے۔

گاڑی کے باہر دھول اڑاتی ریت ہی ریت تھی کہیں تیز ہوا چلتی تو ریت کے بگولے اڑ اڑ کر ہماری ٹرین سے ٹکراتے اور اپنا سر پٹخ کر واپس چلے جاتے۔ نہ کوئی آبادی نہ کوئی سایہ تھا۔ اس بیابان میں پانی کا نام و نشان نہیں ملتا تھا مگر ہماری ٹرین میں دو تین مرتبہ کھانے پینے کا سامان لیے ٹرے آئی۔ پانی، چائے، جوس، برگر، بسکٹ، چپس وغیرہ جس کو جو پسند تھا خرید کر کھا سکتا تھا۔ دو تین مرتبہ خاکروب صفائی کرنے آیا اس لیے تو ٹرین اتنی صاف ستھری تھی۔

ھفوف اور ریاض کے درمیان باہر دیکھنے کو کچھ نہیں تھا سوائے ریت کے اس لیے بہت سے لوگ سو گئے۔ کچھ خواتین موبائل اور آئی پیڈ پر گیمز کھیلنے لگیں۔ میرے شوہر لیاقت سو گئے تو میں نے بھی ان کے لیپ ٹاپ پر گیم شروع کر دی۔ پھر تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

ریاض کے مضافات شروع ہوئے تو وہاں خانہ بدوش بدوؤں کی چھوٹی بڑی خیمہ بستیاں آباد نظر آئیں۔ یہاں میں نے بالکل سفید اور بالکل کالے رنگ کے اونٹ دیکھے۔ رات ڈھل گئی تھی اور منزل قریب آ رہی تھی۔ سعودیہ کی یہ ٹرین وقت کی بہت پابند نکلی پورے ٹائم پر ریاض کے ریلوے اسٹیشن پر جا کر کھڑی ہوگئی۔ جہاں میرے دیور اور ان کے بچے ہمیں لینے آئے ہوئے تھے اور یوں ٹرین کا یہ خوشگوار اور یادگار سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔

■■■

قیدیوں کی
تعلیم و تربیت
کس کی ذمہ داری ؟

معمولی جرائم کے ملزم ایک بار جیل آتے ہیں تو اگلی بار بڑے مجرم میں بدل جاتے ہیں کیوں؟

حبیب اللہ مجاہد سنٹرل جیل اڈیالہ۔ راولپنڈی

"جیدے! تو پھر آگیا؟" جیل ملازم نے جھاڑو ہاتھ میں پکڑے مشقت میں مصروف قیدی سے پوچھا۔ "ہاں جی" قیدی نے مختصر جواب دیا "کیا کر کے آیا ہے؟" ملازم نے پھر سوال کیا، تو قیدی نے اس بار بڑے فخر سے سر اٹھایا اور کہا "ڈکیتی مار کر آیا ہوں۔" "کتنی سزا ہوئی ہے؟" ملازم بھی دل چسپی سے جانے کیوں اس قیدی کے پیچھے پڑ گیا ہے؟ میں نے سوچا۔ قیدی نے جواب دیا "چھ ماہ قید با مشقت۔" "اچھا ہے اب ادھر ہی کم از کم چھ ماہ تو سکون سے گزارے گا باہر تو تجھے چین ہی نہیں آتا" اس بار ملازم نے پنجابی میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ قیدی اور ملازم کی اس گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور قیدی کا جیل آنا جانا لگا رہتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے قیدی کو بلایا اور پوچھا کہ وہ پہلے بھی جیل آیا ہے؟" اپنی تو آدھی زندگی جیل میں ہی گزری ہے جی۔ وہ کیسے؟ اس کے جواب میں جاوید عرف جیدا نے جو تفصیل سنائی وہ دلچسپ تو ہے ہی لیکن اس میں عبرت، سبق اور کئی سوال بھی ہیں۔

جاوید ایک غریب لیکن اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اور تین بہنوں کا اکیلا بھائی ہونے کی وجہ سے لاڈ پیار تو مل گیا مگر اس لاڈ نے جاوید کو خود سری میں مبتلا کر دیا۔ اسکول میں ہی اس کا اٹھنا بیٹھنا ایسے لڑکوں کے ساتھ ہوا جو لکھنے پڑھنے پر کم اور چھپ کر وڈیو گیمز اور فلمیں دیکھنے پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد جاوید گھر سے اسکول کے لیے نکلتا تو سارا دن

دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا۔ باپ نے ڈانٹا، سمجھایا لیکن آہستہ آہستہ بری صحبت نے اثر دکھایا۔ اب جاوید راتوں کو دیر سے گھر آیا کرتا، کبھی رات کو بھی نہیں آتا۔ اس کی عمر 17 سال کی تھی کہ ایک شب اسے پولیس نے آوارہ گردی کے جرم میں گرفتار کیا اور جیل بھیج دیا۔ جیل آنے کے بعد جاوید پہلے تو خوفزدہ ہوا، کیونکہ اس کے تصور میں جیل ایک خوفناک جگہ تھی۔ جیل میں کم عمر ہونے کی وجہ سے اسے نوعمر وارڈ (جسے منڈا خانہ بھی کہتے ہیں) میں رکھا گیا۔ نوعمر وارڈ میں پہنچ کر جاوید کو نہ صرف حیرت ہوئی بلکہ اس کا خوف بھی جاتا رہا۔ اس بیرک میں سب ہی کم عمر یعنی جاوید کے ہم عمر تھے۔ ان لڑکوں میں منشیات کے عادی بھی تھے، چوری اور ڈکیتی کے ملزم بھی۔ ایک گینگ ان لڑکوں کا تھا جو جیب کترے تھے۔ یہ لڑکے صبح شام اپنی وارداتوں کی کہانیاں سناتے، ایک دوسرے سے تجربات بیان کرتے۔ منشیات کے عادی لڑکوں کو جانے کیسے اور کہاں سے چرس اور پوڈرمل جاتا جسے وہ مزے لے کر پیتے اور اودھم مچاتے۔ رات بھر بیرک میں لگے ٹی وی کے سامنے بیٹھے جاوید کو یہاں پر تمام چیزیں دیکھ کر حیرت ہوئی۔

چند دنوں میں ہی اس کے کئی دوست بن گئے۔ شروع میں جب جاوید نے اپنا تعارف کرایا تو سب ہی اس سے پوچھتے کہ کس کیس میں آیا ہے؟ وہ جواب میں کہتا کہ ''آوارہ گردی'' تو اسے طنز کا نشانہ بنایا جاتا۔ جیل میں ان لڑکوں کی تربیت، تعلیم نام کو بھی نہیں تھی۔ جیل حکام کو اس بات کی فکر تھی نہ ضرورت کہ یہ لڑکے کس طرح دن گزارتے ہیں۔ کیا کرتے رہتے ہیں؟ ایک حوالدار جو خود ان پڑھ اور عمر رسیدہ تھا اس بیرک کا انچارج تھا وہ صبح آتا دروازے کھول دیتا، آئے ہوئے لڑکوں سے پارک کی صفائی کراتا، پھر کرسی پر دراز ہوتا۔ کئی لڑکے اس کے لاڈلے شمار ہوتے تھے وہ اس کے پاؤں داباتے، اپنے گھر سے آئی ہوئی کھانے پینے کی چیزیں اسے دیتے۔ اگر کسی دن بڑے افسران نے پارک کا دورہ کرنا ہوتا یا باہر سے کوئی دورہ کرنے آتا تو پہلی صف میں انہی لڑکوں کو بٹھایا جاتا جو پوچھنے پر سب اچھا کی رٹ لگاتے۔ نہ کوئی لڑکا نماز پڑھتا نہ کوئی ایسا کرنے کی ترغیب دیتا۔ جاوید کو یہاں جو ماحول میسر آیا وہ باہر سے بھی کئی لحاظ سے اچھا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے کئی لڑکے یہاں سے رہا ہو کر چلے گئے۔

چند دنوں کے بعد سیشن جج جیل کے ماہانہ دورہ پر آیا تو جاوید کے پرانے ساتھیوں نے اس کو سمجھا یا کہ وہ جج صاحب کو بتائے کہ وہ آوارہ گردی کے معمولی جرم میں کئی دن سے جیل کاٹ رہا ہے۔ اس سے کیا ہوگا؟ جاوید نے پوچھا تو لڑکوں نے کہا کہ جج صاحب چھوٹے اور معمولی جرائم کے ملزموں کو رہا کرنے کا حکم موقع پر ہی جاری کرتے ہیں۔ لیکن میں رہا ہو کر باہر جا کر کیا کروں گا؟ جاوید یہی سوچ رہا تھا کہ جیب کترا گینگ کے ایک لڑکے نے اس کو ایک طرف بلا لیا۔ یہ لڑکا دوسروں کی نسبت جاوید کے زیادہ قریب تھا۔ اپنی وارداتوں کی کہانیوں کے علاوہ یہ لڑکا اپنے ''فن'' کے بارے میں جاوید کو بہت کچھ سکھاتا بھی تھا۔ اب اس نے جاوید سے کہا کہ وہ باہر جانے سے کیوں گھبراتا ہے؟ جاوید نے اسے بتایا کہ باہر جا کر اگر گھر جائے گا تو ابا اس کی پٹائی کرے گا اور ممکن ہے گھر سے ہی نکال دے پھر وہ کہاں جائے گا؟ اس کے پاس تو کوئی ٹھکانہ بھی نہیں۔ اس لڑکے نے کہا کہ جاوید! مرد بن اب خود کمائی کر، باپ سے کیا لینا ہے میں۔ تجھے استاد کا پتا بتاتا ہوں، اس کے پاس جا اور خود کما کر عیاشی

کر۔ اس نے جاوید کو کمائی کا آسان طریقہ بھی بتایا اور ٹھکانے کا بھی کوئی مسئلہ نہ رہا۔ جاوید کم عمری اور بری صحبت پھر جیل میں ملزموں کی سنگت سے اب باقاعدہ مجرم بننے کی راہ پر لگ چکا تھا۔ چنانچہ جج صاحب سے سوال کرنے پر اسے رہا کر دیا گیا۔ باہر آکر جاوید نے پہلے تو گھر کا رُخ کیا جہاں باپ پہلے ہی اس کی آوارہ گردیوں سے تنگ تھا۔ دیکھتے ہی ڈانٹنے اور پھر پٹائی پر تل گیا۔ ماں نے ہمیشہ کی طرح بیچ بچاؤ کرانا چاہا اور بچا بھی لیا۔ لیکن اب اس کے باہر نکلنے پر پابندی لگائی گئی چند دن بعد اسے ایک مکینک کی دکان پر چھوڑ آیا۔ اس بہانے اسے کچھ آزادی ملی تو جاوید خوش ہوا۔ اگرچہ کام میں اس کا دل نہیں لگتا تھا لیکن گھر بیٹھنے سے تو بہتر تھا۔ لیکن یہاں بھی تربیت سے زیادہ غصہ اور مار کا قانون رائج تھا۔ ایک دن استاد مکینک نے اسے کسی چھوٹی سی بات پر ڈانٹا۔ روز روز کی ڈانٹ سے تنگ جاوید نے استاد کو ترنت جواب دیا۔ جھگڑا اور بدتمیزی کے بعد وہ استاد کی دکان کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر نکل آیا اب اسے جیل، جیل کے ساتھی اور ان کی باتیں یاد آئیں۔ جاوید جیب کترے کے بتائے ہوئے ایڈریس پر ''استاد'' کو تلاش کرنے نکلا۔ استاد نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک دو دن کی ٹریننگ کے بعد جب اسے خود ''کام'' کے لیے بھیجا گیا تو وہ گھبرایا ہوا سا تھا۔ شہر کے ہجوم، بازار میں گھبراہٹ اور ناتجربہ کاری کے باعث ''جیب'' کاٹنے سے پہلے ہاتھ پکڑا بیٹھا۔ پہلے تو لوگوں نے اس کی خوب دھنائی کی پھر پولیس کے حوالے کیا۔ پولیس نے اسے پھر جیل بھیج دیا۔ یوں بمشکل ایک ماہ بعد جاوید دوبارہ جیل آیا۔ اس سے بعد تو جیسے یہ اس کا معمول ہو گیا۔ وہ ہر بار کسی نہ کسی جرم میں آتا جو پہلے سے بڑھ کر ہوتا۔ نوعمر وارڈ میں اب وہ ''جیدا'' کہلاتا تھا۔ چند سال اسی طرح گزر گئے، جاوید عرف جیدا اب صرف جیل میں نہیں باہر بھی مشہور تھا۔ اس نے جیب کتروں کا گینگ بنا لیا۔ چونکہ اب اس کی عمر بڑھ گئی تھی اس لیے جیل آنے پر اسے بڑی عمر کے ملازموں کے بیرکوں میں رکھا گیا۔ یہاں بھی وہی ماحول تھا۔ نہ تعلیم نہ تربیت، نہ کوئی نگرانی نہ تخصیص۔ ایک ہی بیرک میں منشیات کے عادی، منشیات کے سمگلر، چوری، راہزنی کے مجرم، ڈکیت اور قتل کے ملزم سب ہی مشترک رہتے تھے۔ یہیں سے جاوید کی ترقی ہو گئی اب کے بار جیل سے نکلا تو وہ لمبا ہاتھ مارنے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ ڈکیتوں کے ایک گروہ کے ساتھ اس کے تعلقات بن گئے تھے۔ جیل میں ہی انھوں نے منصوبہ بندی کر لی تھی۔ باہر جاتے ہی جاوید نے کئی ڈکیتیاں ڈالیں۔ بالآخر ایک بار پھر پکڑا گیا۔ اب کے بار اس کے خلاف کیس مضبوط تھا۔ چنانچہ اسے چھ ماہ کی سزا ہو گئی۔

''مگر جیدا'' جاوید تھا تو ایک معصوم بچہ تھا۔ بری صحبت میں بگڑ گیا۔ پہلے صرف آوارہ گرد تھا۔ ایسے لڑکوں کے لیے جیل کی ہوا ضروری ہوتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جاوید جیسا بری صحبت کا ڈسا ہوا لڑکا جب جیل آتا تو جیل میں اسے بگڑنے کے بجائے بنایا جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ مزید بگڑ گیا، بگڑتا رہا جیب کترا اور ڈکیت بن گیا۔ اب اگلی بار جانے وہ کیا گل کھلائے؟ ایسا کیوں ہوا؟ کیا جیل آنے کا یا پولیس اور قانون کا اسے جیل بھیجنے کا یہ مقصد تھا کہ وہ مزید بگڑے؟ ہرگز نہیں۔ جیل کا تصور بنیادی طور پر یہ ہے کہ جو لوگ جرائم سے معاشرے میں خرابی پیدا کر رہے ہوں ان کو ایک مخصوص جگہ قید رکھ کر، آزادی سلب کر کے، باہر کے ماحول سے دور رکھ کر احساس دلایا جائے کہ اس نے غلطی اور جرم کا ارتکاب کیا

ہے تب ہی اس سے آزادی اور دوسری نعمتیں چھین لی گئی ہیں۔ ملزم کی اخلاقی، اصلاح اور تربیت کی جائے۔ اسے تعلیم اور تہذیب سے آراستہ کیا جائے۔ اسے ایسا ماحول اور موقع فراہم کیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو بدلنے پر غور کر سکے۔ اس سے ایسا برتاؤ کیا جائے کہ وہ اپنے برے فعل پر شرمندگی محسوس کر کے اصلاح کی طرف راغب ہو۔ خاص کر کم عمر ملزموں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے۔

لیکن اس کے برعکس ہوتا کیا ہے؟ آپ نے ملاحظہ کرلیا۔ جیل کی ان بلند وبالا دیواروں کے پیچھے کئی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔ ایسے کئی جاوید ہیں جو ایک بار جیل آتے ہیں تو یہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان لڑکوں، نوجوانوں اور بچوں بڑوں کا تعلق خدانخواستہ دشمن ملک یا دشمن قوم سے نہیں۔ یہ اسی معاشرے اسی قوم اور اسی مذہب کے فرزند ہیں لیکن جیلوں کے ان باسیوں کے بارے میں سوچنے ان کی تعلیم وتربیت، اصلاح اور ایک اچھا فرد بنانے کے بارے میں کوئی قانون سازی نہیں ہوتی۔ آج جو یہ کہا جارہا ہے کہ جیلیں جرائم کی یونیورسٹیاں ہیں تو غلط نہیں کہا جاتا۔ جاوید اس کی زندہ مثال ہے اور یہ ایک فرد نہیں بلکہ یہاں کئی ایسی جوانیاں ہیں جو جرائم کی راہ میں گنوائی جارہی ہیں۔

اگر آج کہا جائے کہ اس میں جیل حکام کا قصور ہے تو اتنا غلط بھی نہیں لیکن صرف یہی معاملہ نہیں ہے۔ جیل حکام کی بھی اپنی مجبوریاں ہیں۔ تعلیم، تربیت اور اصلاح کا کام ہر کسی کے بس میں بھی نہیں۔ ایک ان پڑھ حوالدار، ان پڑھ ملازم کیا کسی کی تربیت کرے گا؟ لہٰذا یہ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ جیلوں کے محکمہ میں ایسی اصلاحات لائے کہ جیل میں حفاظتی عملے کے علاوہ ایسے ماہر، پڑھے لکھے اور سمجھے ہوئے افراد کا تعین کر کے اس کے لیے کوئی خصوصی اہتمام کرے۔ جیل میں اگر کوئی تعلیم حاصل کرنا بھی چاہے تو اس کے لیے ماحول میسر نہیں۔

تعلیمی اداروں کی فیس، شرائط اور تدریس کے لیے اساتذہ کا نہ ہونا قیدی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جس طرح وفاقی حکومت نے لازمی تعلیم کا نیا قانون پاس کیا ہے اسی طرح ہر قیدی کی تعلیم بھی لازمی قرار دی جائے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ یونیورسٹیاں جیلوں میں تعلیم کے لیے اساتذہ اور مواقع فراہم کرنے پر توجہ دیں؟ کیا تعلیمی بورڈز اور ادارے ایسے پروگرام شروع نہیں کر سکتے کہ ایک قیدی ان کی کشش کی وجہ سے خود تعلیم کی طرف راغب ہو سکے۔ پنجاب کے خادم اعلیٰ نے کروڑوں روپے کے لیپ ٹاپ کی تقسیم سے بڑا نام کمایا۔ اپنے دور حکومت میں کئی ریکارڈ بھی قائم کیے، کیا وہ جیلوں میں قیدیوں کی تعلیم، تربیت اور اصلاح کے لیے کوئی انقلابی اقدام اٹھانے کا ریکارڈ بھی قائم کریں گے؟ آج ہر کوئی معاشرے میں بڑھتی بدامنی، جرائم اور نسل نو کی بے راہ روی کا رونا رو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم جیلوں میں قائم کرائم یونیورسٹیوں کو اصلاحی مراکز میں تبدیل نہیں کرتے۔ جب تک قید کو عذاب کے بجائے اصلاح، بگاڑ کے بجائے تربیت اور عقوبت کے بجائے تہذیب سیکھنے کا ذریعہ نہیں بنائیں گے۔۔۔ جاوید سے جیدا ڈکیت بنتے رہیں گے۔ اور معاشرہ اخلاقی جرائم اور بدامنی، قوم ترقی کے بجائے تنزلی اور ملک عروج کے بجائے زوال کی راہ پر گامزن رہے گا۔ کوئی ہے جو زندانوں کے باسیوں کے لیے اپنا کچھ وقت نکالے؟ کوئی حکومت، کوئی ادارہ، کوئی فلاحی تنظیم؟ کوئی سیاسی جماعت؟

اسیران قفس سے بے رُخی تکذیب ایماں ہے
کوئی ارباب گلشن تک یہ پہنچا دے پیام اپنا

سچا واقعہ

بوڑھے جاپانی نے معافی مانگ لی

ایک سری لنکن ڈاکٹر کی سچی کہانی، اس نے جنگِ عظیم دوم کی تباہ کاریاں خود دیکھی تھیں

ماہا فرنینڈو

یہ انیسویں صدی کے وسط کی بات ہے کہ بہتر مستقبل کی چاہ لیے میرے دادا سیلون (سری لنکا) سے برما جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے مختلف کام کر کے رقم جمع کی، رنگون کے قریب واقع ایک دیہہ میں زمین خریدی اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔ جب سیٹ ہوئے تو شادی کرلی۔

جب 1934ء میں میرا جنم ہوا تو میرے دادا برما میں بھرا پُرا خاندان چھوڑ کر چل بسے تھے۔ تب میرے والد رنگون میں مقیم تھے۔ انجینئر ہونے کے ناتے وہ اچھی ملازمت کر رہے تھے۔ ہمارا شمار کھاتے پیتے خاندان میں ہوتا۔

لیکن خوشیوں سے بھری ہماری زندگی 13 دسمبر 1941ء کو کافور ہوگئی۔ تب میں سات برس کی تھی۔ مجھے یاد ہے، اس دن میں گھر کے باغ میں کھیل رہی تھی کہ پہلی بار سائرن بج اٹھے۔ امی چیختی ہوئی آئیں اور مجھے قریب خندقی پناہ گاہ میں لے گئیں۔ اس زمانے میں ہم بچوں کو خبر نہ تھی کہ جنگ کیا شے ہے۔ چناں چہ ہم پناہ گاہ کی طرف بھاگتے تو یہی لگتا کہ یہ کوئی کھیل ہے۔ بعدازاں ''مطلع صاف ہے'' کا پیغام دینے والے سائرن بجتے تو ہم گھر واپس چلے جاتے۔ بہرحال جنگ کی تباہ کاریوں نے ہمارے معمولات بہت متاثر کیے اور زندگی پہلے جیسی خوبصورت و پُرلطف نہیں رہی۔

آخر خاندان کے بڑوں نے فیصلہ کیا کہ اب رنگون میں ٹھہرنا خطرناک ہے۔ چناں چہ جیسے ہی موقع ملا، ہم سب ایک ٹرک میں سوار ہوئے اور دادا جان کے فارم پہنچ گئے جسے میرے چچا سنبھالتے تھے۔ وہ رنگون سے تقریباً بیس کلومیٹر دور تھا۔ راستے میں ہمیں جاپانی بمباری سے پھیلی تباہی نظر آئی۔ جگہ جگہ عمارتیں وگھر ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے اور بے گھر مرد، عورتیں اور بچے کسی ٹھکانے کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ میرے خاندان نے دو ماہ فارم میں گزارے۔ جب بھی جاپانی طیارے بری فضا میں داخل ہوئے، سائرن بج اٹھتے۔ مجھے یاد ہے، ایک رات امی اور دو چچوں نے ہم بچوں کو سوتے سے اٹھایا اور ہم پناہ

گاہ کی سمت بھاگ اٹھے۔ ہم بچے بموں کے دھماکے سُن کر وہ کٹھن وقت کاٹتے۔

جنگ سے قبل ہم میز کرسی پہ اطمینان سے بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ ہمیں عمدہ غذائیں میسر تھیں۔ لیکن اب کھانے کا معمول بھی تہہ و بالا ہوا۔ فارم میں ایک جگہ دیگ چڑھا کر اس میں کھانا پکتا اور کھانا لینے کی خاطر سب بچوں کو قطار بنانی پڑتی۔ ہمیں افراتفری میں کھانا چھوڑ کر بھاگنا پڑتا۔

خوش قسمتی سے قبل از جنگ میرے والد بغرض ملازمت کینڈی، سیلون جا چکے تھے۔ لہٰذا دو ماہ گزر چکے تو بزرگوں نے نیا فیصلہ کیا کہ اب کینڈی میرے ابو کے پاس پہنچا جائے۔ چناں چہ جنوری 1942ء میں تقریباً سارا خاندان بڑودہ نامی بحری جہاز پر سوار ہوگیا۔ تب میں بہت چھوٹی تھی لہٰذا سمجھ نہ سکی کہ میری امی، چچیاں اور خالائیں کیوں رو رہی ہیں؟ پھر بھی اپنی سہیلیوں سے بچھڑنے کا مجھے بھی غم تھا۔ ہم ہندوستان کے راستے آخر کینڈی پہنچ گئے۔ وہاں جنگ کا نام ونشان نہ تھا لہٰذا ہم سکون سے مقیم ہوئے۔ پھر سیلون ہی ہمارا نیا وطن بن گیا۔ میں نے تعلیم پائی، ڈاکٹر بنی اور شادی کر کے محکمہ صحت میں ملازم ہوگئی۔

مئی 1985ء میں محکمے نے سات دیگر سری لنکن ڈاکٹروں کے ساتھ مجھے برائے تربیت جاپان بھجوایا۔ وہاں ہم نے ہسپتالوں کے دورے کیے اور جاپانی ڈاکٹروں سے ملاقاتوں میں مصروف رہے۔ لطف تو آیا لیکن میں جاپانیوں سے دور دور ہی رہی۔ ظاہر ہے، دوران جنگ جاپانی افواج نے جو ظلم وستم کیے تھے، انھیں بھلانا آسان نہیں تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ میرے خدشات خام ہیں۔ ہمیں جو جاپانی ملے، وہ بہت نرم مزاج اور مہذب تھے۔ ہسپتالوں کے علاوہ ہمیں تفریحی مقامات کا بھی دورہ کرایا گیا۔ ایک دن میزبان ہمیں ٹوکیو سے تیس کلومیٹر دور واقع کھمبیوں کے فارم لے گئے۔ کھانے پر جاپانی خاندان کی تین نسلیں موجود تھیں۔

کھانے کے بعد بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ نوجوان جاپانی رواں انگریزی بولتے تھے۔ لہٰذا وہ گفتگو کا ترجمہ اپنے دادا کو سناتے رہے۔ میری باری آئی تو اپنے متعلق بتایا کہ برما میں پیدا ہوئی۔ لیکن جب جاپان نے حملہ کیا تو ہمیں بڑی مشکلات سہ کر سری لنکا آنا پڑا۔ جب بوڑھے جاپانی نے میری گفتگو کا ترجمہ سنا تو پریشان ہوگیا۔ اچانک وہ اٹھا، قریب آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ بھی برما کی جنگ میں بحیثیت جونیئر افسر شریک تھا۔ لیکن اسے افسروں کے احکامات ماننے پر مجبور کیا گیا ورنہ وہ فوج سے نکالا جاتا تھا۔

میں نے پریشان بوڑھے کو کہا، ”آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ سے کوئی نفرت یا کدورت نہیں رکھتی۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔“ میری بات نے بوڑھے کو خاصا شانت کر دیا۔ وہ واپس اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ آج میں ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ جب بھی وہ بوڑھا جاپانی مجھے یاد آئے تو اپنے اندر لطف وانبساط کی لہر دوڑتی محسوس کرتی ہوں۔ وہ بوڑھا جنگ عظیم دوم میں اپنی کارگزاری پر بڑا نادم و پشیمان تھا۔ مگر میں نے اپنی باتوں سے اسے پُرسکون کر دیا۔ دراصل میں سمجھتی ہوں کہ زندگی بہت مختصر ہے، اسے قطعاً منفی جذبوں نفرت، حسد، انتقام جیسے برباد نہیں کرنا چاہیے۔ چھوٹی عمر میں جنگ دیکھنے اور سب کچھ کھو دینے کے باعث میری نظر میں مادی اشیا کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی۔ یہی سبق میں نے اپنے بچوں اور پوتے، پوتیوں کو بھی دیا۔ حقیقتاً شرافت، اخلاق اور عمدہ تعلیم کے سہارے انسان ہر قسم کی آفت کا سامنا کر سکتا ہے۔

■■■

بزنس سائیکالوجی

ملازمین کی کارکردگی بہتر بنانے والے 101 طریقے

ماجد جہانگیر

ان مالکان اور مینیجرز کے لیے خصوصی تحفہ جو اپنے ملازمین کی تعریف نہیں کر پاتے، وہ اپنے آپ کو اس عمل کے لیے کیوں اور کیسے تیار کریں کہ بہترین نتائج پا سکیں

چند برس قبل راقم کی نظروں سے ایک انگریزی کتاب ”دی ون منٹ مینیجر“ گزری۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ مینیجر کیونکر کسی بھی چھوٹے بڑے ادارے میں ملازمین سے بخوبی کام لے سکتے ہیں۔ کتاب میں پورا باب ”ایک منٹ کی تعریف“ پر مخصوص تھا۔ اس باب میں مصنفین نے اداروں کے مالکان اور مینیجروں پر زور دیا کہ وہ روزانہ اٹھتے بیٹھتے اچھا کام کرنے پر ملازمین کی تعریف کریں۔ اس چلن سے ملازمین کی نفسیاتی و جسمانی صحت پر خوشگوار اور مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مصنفین نے اس ضمن میں درج ذیل تجاویز دیں:

☆ جب کوئی ملازم عمدہ کام کرے تو فوراً اسے سراہیں، ہفتہ واری یا ماہانہ میٹنگ کا انتظار نہ کریں۔

☆ ملازمین پر واضح کریں کہ انھوں نے کون سا کام درست انجام دیا۔

☆ ملازم کو بتائیں کہ اس کی محنت سے آپ کو خوشی ہوئی اور یہ کہ عمدہ کام سے ادارے کو فائدہ پہنچا۔

☆ ان کی حوصلہ افزائی کریں تا کہ وہ آئندہ بھی معیاری کام انجام دیں۔

تعریف وستائش کئی خوبیاں رکھتی ہیں، مگر تعجب ہے کہ بہت سے مالکان، باس، مینیجرز وغیرہ اسے نہیں اپناتے۔ دراصل وہ تعریف کے ضمن میں تین چار خدشات میں گرفتار رہتے ہیں۔ مثلاً انھیں خدشہ ہوتا ہے کہ کسی ملازم کی تعریف کر ڈالی تو وہ تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کرے گا۔ بعض یہ ڈر رکھتے ہیں کہ ملازمین کو سراہا گیا تو وہ چاہیں گے کہ ان کے ہر معمولی اچھے کام کی بھی تعریف کی جائے۔

ان خدشات کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ ہر

ادارے میں وہی مالک یا مینیجر مقبول ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً ملازمین کی تعریف کرے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہے۔ یہی امر ایک اور انگریزی کتاب ''ملازمین کو انعام دینے کے 101 طریقے'' نے واضح کیا۔

اس کتاب کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ ملازمین کی تعریف کی جائے تو انھیں بڑا حوصلہ ملتا ہے۔ وہ پھر نئی توانائی اور جوش و جذبے سے کام کرتے ہیں۔ یوں ادارے کے لیے کامیابی و کامرانی پانا آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں سیکڑوں نجی و سرکاری اداروں میں تعریف و ستائش کا نظام ہی بالکل عنقا ہے اور لوگ اس تصور سے ہی واقف اور نا آشنا ہیں۔

مصنفین نے یہ امر اجاگر کیا کہ تین طرح سے غیر رسمی (Informal)، خاص کارنامہ انجام دینے پر اور رسمی طور پر ملازمین کی تعریف و ستائش کرنا ممکن ہے۔ ان میں سب سے اہم غیر رسمی تعریف ہے کیونکہ اسے معمولی منصوبہ بندی کے ساتھ اور کسی کوشش کے بغیر انجام دینا ممکن ہے۔ اس میں انھوں نے ایک دانشور کا یہ قول بیان کیا:

''ملازم کو کسی کام کا کہہ دینا بھی اسے متحرک بنا دیتا ہے۔''

کتاب کی رو سے درج ذیل پانچ باتیں ملازمین میں بڑی سرگرمی اور چستی سے کام کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہیں:

☆ جو ملازمین عمدہ کام کریں، انھیں ذاتی طور پر مبارک باد دیں۔

☆ اچھی کارکردگی دکھانے پر انھیں ذاتی نوٹ لکھ کر بھجوائیں۔

☆ ترقی دینے کے لیے کارکردگی کو ضرور مدنظر رکھیں۔

☆ جو ملازمین عمدہ کارکردگی دکھائیں، ان سے ملاقات کر کے انھیں مبارک باد دیں۔

☆ کامیابیوں کا جشن یوں منائیں کہ کام کرنے والے ملازمین کا حوصلہ بلند کرنے والی خصوصی میٹنگز رکھیں۔

امریکا، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں تمام چھوٹے بڑے اداروں میں محنتی اور فرض شناس ملازمین کو انعام دینے اور سراہنے کے مختلف طریقے موجود ہیں۔ مثلاً کبھی انھیں تحفے دیئے جاتے ہیں۔ کبھی نقد انعام ملتا ہے۔ کبھی چھٹی دی جاتی ہے، غرض مالکان کی سعی ہوتی ہے کہ وہ محنتی، باصلاحیت اور قابل ملازمین کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھیں۔ یوں ملازم دل لگا کر کام کرتے اور بیش بہا کامیابیاں دلوانے میں ادارے کی مدد کرتے ہیں۔

درج بالا کتاب سے تعریف و ستائش کے ایسے 101 سہل طریقے پیش ہیں جنھیں مالکان اور مینیجر بڑی آسانی سے اپنا سکتے ہیں۔ ان پر خاص خرچ بھی نہیں آتا۔ انھیں انجام دینے سے فائدہ ہی ہوتا ہے، کوئی نقصان نہیں۔ بلکہ تعریف ملنے پر ملازمین کا معیار کارکردگی بڑھ جاتا ہے۔

(1) شکریہ ادا کیجیے۔
(2) ملازمت کا ٹائٹل بدل دیجیے۔
(3) مشورہ مانگیے۔
(4) تحریری نوٹ لکھ کر دیں۔
(5) باسکٹ تحفہ میں دیں۔
(6) کھانا کھلائیے۔
(7) تھوڑی سی تنخواہ بڑھا دیجیے۔
(8) ایک دن غیر رسمی لباس میں آنے دیں۔
(9) اسٹاف نیوز لیٹر جاری کریں۔
(10) کامیابی کا بیج لگائیں۔

(11) میٹنگز میں ملازمین کی تعریف کریں۔
(12) کسی پروگرام کے پاس دیں۔
(13) مسکرا کر ملیے۔
(14) قریب ہو کر بات سنیں۔
(15) شعبے میں ترقی دے ڈالیں۔
(16) نیوز لیٹر میں کارنامے کو نمایاں جگہ دیں۔
(17) کسی دن اسے آسان کام کرنے دیں۔
(18) میٹنگ کی جگہ/وقت بدل دیں۔
(19) مبارک باد دیں۔
(20) حسن کارکردگی کا خط لکھیں۔
(21) بیچ پر فلم دکھائیں۔
(22) فلم کے مفت پاس دیں۔
(23) ایک دن کی چھٹی دے دیں۔
(24) روزمرہ استعمال کی اشیا بیگ میں بھر کر دیں۔
(25) تجاویز مانگیں۔
(26) دفتر کا دروازہ کھلا رکھیے۔
(27) ملازمین کی تجاویز کو سراہیں۔
(28) دفتر میں 15 منٹ کا مفت مساج کرائیں۔
(29) ملازمین کی تجاویز پر عمل کریں۔
(30) اچھی تربیت دلوائیں۔
(31) پارکنگ کی جگہ عارضی طور پر فراہم کریں۔
(32) بروشر میں نمایاں جگہ دیں۔
(33) نقدی بطور انعام دیں۔
(34) رضا کارانہ طور پر عملے کا کوئی کام کریں۔
(35) ماہانہ قرعہ اندازی کرا کر انعام دیں۔
(36) ٹیبل یا پتلون تحفتاً دیں۔
(37) طلائی ستارہ دیں۔
(38) ملازم کو بونس عطا کریں۔
(39) ملازم کو موقع دیں کہ وہ اپنے وقت کے حساب سے کام کرے۔
(40) کتاب یا میگزین تحفتاً دیں۔
(41) دفتر میں آرام کا وقفہ بڑھا دیں۔
(42) خصوصی کوپن دیں۔
(43) سی ڈی تحفے میں دیں۔
(44) تربیتی ویڈیو فلموں میں جگہ دیں۔
(45) اپنے گھر دعوت دیں۔
(46) ملازمین کی تجاویز و مشورے شائع کریں۔
(47) اسٹاف کمیٹیاں بنائیں۔
(48) نام کے بیج کھدوا کر دیں۔
(49) مفت تربیتی کلاسیں منعقد کریں۔
(50) تفریحی مقام پر بھجوائیں اور سارا خرچ برداشت کریں۔
(51) ملازمین کی کارکردگی کا موازنہ کریں۔
(52) ادھار رقم فراہم کریں۔
(53) ملازم کے کام کی نوعیت بدل دیں۔
(54) اپنے کاموں میں انھیں شامل کریں۔
(55) کسٹمر کیئر ایوارڈ دیں۔
(56) ملازمین کے مابین مختلف مقابلے کرائیں۔
(57) موسیقی کا شو منعقد کریں۔
(58) کرائے پہ کار لے کر دیں۔
(59) خوبصورت ٹائی پہننے کا مقابلہ کرائیں۔
(60) شانے پر محبت سے تھپکی دیں۔
(61) بزنس کارڈ پر تہنیتی جملہ لکھ کر دیں۔
(62) سستی جیولری تحفتاً دیں۔
(63) ورزش کے لیے وقت دیں۔
(64) خوبصورت اسٹیکر لگائیں۔

(65) اچھے سے ہوٹل میں پارٹی دیں۔
(66) ملازم کے بچے کی ایک ماہ کی فیس ادارے کی طرف سے ادا کریں۔
(67) بہترین آئیڈیا کا انعام رکھیں۔
(68) ملازمین کو میٹنگ کرنے دیں۔
(69) میٹنگز میں مقابلے کرائیں۔
(70) کسی پُرفضا مقام پر میٹنگ رکھیں۔
(71) تمام لوگوں کو کارنامے کے متعلق بتائیے۔
(72) ملازم کے پاس سواری نہ ہو، تو اسے اپنی گاڑی میں گھر پہنچائیں۔
(73) تعریف کرنے کے لیے منفرد جملے تخلیق کریں۔
(74) ملازم کو ساتھ کھانا کھلائیں۔
(75) گفٹ سرٹیفکیٹ دیں۔
(76) دفتر میں بہترین ملازمین کی تصاویر لگائیں۔
(77) شکریے کی ای میل بھیجیں۔
(78) ملازمین کو موقع دیں کہ وہ دوسرے ملازموں کی تعریف کریں۔
(79) فیس بک پر ستائش کریں۔
(80) ملازمین کے لیے کسی دن کھانے کی کوئی شے تیار کریں۔
(81) وقت پہ میٹنگز منعقد کریں۔
(82) میٹنگز مختصر کر دیں۔
(83) مہینے کا بہترین کارنامہ کا انعام تخلیق کریں۔
(84) سینیئر ملازمین کو مسلسل سروس ایوارڈ دیں۔
(85) پانچ سال مکمل ہونے پر خصوصی بونس دیں۔
(86) اپنی سرگرمیوں سے عملے کو آگاہ رکھیں۔
(87) السلام علیکم اور مرحبا کہیے۔
(88) ملازمین سے کہیے کہ وہ ادارے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں۔
(89) عملے کے بجائے خود فون سنیں۔
(90) سالگرہ کارڈ بھجوائیں۔
(91) قلم تحفتاً دیں۔
(92) کسی اچھے مشروب کی بوتل خرید کر دیں۔
(93) ہوائی جہاز کی سیر کروائیں۔
(94) جو ملازم کوئی نمایاں کارنامہ انجام دے تو اس کے نام کی تختی دفتر میں لگوائیے۔
(95) کرکٹ یا ہاکی کے مقابلے کی ٹکٹیں خرید کر دیں۔
(96) ادارے کی مصنوعہ اشیا ڈسکاؤنٹ پر دیں۔
(97) کسی دن دفتری اوقات میں ملازمین کے درمیان کسی آسان اور مقبول کھیل کا مقابلہ کرائیں۔
(98) کسی کے نام پر پروگرام رکھیں۔
(99) ملازم کے گھر پہنچ کر بیوی بچوں سے ملیں۔
(100) عام لوگوں کے سامنے ملازم کی ستائش کریں، دفتر کے ماحول کو پُرلطف بنائیے۔
(101) ملازم کے بچوں کے لئے تحائف اس کے گھر بھجوائیں۔

آخری بات

جو مالکان یا مینیجر ملازمین کی تعریف و ستائش نہیں کرتے وہ ان سے بہترین کام لینے میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ شروع میں ان کے لیے یہ عمل اپنانا یقیناً بہت مشکل ہوگا۔ لیکن وہ اس عمل کی خوبیاں مدنظر رکھیں تو ان کا کام آسان ہو جائے گا۔ یاد رہے تعریف کا عمل مشق سے آتا ہے۔ چناں چہ آپ دوسروں کی تعریف کرنے کی جتنی مشق کریں گے اتنا ہی اس عمل میں مشتاق ہو جائیں گے اور بے شمار فوائد کے علاوہ لوگوں کے دلوں میں محبت اور وفاداری پائیں گے۔ ■■■

آسیب بیتی

ایک فاریسٹ آفیسر کی زندگی کے دو سنسنی خیز واقعات
اسے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانا آتا تھا

محمد انار خان

میرا پورا بچپن اور آدھا لڑکپن انگریزی دور میں گزرا ہے۔ کوہستان نمک میں واقع میرا گاؤں ضلعی ہیڈ کوارٹر سے 100 میل دور تھا۔ سڑک، ٹرانسپورٹ، بجلی، گیس، ریڈیو، اخبار، ٹیلی فون، ٹی وی کی نام کی کوئی سہولت نہ تھی۔ ملحقہ گاؤں میں ڈاک خانہ تھا۔ انگریزی زبان میں لکھا ہوا کوئی سرکاری خط کسی اہل دیہہ کے نام آجاتا تو پڑھنے پر قادر صرف دو تین لوگ دستیاب ہوتے۔

چوپالوں میں گفتگو عموماً مویشیوں، فصلوں، کھیتوں کھلیانوں، میلوں ٹھیلوں، مذہبی تہواروں، مرغوں اور کتوں کی لڑائی، شادی بیاہ کی رسومات، لڑائی جھگڑوں، بارش، قحط سالی جیسے موضوعات کے اردگرد گھومتی۔ جب موضوعات ختم ہونے لگتے تو کوئی من چلا بھوت پریت اور چڑیلوں کا کوئی پرانا قصہ چھیڑ دیتا۔ پھر سنے سنائے سینہ بہ سینہ سفر کرتے قصے ختم ہونے میں نہ آتے۔

رات بھیگ جاتی اور چوپال خالی ہو جاتے۔

میرے ابا جی خاصے تعلیم یافتہ فوجی تھے۔ ہندوستان بھر کی مختلف چھاونیوں اور کئی بیرونی ممالک میں فرائض انجام دے کر ریٹائر ہوئے۔ عمل پسند انسان تھے، بھوت پریت اور چیڑیلوں کے قصوں کو انسانی ذہن کا واہمہ اور محض فرضی داستانیں خیال کرتے۔ ہمیں بھی یہی تعلیم دی کہ کوئی واقعہ سمجھ میں نہ آرہا ہو تو سائنسی بنیاد پر اس کی تحقیق و تجزیہ کرو اور معاملہ کی تہہ تک پہنچو۔ کبھی ایسے واقعہ کو بھوت پریت یا کسی چڑیل کی واردات خیال نہ کرو۔ یہ تعلیم ہمارے ذہن میں راسخ ہوگئی۔ لیکن زندگی میں دو واقعات ایسے پیش آئے کہ قدم ڈگمگانے لگے۔

1964ء میں شدت کی سردی پڑ رہی تھی۔ میں وادی سُون سکیسر (ضلع سرگودھا) کے ایک قصبہ میں بطور داروغہ جنگلات اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ پہاڑی جنگل وسیع و عریض رقبہ پر مشتمل تھا۔ اس کی قریب ترین حد میرے ہیڈ کوارٹر سے 4 میل دور تھی۔ آنا جانا پیدل ہوتا۔ جنگل کی آخری حد ملحقہ ضلع اٹک کی حدود کے ساتھ 18 میل دور تک چلی گئی تھی۔

ایک دن غروب آفتاب سے کچھ دیر قبل ایک مخبر میرے پاس آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ آج رات کسی وقت لکڑی چور جنگل کے مخصوص حصے سے لکڑی کاٹ کر اونٹوں پر لاد کر ملحقہ ضلع کی حدود پار کریں گے۔ وہ لکڑی نزدیکی قصبہ جات میں فجر کے وقت گلیوں میں چل پھر کر فروخت کرنا چاہتے تھے۔ جنگل کے اس حصے کا انچارج (فارسٹ گارڈ) اسی گاؤں میں ایک علیحدہ مکان میں رہائش پذیر تھا۔ اس کا پتا کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سویرے سے گشت پر نکلا ہوا ہے اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اب اس سے رابطہ کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس دور میں موبائل فون عنقا تھا۔ جنگل کی حدود تک پہنچنے کے لیے سوائے پیدل چلنے کے اور کوئی متبادل نہ تھا۔ بقیہ محافظان جنگل ملحقہ دیہات میں رہتے جو پانچ سے سات میل تک دور تھے۔ لہٰذا جنگل کے اُس حصے کی پہرے داری مجھے ہی کرنی پڑی۔

رات کا کھانا کھا کر میں چاندنی رات میں جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ چار میل کا فاصلہ اِکا دُکا چھوٹی آبادیوں سے ہٹتے ہوئے غیر معروف رستے پر چل کر دو گھنٹوں میں طے کیا۔ آخر میں مخبر کے بتائے حصہ جنگل میں پہنچ گیا۔ کافی دیر تک اونٹوں کے بلبلانے یا انسانی آوازوں پر کان لگائے رکھے۔ لیکن کوئی آواز نہ آئی۔ نصف شب بیت گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یا تو مخبری غلط تھی یا لکڑی چور میرے پہنچنے سے قبل واردات کر کے جا چکے تھے۔ ملحقہ ضلع کی حد ایک میل دور تھی۔ جنگل کی حدود پار کرتے ہی آگے رستہ ہموار آجاتا۔ مزید چھ میل دور وہ قصبہ واقع تھا جہاں لکڑی فروخت کی جانی تھی۔ اس قصبے میں میرا ایک ہم منصب رہائش پذیر تھا۔ ملزمان کی گرفتاری کے لیے وہاں سے مدد ملنے کا بھی امکان تھا۔ لہٰذا میں نے وہیں جانے کا فیصلہ کیا۔ بوقت سحر میں منزل کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے قصبے سے جُڑے وسیع قبرستان سے گزر کر آگے جانے کا ارادہ کیا۔ ابھی چاند غروب نہیں ہوا تھا اور خاصی دور تک دیکھنا ممکن تھا۔ قبرستان میں داخل ہو کر چند ہی قدم چلا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں عجیب سی نامانوس چاپ سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا تو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں اسے اپنا واہمہ سمجھا اور پھر آگے کی طرف قدم بڑھائے۔ فوراً ہی وہ مخصوص آواز میرے عقب میں آنا شروع ہوگئی۔ دوبارہ پیچھے مڑ کر

دور تک دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ یہ کسی انسان یا جانور کے قدموں کی چاپ نہ تھی۔ میرے رکنے پر آواز بند ہو جاتی اور چلنے پر دوبارہ آنے لگتی۔ میرا ماتھا پسینہ سے تر ہوگیا۔ قمیص کا گلا اور کالر بھی بھیگ گئے۔ میں نے کمر سے بندھی پیٹی سے اپنا پستول نکالا اور دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میگزین گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔ زبان پر آیۃ الکرسی کا ورد جاری ہوگیا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ دل کی دھڑکن سینے سے باہر بھی سنائی دے رہی تھی۔ اب اس بھوت یا چڑیل سے مکالمہ یا مقابلہ ناگزیر ہو چکا تھا۔ میں نے پہلو کے بل چلنے اور ساتھ ہی پیچھے دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی میں نے قدم بڑھائے تو مجھے محسوس ہوا کہ آواز میرے قدموں کے انتہائی قریب سے آرہی ہے اور کوئی شے میرے جوتوں سے لپٹنا چاہتی ہے۔ میں نے جھک کر چاروں طرف دیکھا تو معاملہ حل ہو گیا۔ قبرستان میں خودرو گھاس پھوس اور جڑی بوٹیوں کے خشک حصے جا بجا موجود تھے۔ ایک ہلکی سی ہلکے زرد رنگ کی کم وزن ٹہنی میری گرم چادر کے پلّو کی جھالر میں اٹک گئی تھی۔ بے دھیانی میں میری چادر کا ایک سرا خسک کر زمین کے برابر آگیا تھا۔ چنانچہ وہ ٹہنی جھالر میں الجھ گئی۔ اور چلتے وقت میرے پیچھے سرسراہٹ پیدا کرنے لگی۔ میں نے ٹہنی جھالر سے جُدا کی چادر کندھے پر ڈالی، پستول واپس پیٹی میں اڑسی اور آرام سے قبرستان پار کر گیا۔

دوسرا واقعہ 1977ء کا ہے۔ میں شاہ پور صدر (سرگودھا) میں فرائض انجام دے رہا تھا۔ کرائے کے مکان تبدیل کرنے کے بعد ایک بہتر گھر کرائے پر دستیاب ہوگیا۔ یہ مکان ایک طویل عرصے سے خالی پڑا تھا۔ ہم نے یہ مکان بڑی تگ و دو اور سفارشوں سے حاصل کیا۔ مالکان کھاتے پیتے لوگ تھے، انھیں کرائے کی معمولی رقم سے غرض نہ تھی۔ مکان کافی کھلا تھا، بڑے بڑے کمرے، برآمدہ اور بڑا سا صحن تھا۔ ایک کمرے کو جس کا دروازہ برآمدہ میں کھلتا تھا، ہم نے مرغیوں کے لیے رکھ چھوڑا۔ مئی کا مہینا تھا اور خاصی گرمی پڑ رہی تھی۔ دن لمبے ہو گئے تھے۔ بچے اسکولوں سے واپس آتے تو ہم کھانا کھا کر کچھ دیر کے لیے سو جاتے۔ اس دوران مرغیوں کو بلی وغیرہ سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کے مخصوص کمرے میں بند کر دیا جاتا۔ کمرے میں چوبی دروازہ نصب تھا۔ اس دور کے مطابق دروازے کے ایک پٹ میں قدِ آدم اونچائی پر زنجیر نما لوہے کی کُنڈی لگی تھی۔ کمرہ بند کرنے کی خاطر زنجیر نما کنڈی کا اوپر والا سرا، چوکھٹ کے بالائی حصہ میں لگے فولادی کنڈے میں پھنسا دیا جاتا۔ بالائی کنڈے میں بڑا سا سوراخ تھا، جس میں بوقت ضرورت تالا لگانا ممکن تھا۔ زنجیر نما کنڈی جب استعمال میں نہ ہوتی تو دروازے پر ایک تختے کے ساتھ لٹکتی رہتی۔

ایک دن میں سو کر اٹھا تو دیکھا کہ مرغیاں صحن میں پھر رہی ہیں اور ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ میں سمجھا کہ شاید آج بچیاں مرغیوں کو بند کرنا بھول گئیں۔ شام کو ان سے پوچھا تو بڑی بیٹی نے بتایا، اس نے خود مرغیاں بند کر کے کنڈی لگائی تھی۔ دوسرے دن پھر یہی ماجرا پیش آیا۔ مرغیوں کی پڑتال کی تو تعداد پوری تھی۔ اگلے روز پھر مرغیاں کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگائی گئی۔ بچوں کا ہوم ورک کچھ زیادہ تھا۔ وہ سونے کا پروگرام ملتوی کر کے برآمدے میں بیٹھ کر

لکھنے پڑھنے لگے۔ میں بھی ان کے اسکول کا کام دیکھنے لگا۔ میری اہلیہ چھوٹی بچی کو لے کر پاس ہی بیٹھی تھیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مرغیوں والے کمرے کے دروازے کی باہر والی کنڈی خودبخود ''کڑنگ'' کی آواز کے ساتھ اوپر والے کنڈے سے نکل کر نیچے آرہی اور تختے کے ساتھ جھولنے لگی۔ یہ دیکھ کر ہم سب ششدر رہ گئے۔ دروازے کے دونوں تختوں کے درمیان خلا پیدا ہوا ساتھ ساری مرغیاں پھڑاپھڑاتی ہوئی برآمدہ پار کر کے صحن میں چلی گئیں۔ ہم یہ سب غیر متوقع واقعہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہمیں فوراً یہ خیال گزرا کہ یہ کسی غیر مرئی نادیدہ قوت کی کارستانی ہے۔ میری اہلیہ کہنے لگی ''محلے کی عورتیں کہتی ہیں آپ کے آنے سے قبل یہ مکان طویل عرصے سے خالی پڑا تھا۔ اور یہاں کوئی کرایہ دار نہیں آیا۔ کیا پتا کوئی خاص وجہ ہو۔'' میری اہلیہ نے پھر طنزیہ انداز میں بچوں سے کہا ''شکر ہے آپ کے ابو خود موجود تھے اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اب ان سے کہو کسی سیانے سے جھاڑ پھونک کرائیں۔''

میں اٹھا اور دروازہ پورا کھول کر اندر جھانکا، کمرا بالکل خالی تھا۔ ہم نے اس کمرے میں کوئی سامان بھی نہیں رکھا تھا۔ میری حالت ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' والی تھی۔ نصف گھنٹہ سوچ بچار کے بعد میں نے ایک ترکیب سوچی۔ دوبارہ کمرے کے اندر گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ پھر بچوں سے کہا کہ دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دیں۔ بچوں نے کنڈی لگا دی۔ اب میں آسیب زدہ کمرے میں بند ہو چکا تھا۔ بچے سارا ماجرا بے یقینی اور تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اندر سے دروازے کے دونوں پٹ مضبوطی سے پکڑ کر زور سے دھڑ دھڑایا۔ باہر والی کنڈی خودبخود کھل کر نیچے آرہی اور تختے سے جھولنے لگی۔ اب میں ''چڑیل'' کو قابو کر چکا تھا۔ باہر آکر دونوں کنڈے بغور دیکھے۔ معلوم ہوا مسلسل استعمال سے لوہے کے کنڈے گھس گھس کر پھسلواں (Slippery) ہو چکے تھے۔ تختوں کی معمولی سی حرکت سے وہ پھسل کر اپنی جگہ چھوڑ دیتے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مرغیاں کمرے کے اندر بند رہ کر باہر والی کنڈی کیسے کھول لیتی ہیں؟ اب بچے بھی شیر ہو گئے۔ ہم نے مرغیاں پکڑیں اور کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔ پھر برآمدے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ کمرے کے اندر سے ٹک ٹک کی مہین آواز آنے لگی۔ کوئی تجربہ کار مرغی آہستہ آہستہ اپنی چونچ سے لگاتار دروازے کو ٹھوکر لگا رہی تھی۔ تختوں کے معمولی ارتعاش سے کنڈی پھسل کر اپنی جگہ چھوڑنے لگی۔ پانچ منٹ میں کنڈی کھل کر نیچے لٹک پڑی۔ یوں دونوں تختوں میں معمولی سے درز بن گئی۔ مرغی نے سر باہر نکالا اور گردن کے زور سے سوراخ چوڑا کر کے باہر آگئی۔ پھر یکے بعد دیگرے سب مرغیاں باہر آگئیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر میں واقعے کی وجہ پر توجہ نہ دیتا اور گھبراہٹ میں جھاڑ پھونک کا سہارا لیتا تو پورے محلے میں ہمارا مکان ''آسیب زدہ'' کی حیثیت سے مشہور ہو جاتا۔ پھر ہمیں بھی کسی نئے مکان کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑتا۔ جو جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بیوی کی ضد پر تنخواہ کا ایک حصہ نجومیوں، عاملوں، جادوگروں، گنڈے تعویز دینے والے اور دم کرنے والے نام نہاد بزرگوں کی نذر ہو جاتا۔ ■■■

ایک گرہستن کی آواز کا ماجرا
وہ یادوں کی دھند سے باہر لاتے ہوئے دو سوال بھی اٹھا گئی تھی

دور کی آواز

منشا یاد

گیٹ سے اپنے دفتر کے کمرے تک بہت سے سلاموں اور سلوٹوں کا ہاتھ یا سر کے اشارے سے جواب دیتے دیتے اور وولن کارپٹ پر بے آواز قدموں سے چلتے چلتے وہ اپنے دفتر میں داخل ہوا تو ائیر کنڈیشنر کی تازہ ہوا نے جگہ بنانے کے لیے میز پر رکھے پھولوں کی خوشبو کو باہر دھکیل دینا چاہا مگر اس کے عقب میں چپڑاسی کا کھولا ہوا دروازہ ہائیڈرالک ڈور کلوزر نے آہستگی سے بھیڑ دیا...... اس نے وال کلاک پر ایک سوالیہ نگاہ ڈالی اور اطمینان کا لمبا سانس لے کر اونچی بیک کی ریوالونگ چیئر میں دھنس گیا۔ آج اس کا اندر باہر تازہ قلعی کرائے برتن کی طرح دمک رہا تھا۔ صبح صادق یا کاذب کے وقت وہ ڈائزاپام کی دو ملی گرام کی ایک گولی سے 6 گھنٹوں کی گہری نیند سے جاگا تو ساری اکتاہٹ اور تھکن دور ہو چکی تھی۔ صبح کی سیر کے دوران میں سنی ہوئی کسی خوش الحان پرندے کی چہکار اب تک اس کے اندر جوں کی توں موجود تھی لیکن سائیڈ ریک میں کل کی رکھی ہوئی ایک موسٹ ارجنٹ کے فلیگ اور سرخ فیتے والی فائل پر نظر پڑتے ہی اسے کمرے میں سانپ کی پھنکار کا شائبہ ہوا اور اس کا چہرہ دھواں سا ہو گیا اور وہ جلدی سے سامنے رکھا انگریزی اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ مگر اخبار میں اس کا جی نہ لگا۔ یہ سب خبریں وہ گھر سے اردو اخبار میں پڑھ کر اور ٹیلی ویژن پر سن کر آرہا تھا۔ اس نے کمرے کی چیزوں سے آنکھ بچا کر کھڑکی کی گرل سے سامنے کے پہاڑ کی ہری بھری ڈھلوان پر نظریں دوڑائیں اور یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ باہر کا موسم بھی بہت خوبصورت ہو رہا تھا۔ خزاں کے موسم میں بہار کی سی گھٹا اُمڈی ہوئی تھی جو کھڑکی کے ٹنٹڈ شیشوں سے اور بھی اودی اودی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ کچھ دیر اس منظر میں کھویا رہا پھر اس کی نظر دفتر کے سامنے والے باغیچہ نما لان پر پڑی۔ اسے کالج کے زمانے کی ایک ایسی ہی خوبصورت صبح یاد آگئی۔ اس روز چھٹی تھی اور وہ اس کے ساتھ سیر کو نکلا تھا۔ اسے نیلوفر کی، جسے اس کی بیوی نی لوفر کہتی تھی، باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ بہت خوبصورت باتیں کرتی تھی۔ ان کی آہٹ پا کر آم کے پیڑ سے ایک طوطا اڑا تو کہنے لگی۔

''کیا تم نے بھی کبھی اس طرح سوچا ہے؟''

''کس طرح؟''

''کہ کبھی ہریل طوطے اور دوسرے پرندے بھی پیڑوں کا حصہ ہوتے ہوں گے۔''

''وہ کیسے؟''

''ابھی جب پیڑ کی ڈال سے طوطا اڑا تو ایک لمحے کے لیے مجھے لگا جیسے ہرا ہرا پتا اڑا ہو۔''

اسے یاد آیا۔

اسے اُڑتی ہوئی ساری چیزیں اچھی لگتی تھیں۔ بادل، پرندے، ہوائی جہاز، پتنگیں اور تتلیاں۔ وہ ہر اُڑتی ہوئی چیز کے ساتھ اُڑنے لگتی۔ دن کو تتلیوں اور راتوں کو جگنوؤں کے ساتھ لکن میٹی کھیلتی۔ تتلیاں اسے اُڑتے ہوئے پھول..... اور پھول ٹہنیوں پر دم لینے کو رکی ہوئی تتلیاں معلوم ہوتے..... زمینی چیزوں میں اسے پھول، پانی اور شعر بہت پسند تھے۔ شائد اس لیے بھی کہ پھول تتلیاں اور خوشبو کی صورت، پانی بادل اور پھوہار بن کر اور شعر سُر اور لَے کے ہنڈولوں میں بیٹھ کر پرواز کر سکتے تھے۔ اسے سیکڑوں اشعار یاد تھے۔ خود شعر نہیں کہتی یا شائد کہہ نہیں سکتی تھی مگر لگتا ایک وحشی غزال ہر وقت اس کے اندر زنجیریں توڑنے کے لیے تنگیا تا رہتا تھا۔

پتا نہیں اسے نیلوفر کی اور کتنی باتیں یاد آتیں لیکن انٹر کام کی ٹرن ٹرن اسے واپس لے آئی۔

''یس سر..... جی جی..... ٹھیک ہے سر۔''

جب وہ باس سے بات کر رہا تھا اور موسٹ ارجنٹ کے فلیگ والی فائل کے بارے میں ہدایات لے رہا تھا تو درمیان میں جیسے انٹرپشن سی ہوئی اور ایک لمبی سسکاری ابھری۔ یہ آواز باس کی تو ہو نہیں سکتی تھی، نہ ہی گفتگو کے موضوع اور محل میں اس قسم کی غیر دفتری بات کی گنجائش تھی۔ ٹیلی فون میں کراس ٹاک ان دنوں عام تھی اس لیے اس نے باس سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ انہوں نے بھی یہ آواز سنی تھی یا نہیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب وہ ڈکٹیشن دے رہا تھا تو اسے وہی لمبی دردناک سی سسکی دوبارہ سنائی دی اور جیسے لوکل اور فاصلاتی ٹیلی فون کالز کے فرق کا اندازہ خود بخود ہو جاتا ہے اسے بھی آپ ہی آپ پتا چل گیا کہ آواز کہیں دور سے آئی تھی۔ پھر بھی اس نے احتیاطاً اسٹینو سے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔ کیا خبر اس کے اندر کوئی چیز چٹخی ہو کسی نئے یا پرانے دکھ کا کوئی تار جھنجھنایا ہو۔

''تم نے کچھ کہا مس عارفہ؟''

''نہیں سر۔''

''کوئی بھولا بسرا دکھ؟''

''نہیں سر۔''

''تو پھر یہ آواز کس کی تھی؟''

''کون سی آواز سر؟''

''پتا نہیں..... مجھے لگا جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔ تھوڑی دیر پہلے بھی آئی تھی۔''

''میں نے تو نہیں سنی سر۔'' وہ بولی ''ہو سکتا ہے آپ کا وہم ہو۔''

''ہاں شائد میرا وہم ہی ہوگا'' اس نے کہا۔ ''اچھا چھوڑو..... تم لکھو۔ یہ نوٹ آج ہی اوپر بھجوانا ہے'' اور

وہ ڈکٹیشن دینے میں مصروف ہوگیا۔

دن بھر ٹیلی فون کالز، فائلیں اور ملاقاتی آتے جاتے رہے لیکن اسے پھر یہ آواز سنائی نہ دی۔ اس نے خود کو تشفی دینا چاہی کہ یہ اس کا وہم ہی ہوگا مگر شک کی سرسراہٹوں سے اس کا اندر پوری طرح خالی نہ ہوسکا۔ سسکی جیسے اس کی روح سے چپک سی گئی تھی اور کمرے میں بند بھونرا مکھی کی طرح وقفے وقفے سے بھنبھنانے لگتا تھا۔ گھر آکر بھی ٹیلی فون کی ہر گھنٹی اور کال بیل کی ہر ڈنگ ڈانگ پر اس کا دل ڈولنے لگتا۔ قیلولے کا سارا وقت ڈائریکٹ ڈائلنگ کالز کی نذر ہوگیا مگر اسے کچھ پتا نہ چل سکا کہ کون کس مصیبت میں ہے۔ یہاں تک کہ اس نے ایک طویل عرصہ کے بعد اس گھر میں بھی فون کروالیا جس کے ایک کمرے میں ایک اکیلے فرد نے آہوں اور سسکیوں کا بینک قائم کر رکھا تھا۔ اس بینک کے متمول کھاتہ داروں کے فکس ڈیپازٹس سود در سود کے بعد دگنے چوگنے ہو چکے تھے مگر وہ صرف جمع کراتے تھے ڈرا کرانے کبھی کوئی نہ آتا تھا۔

رات کو سونے سے پہلے وہ میوزک ڈیک پر پروین سلطانہ سے اکتال میں خیال بلمپت سن رہا تھا کہ صفیہ اس کی بیوی اپنی بھانجی کی شادی کے سلسلے میں کی گئی شاپنگ دکھانے لائی۔ اس نے آتے ہی سوئچ بند کردیا اور بولی:

''یہ کیا سنتے رہتے ہیں آپ..... ایک ہی لفظ کی رٹ۔''

پھر وہ سونے کا ایک جڑاؤ سیٹ چھاتی پر پھیلا کر بولی ''کیسا ہے؟''

''کس دن جچا کروں تیرو نام۔'' پتا نہیں پروین سلطانہ کے بول بند کیسٹ سے کیسے باہر نکل آئے۔

''بہت اچھا ہے۔'' وہ کہنا چاہتا تھا مگر صرف اثبات میں سر ہلا سکا کہ درمیان میں پھر وہی سسکاری آگئی تھی۔ اس بار آواز اور بھی صاف اور واضح تھی مگر پہچان مشکل تھی۔ شائد کہیں بہت دور سے آرہی تھی اور دور کی آوازوں کی پہچان کے سلسلے میں وہ ایک طویل عرصہ سے آؤٹ آف پریکٹس تھا۔

صفیہ چلی گئی تو وہ دیر تک گم سم بیٹھا مختلف دوستوں، رشتہ داروں اور ساتھیوں کے بارے میں سوچتا رہا کہ پتا نہیں کون کہاں کس تکلیف یا مصیبت میں ہے۔ مگر اسے کچھ اندازہ نہ ہوسکا۔ البتہ اس میں اب کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ اس کی دور کی آوازیں اور آہٹیں سننے کی کھوئی ہوئی صلاحیت پھر سے بحال ہوگئی تھی۔

آہٹوں اور آوازوں کے بارے میں وہ بچپن ہی سے بے حد حساس تھا۔

جب وہ اسکول میں پڑھتا اور تین میل کا فاصلہ پیدل طے کرکے ساتھ والے گاؤں میں جاتا تھا تو کبھی دیر ہو جانے کی صورت میں اسکول کی پہلی گھنٹی سب سے پہلے یا بعض اوقات صرف اسے ہی سنائی دیتی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک دم رک جاتا اور مویشیوں کے ڈکرانے، کتوں کے بھونکنے، پرندوں کے چہکنے اور کسانوں کے ماہیے ٹپے گانے کی بھانت بھانت آوازوں سے الگ کرکے اسکول کی گھنٹی کی آواز سنتا تو اس کے ساتھی لڑکے دنگ رہ جاتے مگر بحث کرنے یا شک کا اظہار کرنے کے بجائے سرپٹ دوڑنے لگتے تاکہ دوسری گھنٹی سے پہلے اسکول پہنچ سکیں۔

اسکول کی گھنٹی ہی نہیں اسے چار پانچ میل کے فاصلے سے گزرتی پکی سڑک کی لاریوں، ٹرکوں اور ویگنوں کے انجنوں اور ہارنوں کی آوازیں بھی صاف سنائی دیتیں۔ جوں ہی کوئی لاری نہر والے اسٹاپ پر پہنچ کر

رفتار کم کرتی وہ "رک گئی رک گئی" کا نعرہ لگاتا اور لڑکے گاڑی کے رکنے پر خوشی سے یوں بغلیں بجاتے جیسے وہ گاڑی انہی کے لیے رکی ہو۔ پھر وہ کمنٹری کے انداز میں بتاتا جاتا۔ اب سواریاں لے رہی ہے۔ اب پھر چل پڑی ہے۔ لو وہ تیز ہو گئی۔ اب اور تیز۔ لو وہ پیچھے سے دوسری آگئی...... ارے نہیں...... یہ تو ٹرک ہے۔ بہت سامان لدا ہوا لگتا ہے۔ جبھی گھسٹ گھسٹ کر چل رہا ہے۔

لڑکے ٹامک ٹوئیاں مارتے۔ گردنیں گھما گھما کر، ایڑیاں اٹھا اٹھا کر ہوا میں آوازیں ٹٹولتے۔ اونچے ٹیلوں پر چڑھ کر اور سماعتوں کے جال پھیلا کر آہٹوں کے پرندے پکڑنے کی کوشش کرتے۔ مگر آخرکار اپنے کانوں کے اندھے پن سے مجبور ہو کر ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگتے۔

شروع شروع میں بعض لڑکے اس کے دعووں کو گپ سمجھتے تھے مگر اس کی تصدیق یا تردید آسان نہ تھی۔ اول تو آوازیں ان کے دام شنیدن میں پھنستی ہی نہیں تھیں اور اگر کبھی بارش کے بعد فضا صاف ہوتی یا آس پاس کا شور کم ہوتا تو بھی ان کے لیے بسوں، ٹرکوں اور ویگنوں کی آوازوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہ ہوتا۔ لیکن پھر اس کی آزمائش کے کئی مواقع آئے۔ پھاگن چیت میں کوئل سب سے پہلے اسی کے کان میں آتی، گزرگاہوں سے ہٹ کر گندم کی ہری بھری فصلوں میں چھپ کر پٹاکتے تیتر اور بٹیر سب سے پہلے اسے ہی بشارت کا سندیسہ دیتے، اسکول سے لوٹتے ہوئے وہ گاؤں میں ہونے والے مداری کے تماشے، ڈگڈگی کی آواز پر ناچتے ریچھ، بندر، جوڑی چمٹے کے ساتھ گائی جانے والی جگنی یا دوپٹا اوڑھ کر ناچتے ہوئے بھانڈ لڑکے کے گھنگھروؤں کی چھنا چھن کی خبر دیتا تو ساتھی لڑکے گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی اس کھیل تماشے میں شریک ہو جاتے۔ دُھنیے کی دھن دھن، آٹا چکی کی ٹوہ ٹوہ، خراس کی گھمر گھمر اور پنگھٹ کی چرخی کی روں روں کی آوازیں اسے گاؤں سے باہر آملتیں۔ آس پاس کے کسی گاؤں سے کبڈی، بیاہ یا ونگار کے ڈھولوں کی گھمکار آتی، کسی بچے کی پیدائش یا ختنوں پر زنانہ کپڑوں اور مردانہ آوازوں والے کُھسرے کہیں دفیں بجا کر ناچتے یا بینڈ باجے کے ساتھ بارات چڑھتی تو اسے خبر ہو جاتی۔ لڑکے شرطیں لگاتے اور ہمیشہ ہار جاتے۔

اسے یاد آیا۔ جیٹھ اور اساڑھ کے مہینوں میں جگہ جگہ عرس اور میلے لگتے۔ رہس دھاریے سوانگ رچاتے، پتلیوں کے تماشے دکھائے جاتے۔ میلوں ٹھیلوں میں پنگھوڑے سرکس اور تھیٹر لگتے۔ وہ جس میلے میں نہ جا سکتا اسے رات کو کانوں کی مدد سے دیکھتا اور لڑکوں کو دکھاتا۔ یار بیلی اس کے گرد گھاس پر چوکڑیاں مار کر بیٹھ جاتے اور چوپال کے حقے کے انداز میں باری باری کش لے کر سستی قسم کے سگریٹ پیتے اور اس سے سرکس، تھیٹر اور موت کے کنوئیں کے باہر بجتے فلمی گیتوں کے بول اور نئے شو کے ٹکٹ کھلنے کے اعلانات سنتے۔ وہ آوازوں سے پورنے ڈال دیتا۔ تصویروں میں رنگ وہ خود بھر لیتے اور مچانوں پر چڑھ کر ناچتے ہیجڑوں اور اچھل کود اور شرارتیں کرتے مسخروں کو آپ دیکھ لیتے۔ موت کے کنوئیں کی موٹر سائیکل سٹارٹ ہوتی اور چلانے والا ایک نازک اندام لیڈی کو آگے بٹھا کر پوری رفتار سے کنوئیں کے اندر چکر لگاتا تو لکڑی کی دیواریں ہلارے کھانے لگتیں۔ وہ ساتھ ساتھ چکر گنتا جاتا۔ ایک...... دو...... گیارہ بارہ...... پھر موٹر سائیکل کی آواز مدھم پڑنے لگتی اور وہ نیچے اتر کر بند ہو جاتی تب

کہیں لڑکوں کی جان میں جان آتی۔

اسے یاد آیا جب وہ آٹھویں جماعت میں تھا۔ ایک صبح چھت پر سوتے ہوئے اس نے چالیس پچاس میل دور شہر میں اوپر نیچے ہونے والے دھماکوں کا دھرواس سنا لیکن کسی کو اس کی بات کا یقین نہ آیا۔ نمبردار کا بیٹا رات ہی شہر سے آیا تھا اور شہر میں ہر طرح کا امن و امان بتاتا تھا۔ لیکن سہ پہر کو جب ماسٹر گلزار شہر سے لوٹے تو انھوں نے دھماکوں کی تصدیق کر دی تاہم یہ دھماکے بموں کے پھٹنے کے نہیں تھے۔ شہر میں باہر کے کسی ملک کا کوئی سربراہ آیا تھا جسے اکیس توپوں کی سلامی دی گئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد آوازوں اور آہٹوں کے بارے میں اسے جیسے چیمپئن تسلیم کر لیا گیا اور اس کے ہر دعوے پر یقین کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب جو شرعی معاملات میں گاؤں کے دو بالغ مردوں کی شہادت کو بھی ان کے ان پڑھ اور جاہل ہونے کی وجہ سے نہیں مانتے تھے اس اکیلے کی گواہی کو تسلیم کرنے لگے۔ عام دنوں میں تو ...ے گاؤں کے نقارہ کی آواز صاف سنائی دے جاتی مگر موسم خراب ہوتا یا ہوا مخالف ہوتی تو اسی کے کانوں کے ریڈار پر بھروسہ کرنا پڑتا۔ اس کے کہنے پر مولوی صاحب افطاری کی نوبت بجانے کا اعلان کر دیتے۔

اسے ایسے کتنے ہی واقعات اور حادثات یاد آئے جن کی اسے پیشگی اطلاع مل گئی۔ ٹڈی دل کا شور، آندھی اور بارش کی شوکر، سیلاب کی چنگھاڑ۔ بلکہ دو ایک بار تو لیٹے بھونچال کی خبر بھی دوسروں سے کچھ دیر پہلے ہو گئی تھی۔ جن دنوں وہ کالج میں پڑھتا تھا ایک رات ہیٹر کے پاس بیٹھ کر ایٹ پوئٹس کی نظمیں یاد کرتے اس نے اپنا نام سنا اور ہڑبڑا گیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی انسانی آواز نے اس کا نام لے کر پکارا ہو۔ پہلے تو اسے ہول آیا۔ کہیں کوئی جن بھوت کوئی ڈائن یا چڑیل نہ ہو۔ مگر آواز میں پوشیدہ دکھ کو محسوس کر کے وہ اپنے گھر والوں کے لیے فکرمند ہو گیا۔ اس کے روم میٹ نے اسے اس کا وہم قرار دیا اور تشفی دی مگر اگلی صبح ابھی وہ ناشتہ بھی نہ کر پایا تھا کہ گاؤں سے آدمی آ گیا۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اسے آخری وقت میں یاد کرتی اور پکارتی رہی تھیں۔

لیکن جب وہ ایم اے میں پہنچا اس کی آوازیں اور آہٹیں سننے کی ساری صلاحیت اپنی کلاس فیلو نیلوفر تک محدود ہو گئی۔ وہ لیکچر کے دوران بھی اس کے اندر کی سرگوشیاں سن لیتا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے اتنے قریب آ گئی کہ وہ اس کی ہر بات کہے بنا جان لیتا۔

کئی بار وہ اسے اگلی صبح یہ بتا کر ششدر کر دیتا کہ رات وہ اس کے بارے میں کیا سوچتی رہی ہے۔ ایم اے کے دو برسوں میں اگرچہ ایک سال گیپ کا بھی آیا لیکن پہر پہر جتنے یہ سات سو اکتیس دن یوں گزر گئے جیسے کسی ریموٹ کنٹرول نے وقت کی فلم کا فاسٹ فارورڈ بٹن مسلسل دبا رکھا ہو بلکہ بعض شب و روز تو آئے بغیر ہی گزر گئے۔ امتحان ہو گیا...... راہیں جدا ہو گئیں تو گاؤں پہنچ کر اسے عقل آئی کہ لیکچرز پورا کرنے اور امتحان میں پاس ہونے کی اتنی بھی کیا جلدی تھی۔

اسے یاد آیا کہ گاؤں لوٹ آنے کے بعد بھی عرصہ تک اسے ٹیلی پیتھی کے سے انداز میں نیلوفر کی سرگوشیاں سنائی دیتی رہی تھیں۔ جن کے جواب میں وہ اتنے لمبے لمبے خط لکھتا کہ گاؤں کی ہٹیوں سے کاغذوں کے دستے ختم ہو جاتے۔ لیکن پھر جب صفیہ کے والد کی وساطت سے جو ایک صوبائی رکن اسمبلی تھے اسے ایک نہایت اچھی ملازمت مل گئی اور صفیہ سے اس کی منگنی ہو گئی تو نیلوفر کی سرگوشیوں میں ایک ہی میٹر بینڈ پر ایک سے زیادہ بولتے

ریڈیو اسٹیشنوں کی طرح خلل پڑنے لگا۔ وہ کوئی مدھر گیت یا لگداز غزل سن رہا ہوتا کہ حالات حاضرہ یا منڈیوں کے بھاؤ اوور لیپ کرنے لگتے۔ پھر جیسے ہٹا کٹا بیوپاری نحیف و نزار استاد کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتا اور اس کی گھنڈی دبا کر کہتا ہے۔ کہو شمشیر دستاں اول۔ آہستہ آہستہ نغمہ دب جاتا اور منڈیوں کے بھاؤ حاوی ہو جاتے۔

پھر اس کی شادی خانہ آبادی ہوگئی۔ شہر میں اسے بنا بنایا بنگلہ مل گیا۔ بنگلہ ہی نہیں اسے اور بھی کئی کام کیے کرائے مل گئے۔ مگر شہر آوازوں کا جنگل تھا۔ ہر طرف چیخم چاخ اور شور۔ آدمیوں کا، موٹروں اور مشینوں کا، ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کا، بلند آواز میں بجتے ہوئے گانوں اور لاؤڈ اسپیکروں پر پورے زور سے دی گئی اذانوں کا...... آٹھوں پہر آوازوں کی آندھی چلتی اور گرد و غبار اڑتا رہتا۔ اس کے کانوں میں آوازوں کا میل جمع ہونے لگا اور آہستہ آہستہ اس کے دور کی آوازیں کیچ کرنے والے انٹینا کو زنگ سا لگ گیا۔ اب وہ صرف بیڈروم میں لیٹے لیٹے گھر کے سامنے سے گزرنے والی آٹو موبائل سواریوں کے بارے میں اندازہ کر سکتا کہ کس قسم کی اور کون سی گاڑی گزری ہے یا پھر گھر میں ذرا کھٹکا ہوتا تو بھی اس کی آنکھ کھل جاتی۔

پھر اس کی ترقی ہوگئی...... مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کی کانگ سی آگئی۔ دفتری میٹنگز ،فائلوں کے انبار، سائلوں کی عرضیاں، ملک کے اندر اور باہر کے دورے، کلبس اور فائیوسٹار ہوٹلوں میں پارٹیاں اور بزنس ڈنرز۔ وہ جسمانی اور ذہنی طور پر اتنا مشغول رہتا کہ بعض اوقات اسے گھر میں لیٹی ہوئی بیوی کی اور درخواست ہاتھ میں لیے دفتر میں کھڑے سائل کی آواز تک سنائی نہ دیتی اور وہ بھول گیا کہ کبھی اسے دور کی آواز سنائی دیتی تھی اس لیے آج ایک مدت بعد باس سے بات کرتے اور اسٹینو کو ڈکٹیشن دیتے وقت سسکی کی آواز سنائی دی تو اسے یقین نہ آیا کہ اس کی کھوئی ہوئی سماعت بحال ہوگئی ہے ۔لیکن صفیہ سے باتیں کرتے وقت جب تیسری بار اسے نہایت واضح اور صاف آواز سنائی دی تو اسے یقین ہوگیا کہ یہ اس کا وہم نہیں بلکہ اس کی دور کی آواز سننے کی صلاحیت بحال ہوگئی ہے۔

''کیا بات ہے۔ آج سونے کا ارادہ نہیں ہے۔''

صفیہ کی آواز، اسے یادوں کی گہری دھند سے باہر کھینچ لائی۔

وہ بڑی گرہستن عورت تھی۔ گھر میں نوکر چاکر موجود ہوتے مگر وہ دیر تک جاگتی اور گھر کے کام کاج میں جتی رہتی اور عموماً اس کے سوجانے کے بعد ہی کمرے میں آتی تھی۔ اب بھی شائد وہ سارے کام نمٹا کر آئی تھی۔ پہلے تو اس نے صفیہ کو بتانا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس کی موٹی عقل میں دور کی آواز سننے کی بات کبھی نہ آئی تھی لیکن پھر اس خیال سے کہ شائد اس طرح اس کا ذہنی دباؤ کم ہو جائے اس نے پوری بات اسے بتائی۔

اس کی باتیں سن کر وہ خلاف معمول کچھ دیر خاموش رہی اور تکیوں کے غلاف بدلتی رہی پھر جمائی لیتے ہوئے بولی ''دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں۔''

''کون سی؟''

''یا تو تمھاری اس کلاس فیلو...... کیا نام تھا اس کا......ہاں ''نی لوفر'' کو پھر سے پاگل پن کا دورہ پڑا ہے اور مر رہی ہے یا پھر'' وہ رک گئی۔

''یا پھر؟'' اس نے پوچھا۔

''یا پھر آپ نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس کے کرنے کو آپ کا دل نہیں مانتا ہوگا۔''

وہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔

(انتخاب: جاوید صدیقی)

■ ■ ■

مشرقی لڑکی

ایک مشرقی لڑکی کا تذکرہ اس کے پر نکلنے ابھی باقی تھے

حسن رزاقی

''کراچی کا موسم کیسا ہے''، ضیا نے پوچھا۔

''ویسا ہی جیسا مئی جون کے مہینے میں ہوتا ہے۔ گرمی سے بھرپور، ہوا میں نمی اتنی زیادہ کہ پسینہ سوکھنے سے گریزاں رہتا ہے۔ نمک بدن کا حصہ بن جاتا ہے۔''

''تو آپ ایبٹ آباد کیوں نہیں آجاتے۔ یہاں تو ہم نے ابھی پنکھے استعمال کرنا بھی شروع نہیں کیے ہیں۔''

ایبٹ آباد جانے پر غور کیا جاسکتا تھا۔

ضیا صاحب سے ہمارے گھریلو مراسم تھے وہ ہمارے پورے خاندان کے دوست تھے..... میرے، میرے والد کے اور میری والدہ کے.....

اس دوستی کو نبھانے کے لیے آج کل میری ماں ایک اسپیشل مشن پر کام کر رہی تھیں..... ضیا صاحب کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا مشن۔ یہ مشن مشکل سے مشکل تر ثابت ہو رہا تھا۔

ویسے تو ضیا صاحب خاندانی آدمی تھے..... اچھی شخصیت کے حامل..... دوست نواز، مگر ان کے ساتھ ایک مسئلہ پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان کو ہم پلہ خاندان میں رشتہ ملنے میں مشکل کا سامنا تھا۔ وہ انجن ڈرائیور تھے، ہمارے معاشرے میں لوگ انجن ڈرائیور کو ٹیکسی ڈرائیور کا بڑا بھائی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جس تکنیکی تعلیم اور تربیت کا حامل ایک انجن ڈرائیور ہوتا ہے اس لحاظ سے اس کو جہاز ڈرائیور یعنی پائلٹ کا چھوٹا بھائی سمجھنا زیادہ مناسب ہوگا۔

میری والدہ کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی، میں اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے سلسلے میں باہر چلا گیا۔

تین سال بعد واپس آیا تو خوشخبری ملی کہ ضیا صاحب کی شادی ہو چکی ہے۔ خوشی کا موقع تھا، میں ان کو مبارک باد دینے ان کے گھر گیا۔ ان کی تعیناتی روہڑی اسٹیشن پر تھی۔ ان کی بیگم بھی انہی کے خاندان سے تھیں جن کا میکہ ایبٹ آباد میں تھا۔

میں چند دن کے لیے اسلام آباد میں تھا، ضیا صاحب کا فون آیا کہ ایک دن کے لیے ایبٹ آباد کا بھی چکر لگا لو۔ میں ان سے ملنے ایبٹ آباد چلا گیا۔ یہ میرا ایبٹ آباد کا پہلا چکر تھا۔

سردیاں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں مگر پھر بھی گرم کپڑوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جگہ خوبصورت تھی، پہاڑوں میں گھری ہوئی، مشہور مقام فوارہ چوک تھا اور زیادہ تر آبادی فوارہ چوک کے آس پاس تھی۔ آبادی زیادہ نہ تھی۔

ایبٹ آباد کا خوشگوار تاثر میرے ذہن میں تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے یاد آئے تو ضیا کی دعوت قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ میں ایبٹ آباد پہنچ گیا۔

سفر ڈائیو کی بس سے تھا۔ فوارہ چوک گزر گیا مگر بس نے رکنے کا نام نہ لیا مزید دس بارہ منٹ چلتی رہی۔ کئی میل آگے جانے کے بعد سیدھے ہاتھ پر ڈائیو کا اڈہ تھا، بس وہاں پر جا کر رکی۔ ضیا میرا انتظار کر رہے تھے۔

سلام دعا کے بعد میرا پہلا کلام ضیا سے یہ تھا کہ میں نے ایبٹ آباد کو پہچانا ہی نہیں۔ ایبٹ آباد تو فوارہ چوک کے آس پاس ختم ہو جاتا تھا۔ یہ کون سی جگہ ہے۔

ضیا نے کہا ''آپ تیس سال پہلے کی بات کر رہے ہیں۔ اب ایبٹ آباد کا مرکز فوارہ چوک نہیں بلکہ میزائل چوک ہے جو یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ یہ جگہ لنڈیاں کہلاتی ہے۔ میرا گھر قریب ہی جناح آباد میں ہے۔'' ہم ضیا کے گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔

جناح آباد دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ میرے ذہن میں پرانے ایبٹ آباد کا خاکہ تھا پیڑ، پودے، پھول، پہاڑیاں ان کے بیچ میں گھر۔

جناح آباد اس کا تضاد تھا۔ ہریالی اور پہاڑیاں تو تھیں مگر جناح آباد کراچی کا ہی کوئی محلہ لگ رہا تھا کہ اگر آپ اپنے ٹیرس پر بیٹھے ہیں تو چھ سات دوسرے گھروں کے ٹیرس آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ سیمنٹ اور لوہے کا جنگل۔ میں نے ضیا سے اپنی مایوسی کا ذکر کیا۔

ضیا نے کہا ''فکر نہ کریں، کھانا کھا کر آپ کو ایسی جگہ لے چلوں گا جہاں آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔ میں وہیں گھر بنا رہا ہوں۔''

کھانا کھا کر ہم وہ جگہ دیکھنے روانہ ہو گئے۔ میزائل چوک سے تقریباً چار کلومیٹر مانسہرہ کے راستے میں، جگہ واقعی قابل دید تھی، یہ جگہ وادی میں تھی۔ چاروں طرف پہاڑیوں سے ڈھکی ہوئی۔

ضیا کے گھر کے سامنے پشت پر دونوں طرف کھائی اور کھائی کے اندر سیکڑوں درخت جس میں زیادہ تر صنوبر کے درخت تھے۔ منظر دلفریب، کھائی چالیس، پینتالیس فٹ گہری۔ گہرائی میں پانی کا بہتا ہوا نالہ۔

یہ جگہ مجھے خوابوں کا جزیرہ معلوم ہوئی۔ ضیا کا گھر ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس میں دو عمارتیں بن رہی تھیں، بڑی دو منزلہ عمارت پشت پر تھی، سامنے ایک منزلہ چھوٹی عمارت بن رہی تھی۔ میں نے ضیا کو بہلا پھسلا کر راضی کر لیا کہ وہ سامنے والی عمارت میں ایک کمرہ وغیرہ بنوا دیں جو میں ان سے کرائے پر لے لوں۔ میں گرمیاں وہیں گزارا کروں گا۔

ضیا راضی ہو گئے۔ گرمیاں آگئیں، میں اس کمرے کے باہر گیلری میں بیٹھ کر سامنے پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے نظارے میں مصروف تھا۔

''انکل چائے!'' یہ زرینہ کی آواز تھی۔

زرینہ ضیا کے گھر ملازمہ کا کام کرتی تھی، اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ میرے کمرے کے نیچے والے کمرے میں رہتی تھی۔ میرے کھانے پینے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔

زرینہ اکیلی نہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی اور بھی تھی جس کو میں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔

''انکل یہ نغمانہ ہے، میری نند کی ہونے والی نند۔'' زرینہ نے تعارف کرایا۔

نند کی نند کیا ہوتی ہے مجھے ٹھیک طور پر اندازہ نہ تھا۔ یہ ضرور معلوم تھا کہ کچھ سسرالی قسم کے رشتے ہوتے ہیں۔

نند، دیورانی، جیٹھانی وغیرہ کے، کہ ان کو حاصل کرنے کے بعد ہر لڑکی کو شادی کے بعد لڑنے جھگڑنے کا قانونی تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔

نند کی نند کی وضاحت زرینہ نے کرنا چاہی کہ کس کی بہن کی شادی کس کے بھائی سے ہونے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر میں امریکا میں ہوتا تو امریکیوں کا فقرہ ''وٹ ایور'' Whatever کہہ کر پیچھا چھڑا لیتا۔ بہرحال۔

''نند کی نند'' سے زیادہ مجھے نغمانہ کی شخصیت نے متاثر کیا تھا۔ نغمانہ بالکل نغمہ کی طرح تھی۔ لامبا قد، دبلی پتلی، پٹھان لڑکیوں کے نقش عام طور پر جاذب نظر ہوتے ہیں۔ رنگ گورا، مگر مجھے نغمانہ کے ظاہری حسن سے زیادہ اس کی شخصیت نے متاثر کیا تھا۔ اس کا رکھ رکھاؤ، بات کرنے کا انداز، لباس پہننے کا سلیقہ، الفاظ کا چناؤ وغیرہ۔ یہ باتیں اتنی حیران کن نہیں ہیں اگر یہ کسی اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے فرد میں ہوں۔ لیکن زرینہ کا تعلق جس طبقہ سے تھا اس کی کسی لڑکی میں ان باتوں کا ہونا کچھ چونکا دینے والا تھا۔

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد یہ لڑکیاں چلی گئیں، میں نغمانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔

میں لنڈیاں میں سامان خرید رہا تھا۔ وہاں مجھے نغمانہ اور اس کا بھائی مل گئے۔ وہ مجھے اصرار کر کے اپنے گھر لے گئے، گھر میں بھی سلیقہ کا وہی عالم تھا۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے گھر آ گیا۔ اس کے بعد نغمانہ جب بھی زرینہ کے پاس آتی میرے پاس ضرور آتی کچھ دیر باتیں کر کے چلی جاتی۔

میں اپنے کمرے کے سامنے اپنی محبوب گیلری میں بیٹھا حسب معمول نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ نغمانہ چائے لے کر آ گئی اور سامنے کرسی پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔

زرینہ نے مجھے بتایا تھا کہ نغمانہ کی شادی کی بات چل رہی تھی مگر کچھ رکاوٹیں بیچ میں آ گئی تھیں۔ میں نے نغمانہ سے اس کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔

''انکل میرے دو رشتے آئے تھے ایک لڑکا مجھے زیادہ پسند نہیں مگر میرے ماں باپ کو پسند ہے۔ دوسرا لڑکا ہے، وہ بھی ٹھیک ہے۔ میں مشرقی لڑکی ہوں جہاں میرے ماں باپ کر دیں گے، میں چلی جاؤں گی۔''

تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد نغمانہ چلی گئی۔

مجھے کراچی میں کام تھا۔ میں چار پانچ ہفتے کے لیے کراچی چلا گیا۔ واپس آیا تو جس نند وغیرہ کی شادی ہونی تھی ہو چکی تھی۔ مجھے اس کی اطلاع زرینہ نے دی، ساتھ ہی یہ بھی بتلایا کہ نغمانہ کی بھی شادی ہو گئی۔ یہ بات میرے لیے حیران کن تھی کہ یہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کیسے ہو گیا؟

''اتنی جلدی اس کی شادی کیسے ہو گئی! ابھی تو اس کی شادی کی بات پکی بھی نہیں ہوئی تھی۔'' پھر میں نے لڑکے کے متعلق تفصیل پوچھی۔ ''نغمانہ کی پسند کے لڑکے سے ہوئی یا دوسرے والے سے۔''

''انکل اس کا ایک تیسرا رشتہ آیا تھا۔''

زرینہ نے جواب دیا۔ ''جب وہ لوگ نغمانہ کو دیکھنے آئے تو نغمانہ نے ایک کاغذ لا کر اپنی ماں کو دیا اور کہا کہ میری تو شادی ہو چکی ہے اب کیسی شادی۔ یہ کورٹ کا کاغذ تھا۔ نغمانہ نے اپنی پسند کے لڑکے سے کورٹ میرج کر لی تھی۔''

''نغمانہ کے ان الفاظ کا کیا ہوا۔'' میں سوچنے لگا۔

''انکل! میں مشرقی لڑکی ہوں، جہاں میرے ماں باپ کر دیں گے چلی جاؤں گی۔'' میرے ذہن میں ایک سوال بری طرح ابھرنے لگا۔ مشرقی لڑکی اتنی جلدی مشرقی نہیں رہی تھی۔

■■■

عیوب

ایک بیٹے کا ماجرا، اسے اپنی ماں کے ایک سوال سے بہت خوف آ رہا تھا۔

کبھی جو بدنیتی گھر کا رخ کر لے تو کوئی کیا کرے

اختر عباس

سائیکل کو بھی اسی وقت پنکچر ہونا تھا۔ اسکول سے آ کر میں نے اپنا بیگ پورے زور سے بستر پر پھینکا مگر اس احتیاط کے ساتھ نیچے گر کے پھٹ نہ جائے۔ ابھی چند روز پہلے ہی اماں نے باقاعدہ سرزنش کی تھی کہ ایسا مت کیا کرو بیگ پھٹ پھٹا گیا تو باقی پورا سال یہی اسکول لے جانا پڑے گا۔ نیا بیگ نئے سال پہ اور وہ بھی اگر تمھارے ابا کو میاں صاحب سے تنخواہ کے علاوہ کچھ اضافی رقم بھی دے دی تو.....

میرا کچھ عرصے سے دل چاہنے لگا تھا کہ ایسے ہی کسی موقع پر اماں سے کہوں کہ ''اتنے سال ہو گئے ابا کو میاں صاحب کی نوکری کرتے۔ نہ وہ بدلے نہ ہمارے حالات، بے برکتی ختم کیوں نہیں ہوتی۔ کیا دنیا میں ساری نوکریاں ختم ہو گئی ہیں۔ جو ابا صمد بانڈ لگے چمڑے کی طرح میاں صاحب کی دکان سے چمٹے ہوئے ہیں۔''

ماؤں کے اپنے دلائل اور اپنی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ان کا اتنا کہنا کافی اور شافی ہونا تھا۔

''بیٹا! تیرے باپ نے اتنے برسوں سے گھر سنبھالا ہوا ہے۔ دال روٹی چلائی ہوئی ہے۔ تُو اب بڑا ہو چلا ہے۔ کچھ ایسا ضرور کرنا کہ ہمارے دن بدل جائیں۔''

''ایوب!'' ماں کی آواز میرے کانوں میں آئی تھی۔ وہ ایوب کو ایسے بلاتی جیسے عیوب کہتی ہو۔ کبھی کبھی تو میں جھرجھری سی لے کر کھڑا ہو جاتا ہوں کہ بندہ تو ایک عیب سے ہی آدھا رہ جاتا ہے اور میری ماں کتنی معصومیت سے مجھے عیوب کہہ کر ڈرے بغیر پھرتی ہے۔

''آیا ماں!''

میں نے صحن کے نلکے سے بالٹی میں پانی لیتے لیتے جواب دیا تھا۔ پہلے ہاتھ دھوئے پھر منہ دھویا۔ پھر تار پہ ٹنگی ماں کی چادر سے منہ صاف کرتا ہوا باورچی خانے کی طرف لپکا تھا۔ یہ جگہ باورچی خانے کے نام پہ تہمت سے کم نہ تھی۔ اینٹوں پہ چولہا رکھا تھا کچی کچی اینٹوں سے دیواریں چنی تھیں۔

یہ چند سال پہلے کی بات ہے چھٹیوں کے دن تھے۔ ابا، اماں نے مل کر یہ دیوار خود ہی بنائی تھی۔ گلی سے تھوڑی دور توت کا درخت تھا۔ ابا اس کو چھانگ کر موٹی موٹی سوٹیاں لے کر آئے پھر ان پر ترپال ڈالی تھی۔ اب تو وہ بے چاری بھی کسی موٹے کپڑے جتنی ہی رہ گئی تھی۔ نہ تو پوری دھوپ روکتی تھی نہ بارش۔

ہمارے گھر میں سب کچھ ایسے ہی چل رہا ہے۔ کبھی تو لگتا ہے خوب چلنے لگے گا اور ہوتا یہ کہ چلنے سے پہلے ہی رک جاتا ہے۔ میں عمر میں زیادہ کچا ہوں یا سوچ میں، یہ فیصلہ کبھی تو کر پاؤں گا۔ پھر ضرور جائزہ لوں گا کہ آخر کو ہمارے ہی ساتھ برسوں سے ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اب بھلا یہ کوئی بات تھی۔ میں اچھا بھلا اسکول سے تیز تیز پیڈل مارتا آیا تھا اور اب جب کہ ابا کی روٹی لے کر دکان پہ جانا تھا۔ سائیکل منہ بسورے پنکچر کروائے پڑا تھا۔ منہ تو مجھ کو بسورنا چاہیے تھا، مگر ایسے موقع پر میری ماں منہ بھر کے اپنی پسند کا محاورہ بول دیتی ہے ''کُڑ کُڑ کتے تے انڈے کِتے'' پہلے تو مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ بس سننے میں اچھا لگتا تھا، پھر ایک دن مطلب پوچھ لیا تو بولیں ''بیٹا تو ہمارا، آگے پیچھے تو ماں ماں کرتا پھرتا ہے مگر جب کوئی کام کہو تو جی چراتا ہے۔ کسی اور کا کام کر آئے گا، ہمارا کام کرتے ہوئے تیری جان جاتی ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی تو مجھے اس مرغی جیسا لگتا ہے جو کُڑ کُڑ تو ایک گھر میں کرے اور اس کی آواز بظاہر یہ پیغام دے کہ انڈے دینے والی ہوں اور پھر انڈا کسی اور کے گھر جا دے آئے۔''

سائیکل پہ یہ محاورہ فِٹ آتا نہیں تھا، ورنہ میں اسے ضرور یہ سنا دیتا۔ دو سال پہلے جب ابا یہ سائیکل لے کر آیا تو مجھ سے زیادہ ماں خوش تھی۔ اس نے میاں صاحب کو بہت دعائیں دی تھیں۔ ابا نے خود ہی تو بتایا تھا کہ انھوں نے اپنے بیٹے سعید کو میٹرک کرنے پہ موٹر سائیکل لے دی ہے۔

میاں صاحب کا یہ معمول تھا کہ ان کے گھر میں کوئی کپڑا بھی نیا آتا تو اس کے بدلے میں اسٹاک میں موجود ایک کپڑا کسی نہ کسی کو ہدیہ ضرور کر دیتے۔ ان کی یہی عادت میرے کام آئی اور میرے لیے سعید کی سائیکل لائی..... اور وہی سائیکل اب پنکچر کھڑی تھی۔

بارش ہو یا دھوپ، ابا کو دوپہر کا کھانا پہنچانا ہی ہوتا ہے۔ زندگی میں کئی کام ایسے ہوتے ہیں جو کرنے پڑتے ہیں۔ ان میں کسی دلیل، کسی وکیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کرنے والا خوش دلی کے ساتھ کر لے تو اضافی خوشی بونس کی صورت میں ضرور ملتی ہے۔

''عیوب!''

پھر اماں کی آواز آئی ہے۔ میں نے لپک کر اس کے ہاتھ سے چار خانوں والا اسٹیل کا ٹفن لے لیا ہے۔ ہمارے گھر میں ویسے تو کئی طرح کے برتن ہیں۔ سمجھو پیتل، سلور، لوہے، مٹی اور پلاسٹک کے رنگا رنگ نمونے جمے ہیں۔ کچھ خریدے ہیں، کچھ تحفہ میں آئے ہیں۔ کچھ میاں صاحب کے بھجوائے ہوئے ہیں، کچھ اماں نے چھان بورا اور نائیلون کی ٹوٹی جوتیاں دے کر ریڑھی والے سے خریدے ہیں۔ مگر یہ ٹفن کیریئر ان سب میں پڑا ہوا، شہزادہ ہی لگتا ہے۔ وہ اونچا لمبا، نکلتا ہوا قد، ماتھے پہ وہ چمک ہے جو بلندی عطا ہونے کے بعد آتی ہے۔

دکان پہ پہنچ کر اکثر میری میاں صاحب سے کاؤنٹر پہ ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہ فون پہ کسی گاہک کے ساتھ یا پھر کسی کمپنی کی وین کے ساتھ آئے سیلز مین کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ جتنے بھی مصروف ہوں، مسکرا کر سلام کا جواب ضرور دیتے ہیں۔

کبھی موڈ میں ہوں تو آواز بھی لگاتے ہیں۔

''ایوب!'' تم نے اپنے ابے کو روز اتنا بڑا ٹفن کھلا کھلا کر اپنا حشر کر لیا۔ مجال ہے جو اس کے وجود پہ ایک بوٹی کا اضافہ بھی ہوا ہو۔ ساتواں سال تو تجھے بھی آتے ہو چلا ہے۔''

اس بات کا جواب میں بھلا کیا دیا کروں۔

ویسے بھی بڑوں کی ہر بات کا جواب کب ہوتا ہے۔ ہاں آج کا معاملہ کچھ مختلف ہے کچھ کہنا شاید مناسب نہیں، بہت مختلف ہے۔ گھر سے میں پیدل ہی آیا تھا ہمارا گھر دکان سے یہی کوئی دو تین فرلانگ دور ہو گا۔ آیا تو میں بہت آرام سے تھا، ٹہلتا ہوا، تھوڑا گنگناتا ہوا۔

''تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا۔''

اور کبھی اسے چھیا چھیا میں بدل دیتا۔ گانے کے بول ہوں یا انسان کے ارادے اور کسی کے دعوے سب بدل جاتے ہیں۔ میں بھی تو بدل گیا ہوں۔

میاں صاحب کی چھوٹی سی دکان کو یوں بڑے تھوک اسٹور میں بدلنے میں چھ سات سال لگے ہوں گے۔ جب ابا نے ان کے ہاں نوکری کی تو پہلے رکشہ چلایا کرتے تھے۔ روز کی بک بک سے تنگ تھے۔ کبھی مسافر سے مسئلہ، کبھی پولیس سے جھگڑا۔ انہی کا کہنا تھا بے برکتی نے گھر دیکھ لیا تھا۔ روز رکشے میں بیٹھ کر آجاتی تھی۔ جانے کیسے میاں سے ٹاکرا ہوا اور پھر ابا انہی کے ہو رہے۔ وہ ابا پہ اعتماد بھی بہت کرتے تھے خود بھی دکان پہ نہ ہوتے تو سارا لین دین ابا پہ ہی چھوڑ جاتے۔

میاں صاحب کے بارے میں ابا سے ہم نے بہت کہانیاں سنیں کوئی اور کہتا تو افسانہ لگتا مگر یہ سب تو ابا کی آپ بیتیاں تھیں۔ اسی کے سامنے میاں صاحب سے دنیا بدلے اور وہ چھوٹی سی دکان پہلے دو دکانوں میں پھر دو بڑے اسٹوروں میں اور اب تھوک کے کسی بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ڈھل گئی۔

میاں صاحب کے بعد ابا ہی وہاں دوسرے کام کرنے والوں پہ نگران ہوتے۔ ابا بتاتے کہ حساب کتاب میں اتنا کھرا آدمی کم ہی دیکھا ہو گا۔ ہمیشہ جھکتے پلڑے میں مال تولتے ہیں۔ چار پیسے گاہک کو زائد چلے جائیں، اپنی طرف ایک کوڑی نہیں نکلنے دیتے۔

میاں صاحب کے چار بچے ہیں۔ چھوٹا اب میڈیکل کالج میں ہے اور بڑا یونیورسٹی میں۔ وہ کہا کرتے ہیں ''یہ کام بہت برکت والا ہے۔ بشرطیکہ کوئی عبادت سمجھ کے کرے۔''

ایک روز ان کے بیٹے سعید کے منہ سے نکل گیا۔

''ابو کام تو بس کام ہوتا ہے عبادت کہاں سے ہو گئی۔''

تو گھبرا کے اٹھ ہی تو بیٹھے تھے۔

''نہ میری جان کام صرف کام ہوتا تو پیغمبروں کو کبھی نصیب نہ ہوتا، پیروں، ولیوں کو چھو کے بھی نہ گزرتا۔ ساری عزت بے کاروں کو نصیب ہوتی۔''

''ابو یہ بھلا کیا بات ہوئی!'' اس کے بیٹے نے باپ سے اختلاف بھی بڑے سلیقے سے کیا تھا۔

''میری جان! یہ جو چار پانچ فٹ کا پورا وجود ہے نا تیرا اور اس میں جو روح ہے، وہی نہ ہو تو بول یہ کسی کام کا ہو گا۔ کام تو بس بدن جیسا ہے اور نیت اس کی روح ہے۔ وہی اسے رواں رکھتی ہے وہی اسے جواں رکھتی ہے۔''

پھر انھوں نے بیٹے کو سینے سے لگایا اور بھینچ کے بولے تھے۔

''سنو شہزادے! تم نئے زمانے کے ہو۔ یہ جو موٹر بائیک تیرے پاس ہے ناں گھوں گھوں کرتی، ذرا اس میں سے صرف پٹرول نکال دے، ہر پرزہ اپنی جگہ پہ

رہے گا مگر چلے گی نہیں۔

ہر کام گاڑی کے بدن جیسا ہی تو ہوتا ہے اور اسے رب کی اطاعت اور خوشی سے کرنے کا ارادہ اس کا پٹرول بن کر دوڑتا ہے اور اسے دوڑاتا ہے۔''

کتنا وزن ہوتا ہے بعض بے مطلب سی باتوں کا، بے معنی سے جملوں کا، یہ کوئی میاں صاحب سے پوچھتا۔ اس روز ایسا لگتا تھا جیسے ان کا کچومر ہی نکل گیا ہو۔ کبھی جو کوئی کسی کو بہت پیارا ہو، وہی منزل ہو، اسی کی محبت اور فلاح مقصد ہو تو دولت، طاقت، حیثیت کچھ بھی اہم نہیں رہ جاتی۔ ایک ہی شخص کل کائنات ہوتا ہے۔ وہی پورا حاصل نہ ہو تو آدمی کا ہونا، نہ ہونا بس بے معنی گمان سا بن کر رہ جاتا ہے۔

میاں صاحب کئی دن یوں سرد رہے تھے جیسے بجھا لیمپ پھر ایک روز انھوں نے ابا سے بات کی تھی۔

''میری نیت اور ارادے کے پختہ گھر میں کہیں کوئی سوراخ رہ ضرور گیا ہے جہاں سے میرے بچے کے دل میں بے یقینی سی آئی ہے۔''

پتا نہیں کیوں اور کیسے ہر بڑے آدمی کے دل میں یہ آس اور امید جنم لیتی ہے اور آخری سانس تک پھلتی پھولتی رہتی ہے کہ اس کے وجود کا حصہ بننے والے لوگ ہی نہیں، اس کے آس پاس رہنے والے بھی پھولوں کی طرح خوشبودار چاندنی کی طرح نرم اور ستاروں کی طرح روشن ہوں۔ جو وہ سوچے اور نیت رکھے اس کے ساتھ جینے والے بھی اس میں بھیگ بھیگ جائیں۔ کوئی اس کے خیالوں، ارادوں اور خوابوں کی بے قدری نہ کرے۔ ان کی حدود سے باہر بھی نہ جائے اور ان کا بُرا بھی نہ سوچے۔

وہ دن اور لمحے تو میں نے نہیں دیکھے تھے مگر آج تو میں خود ان لمحوں کو دیکھ آیا ہوں۔ میرا گھر جو اسٹور سے صرف تین چار فرلانگ دور ہے، اب کوسوں دور ہو گیا ہے۔ چوٹ لگے تو درد ہوتا ہے، یہ کیسی چوٹ ہے کہ درد میرے گھٹنے اور بازو کی ہڈی میں ہے اور فاصلہ آنکھوں اور سوچوں کے درمیان اتنا بڑھ گیا ہے جیسے مجھے کسی اور ہی سیارے کا سفر درپیش ہے۔

میرا ہر قدم یوں مشکل سے اٹھ رہا ہے جیسے اس میں دکھ اور ندامت کی بھاری بیڑیاں پڑی ہوں۔

میاں صاحب کے چہرے پہ افسوس اور اپنے ابا کے چہرے پہ خوف بستر کی شکنوں کی طرح دور سے ہی دیکھا جاسکتا تھا۔ میں تو بالکل قریب سے محسوس کر کے آیا ہوں۔

''تم جاؤ ایوب۔''

میاں صاحب نے میرے حیران پریشان چہرے کو دیکھ کر کہا تھا۔

''خدا کی قسم مجھے اس کی بالکل خبر نہیں۔''

میں بازو کے چھل جانے اور گھٹنے میں ہونے والے درد کو بھول کر چیخا تھا۔

بے عزتی اور بے وقعتی کے احساس نے جیسے کسی پہاڑ کی چوٹی سے گہری کھائی میں دھکا دیا ہو اور میں گرتے گرتے بچاؤ کے لیے پکارا تھا۔

میں پچھلے سات نہیں تو چھ سالوں سے دکان پہ آرہا تھا۔ روز بلا ناغہ اسٹیل کے ٹفن میں کھانا لے کر..... ابا کھانا کھانے لگتے تو میں باہر آجاتا۔ کبھی سڑک پہ تھوڑی دور تک گھوم آتا تو کبھی میں میاں صاحب کے پاس کھڑا ہو کر انھیں کام کرتے دیکھتا رہتا۔ خاموشی سے ایسا کرتے کئی سال گزار دیئے تھے۔ ابا کھانا کھا کر ٹفن کو بند کرتے۔ مجھے آواز دیتے اور میں ٹفن اٹھا کر سلام لیتا، دکان سے باہر آجاتا۔

آج بھی یہی ہوا۔ بس دکان کے دروازے پر مال اتر رہا تھا۔ وہاں پڑی کسی خالی بوری پہ بے دھیانی میں پاؤں آیا اور میں منہ کے بل زمین پر آرہا۔ ہر چوٹ کی

اپنی مشکلیں اور آسانیاں ہوتی ہیں۔ کبھی تو یہ کسی بڑے نقصان کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور کبھی کسی بڑے نقصان سے بچاؤ کا ذریعہ۔ کبھی یہ بذات خود پوری سزا ہوتی ہے اور کبھی سزا کا آغاز اور اذیت کی ابتدا۔

کون فیصلہ کرے گا کہ اتنی سی عمر میں یہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ دن دہاڑے، سب کے سامنے..... ہمارے تو گھر میں شیشے کے برتن ویسے ہی کم ہیں۔ ایک دو بار جو کسی مہمان کے ہاتھ سے چھوٹ کے گرے تو پھر سلامت نہ رہے۔ کرچی کرچی ہو کر زمین پہ بکھر گئے۔ دوسرے کی نگاہوں سے گرنے کا احساس کسی شیشے کے کرچی کرچی ہونے سے زیادہ شدید اور بدتر ہوتا ہے۔ یہ اب میں بخوبی جان گیا ہوں۔ میاں صاحب کاؤنٹر سے بسم اللہ کر کے اٹھے تھے پھر ان کی نگاہ مجھ سے ہوتی ہوئی میرے ہاتھ میں پکڑے ٹفن کیریئر تک گئی تھی۔ یہ نگاہ بھی عجیب چیز ہے، کیا کیا دیکھتی ہے اور کیا کیا دکھاتی ہے۔ لمحے بھر کو سوچتی، سنتی، کھوجتی، نتیجے نکالتی اور پھر فیصلے سناتی ہے۔ کبھی نرم، کبھی گرم، کبھی تلخ، کبھی شیریں، پتھر سے سخت بھی اور ریشم سے نرم بھی۔ ان کے فیصلے لفظوں اور آوازوں سے نہیں آنکھوں سے بولتے ہیں۔ میاں صاحب کی نگاہ کی حدت نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا اور میں چیخ اٹھا تھا۔

میں نے جو جھک کر ٹفن کو اٹھانا چاہا تو یوں لگا یہ کبھی اٹھایا نہ جائے گا۔ اس کے ڈبے گرنے کے جھٹکے سے کھل کر بکھر گئے تھے۔ ان کے آس پاس کی جگہ چکنی ہو گئی تھی۔ ہوتی بھی کیسے ناں۔ ان کے اندر بھرا ہوا سارا گھی زمین پر بہہ گیا تھا۔

آدمی لمحہ بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ کبھی ایک عمل اسے فرشتوں سے اوپر لے جاتا ہے اور کبھی اس کے برعکس، وہ اس شمار قطار سے ہی نکل جاتا ہے۔ ندامت، خجالت اور شرمندگی سے میرا رونا ہی نکل گیا تھا۔ میں بولا تو میری آواز میں بھی رونے کی ہی کیفیت تھی۔ ٹفن اٹھا کر کھڑا ہونا ایسا ہی تھا مانو کسی پہاڑ کو اٹھایا ہو اور یہ پہاڑ مجھ سے اٹھائے نہ اٹھتا تھا۔ آدمی تبھی مکمل ہوتا ہے جب اسے دوسروں کی آنکھوں کو دیکھنا آجائے، پڑھنا آجائے اور اتنی سی عمر میں ایک دم سے میں نے میاں صاحب کی آنکھوں کو دیکھ کر سب سیکھ لیا تھا۔

''ایوب تم جاؤ..... تمھارے ابا کو گھی کے گودام میں لے جا کر بات کروں گا۔''

بات کرتے ہوئے میاں صاحب یوں رکے تھے جیسے گلے میں ریت پھنس گئی ہو۔ کیا میں کبھی جان پاؤں گا کہ انھوں نے ابا کو گھی کے گودام میں پڑے سیکڑوں ڈبے دکھا کر کیا کہا ہو گا۔ بیتے چھ سات برسوں کے ہر گزرے دن میرے ٹفن لانے اور اس کے گھی سے بھرے واپس جانے کا کیسے حساب لیا ہو گا۔ اپنی چھوٹی سی دکان میں پڑی دیانت کی برکت سے کاروبار کی آنکھوں دیکھی وسعت کا کیسے یاد دلایا ہو گا۔

سوچتا ہوں غریب بے وجہ غریب نہیں رہتا۔ کہیں نہ کہیں وہ بدنیتی کو اپنے گھر اور رزق میں شامل ہونے کا موقع اور راہ ضرور دیے رکھتا ہے۔ بارش سے بھرے بادل کی طرح بوجھل دل لیے جب میں گھر پہنچوں گا تو ماں دیر سے آنے کا نہیں، میری آنکھوں کے سوجے پپوٹوں کا پوچھے گی۔ ''وے عیوب! تیری آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟ اسے کیا بتاؤں گا؟ آنکھوں کے پپوٹے بے وجہ تو نہیں سوجتے۔ گالوں پہ آنسوؤں کے داغ ایسے ہی تو نہیں آتے، عیب اپنا ہو یا کسی اپنے کا۔ اس کا عارضی طور پر چھپانا تو ممکن ہے مگر جو داغوں کی طرح دامن دل پہ لگ جائے تو کون جانے کیسے اترتا ہے۔ کب اُترتا ہے یا زندگی کا حصہ ہی بن جاتا ہے۔ (افسانوی مجموعے ''مما مارشا'' سے انتخاب) ■ ■ ■

احسان علی

زندگی سے مذاق کرنے والے
ایک رنگین مزاج کی کہانی
ایک روز زندگی نے اسے ہی
مذاق بنا دیا تھا

ممتاز مفتی

کیسی رنگیلی طبیعت تھی احسان علی کی، محلے میں کون تھا جوان کی باتوں سے محظوظ نہ ہوتا تھا۔ اگر وہ محلے کی ڈیوڑھی میں جا پہنچتے جہاں بوڑھوں کی محفل لگی ہوتی تو کھانسی کی آوازوں کی بجائے قہقہے گونجنے لگتے، چوگان میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے پاس سے گزرتے تو دبی دبی آواز میں کھی کھی کا شور بلند ہوتا، محلے کے کنویں کے پاس جا کھڑے ہوتے تو لڑکوں کے کھیل میں نئی روح دوڑ جاتی۔

جوان لڑکیاں انہیں دیکھ کر گھونگھٹ تلے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتیں اور پھر ایک طرف سے نکل جانے کی کوشش کرتیں۔ اکھڑ مٹیاریں دیکھ پاتیں تو ان کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے۔ خواہ مخواہ جی چاہتا کہ کوئی بات کریں۔ بوڑھی عورتیں قہقہہ مار کر ہنس

پڑتیں۔ مثلاً اس روز احسان علی کو چوگان میں کھڑا دیکھ کر ایک بولی ''یہاں کھڑے ہو کر کسے تاڑ رہے ہو احسان علی؟''

''یہ سامنے عورتوں کا جھرمٹ لگا ہے۔ نہ جانے کس محلے سے آتی ہیں۔'' دوسری نے دور کھڑی عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔

''اے ہے اب تو اپنے حمید کے لئے دیکھا کرو۔'' بھابی کہنے لگی۔ اللہ رکھے جوان ہو گیا ہے۔''

''اور تو کیا اپنے لئے دیکھ رہا ہوں بھابی۔'' احسان علی مسکرایا۔

اس بات پر ایک معنی خیز طنزیہ قہقہہ بلند ہوا۔ احسان علی ہنس کر بولا۔ ''دنیا کسی صورت میں راضی نہیں ہوتی۔ چاچی اپنے لئے دیکھو تو لوگ گھورتے ہیں، کسی کے لئے دیکھو تو طعنہ دیتے ہیں مذاق اڑاتے ہیں'' جواب دینے میں احسان علی کو کمال حاصل تھا۔ ایسا جواب دیتے کہ سن کر مزہ آجاتا۔ شاداں نے یہ سن کر چاچی کو اشارہ کیا اور مصنوعی سنجیدگی سے کہنے لگی: چاچی اس عمر میں اوروں کے لئے دیکھنا ہی رہ جاتا ہے نا!''

احسان علی نے آہ بھری بولے ''کاش کہ تم ہی سمجھتیں شاداں۔''

اتنی عمر ہو چکی ہے چاچا پر تمہیں سمجھ نہ آئی۔ شاداں مسکرائی.....ابھی دیکھنے کی ہوس نہیں مٹی''

اچھا شاداں ایمان سے کہنا ''وہ سنجیدگی سے بولے، کبھی تمہیں میلی آنکھ سے دیکھا ہے؟

ہائیں چچا! شاداں ہونٹ پر انگلی رکھ کر بیٹھ گئی۔ میں تو تمہاری بیٹی کی طرح ہوں۔

یہ بھی ٹھیک ہے۔ وہ ہنسے۔ جب جوانی ڈھل گئی تو چچا جی سلام کہتی ہوں لیکن جب جوان تھی، توبہ جی پاس نہ پھٹکی تھی کبھی، کیوں بھابی جھوٹ کہتا ہوں میں؟

اس بات پر سب ہنس پڑیں اور احسان علی وہاں سے سرک گئے۔

ان کے جانے کے بعد کے بھابی نے کہا۔ توبہ بہن! احسان علی اور بات کرنے سے چوکے۔

چاچی بولی۔ ساری عمر تو عورتوں کو تاڑنے میں کٹ گئی۔ اب تو باتیں ہی باتیں ہیں۔

لے بہن۔ شاداں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اب کون سا حاجی بن گیا ہے۔ اب بھی تو عورت کو دیکھ کر منہ سے رال ٹپکتی ہے۔

لیکن شاداں! بھابی نے کہا۔ شاباش ہے اس کو کبھی محلے کی لڑکی کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھا۔

یہ تو میں مانتی ہوں۔ شاداں نے ان جانے میں آہ بھری۔

یہ صفت بھی کسی میں ہوتی ہے۔ چاچی نے کہا۔ جب محلے والیوں کی یہ بات احسان علی نے پہلی بار سن پائی تو بولے اتنا بھروسہ بھی نہ کرنا مجھ پر شاداں! کیوں؟ چاچی نے ہنس کر کہا۔ یہ کیا جھوٹ ہے تمہاری یہ صفت واقعی خوب ہے میں تو منہ پر کہوں گی احسان علی!

لو چاچی! یہ صفت نہ ہوتی ان میں تو ہمارے محلے میں رہنا مشکل ہو جاتا۔ شاداں بولی۔ احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑے بولے۔ چاچی کہتے ہیں ایک دفعہ ایک بلی کنویں میں گر گئی۔ باہر نکلنے کے لئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے پھر بولی آج کی رات یہیں بسر کریں گے۔

یہ بلی کا واقعہ کیا ہوا؟ چاچی نے مسکراتے

ہوئے پوچھا۔
ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔ شاداں بولی۔
بس تو چھوڑ اس بات کو، بھابی نے کہا۔ احسان علی کی بات کریدنے سے نکلے گا کیا؟
احسان علی اس دوران میں ہنستے رہے پھر بولے۔ چاچی یہ میری صفت نہیں یہ تو محلے والیوں کی خوبی ہے۔ بیچاری ایسی لگتی ہیں کہ خواہ مخواہ ماں بہن کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں شاداں؟
ہائے اللہ۔ سنا تم نے چاچی؟ شاداں چلائی سمجھی بھی ہو اس کی بات؟ بھابی مسکرائی۔
سب سمجھتی ہوں۔ چاچی نے ہنس کر کہا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔ شاداں بولی، کہ محلے والیاں ایسی ہیں پر میں پوچھتی ہوں چاچا اگر محلے میں کوئی ایسی ویسی ہوتی تو کیا واقعی رنجھ جاتے اس پر؟
تم اس کی باتیں سنو۔ بھابی نے کہا۔ تو بہ کیسی باتیں بناتا رہتا ہے۔ چاچی ہنسی۔ کسی محلے والی پر ریجھتے تو اک بار مزہ چکھا دیتی تمہیں چچا۔ شاداں آنکھیں چمکا کر بولی۔ جوتا دکھا دیتی میاں کو۔ کیوں بھابی! واہ احسان علی مسکرائے۔ شاداں! جس نے جوتا دکھا دیا سمجھو بات پکی کر دی۔
ہائے میں مرگئی۔ شاداں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔
احسان علی تجھ پر خدا کی رحمت۔ چاچی نے ہاتھ چلایا اور احسان علی ہنستے ہنستے آگے نکل گئے۔ ان کی عادت تھی کہ محفل پر اپنا رنگ جما کر چلے جایا کرتے۔
اگرچہ محلے والیاں اکیلے میں احسان علی کی گزشتہ زندگی پر ناک بھوں چڑھایا کرتیں اور ان کی فطری کمزوری پر مذاق اڑاتیں لیکن جب وہ سامنے آجاتے تو نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جاتی اور وہ خواہ مخواہ ہنس پڑتیں۔ جوان مٹیاریں تو اب بھی پلّو بچا کر نکلنے کی کوشش کرتیں۔ جب احسان علی جوان تھے ان دنوں تو کسی عورت کا ان کے قریب سے گزر جانا بے حد مشکل تھا۔ خواہ مخواہ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ماتھے پر پسینہ آجاتا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتی۔ ہائے میں مرگئی۔ یہ تو اپنا احسان علی ہے۔ ان دنوں بڑی بوڑھی عورتیں بھی مخدوش نگاہوں سے گھورتی تھیں۔ محلے کے مرد تو اب بھی انہیں دیکھ کر تیوری چڑھا لیتے۔ البتہ جب وہ کوئی دلچسپ بات کرتے تو وہ ہنسنے لگتے اور یوں ہم کلام ہوتے جیسے اپنی فراخدلی کی وجہ سے ان کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے ہوں۔ لیکن احسان علی کی غیر حاضری میں اکثر وہ کہا کرتے:
بوڑھا ہو گیا ہے لیکن ابھی ہدایت نہیں ہوئی۔ ہدایت تو اللہ میاں کی طرف سے ہوتی ہے جنہیں نہ ہو انھیں کبھی نہیں ہوتی۔
حرامکاری کی لت کبھی جاتی ہے، باباجی؟
ہاں بھئی یہ تو سچ ہے۔
دیکھ لو اتنی عمر ہو چکی ہے۔ باتوں میں کوئی آیا ہے؟ وہی چھیڑ خانی..... لاحول ولا قوۃ۔
بات بھی سچی تھی اگرچہ احسان علی پچاس سے زیادہ ہو چکے تھے لیکن وہی منڈی ہوئی داڑھی، متبسم آنکھیں اور چھیڑ دینے والی باتیں۔ ان کی روح ویسے ہی جوان تھی۔ بچوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتے تو وہیں کھڑے ہو کر واہ واہ کرنے لگتے، کھلاڑی کو داد دینے لگتے یا ایمپائر بن کر کھڑے ہو جاتے۔ لڑکے انہیں کھیل میں حصہ لینے پر مجبور

کرتے۔ تالیاں بجاتے شور مچاتے۔ چاچی جی ہمارے کھلاڑی بنیں گے۔ نہیں ہمارے۔ ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ کھڑکیوں سے محلے والیاں جھانکنے لگتیں۔ دیکھ لو احسان علی گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں۔ چق کی اوٹ میں سے آواز آتی۔ بھائی جی کیا پھر سے جوان ہونے کا ارادہ ہے؟ سبز جنگلے سے شاداں سر نکالتی ''ابھی تو اللہ رکھے پہلی جوانی ہی ختم نہیں ہوئی'' شاہ نشین سے چاچی بولتی ''توبہ شاداں تو بھی کسی کو چین لینے نہیں دیتی۔ شکر کر کہ احسان علی کا رجحان اور کھیلوں سے ہٹا ہے۔ گلی ڈنڈا کھیلنے میں کیا عیب ہے۔'' ''مسجد سے آتا جاتا کوئی محلے دار انہیں کچھ کہتا۔ کب تک اس لڑکیوں لڑکوں کے کھیل میں لگے رہو گے اب خدا کو بھی یاد کر لیا کرو۔ احسان علی اس کر گنگناتے۔ ''وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار'' دوسرا آکر کہتا۔ ''دنیا داری کی غلاظت سے اکتائے نہیں ابھی؟ صوم وصلوٰۃ کی پاکیزگی کو کیا جانو۔ احسان علی کہتے۔ ''بابا جی غلاظت کا احسان پاکیزگی کی آرزو پیدا ہوتی ہے نا''
''تم میں احساس نہیں کیا۔'' باباجی پوچھتے اور وہ جواب دیتے۔ ''احساس تو ہے پر غلاظت بھی تو ہو'' اس پر کوئی لاحول پڑھ دیتا اور وہ ہنستے۔ ''لو بھائی جی اب تو شیطان بھی آ گیا۔'' اور وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔
احسان علی کے آنے سے پہلے محلہ کیسا ویران دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ موسم سرما میں دوپہر کے قریب محلے والیاں چوگان میں اکٹھی ہو کر ازار بندیا کرتی تھیں۔ دوپہر کے قریب جب چوگان میں دھوپ آتی تو جگہ جگہ بچھ جاتیں۔ مٹی کی ہانڈیاں رکھ دی جاتیں جن میں تیلیوں کے مٹھے بھرے ہوتے۔ بارہ بجے کھانے پینے سے فارغ ہو کر عورتیں وہاں جمع ہونا شروع ہو جاتیں۔ ایک بجے تک اچھا خاصا میلا لگ جاتا۔ ہاتھ چلتے دھاگے تیلیوں سے پھسلتے ہوئے عجیب آواز پیدا کرتے۔ تیلیاں ٹکراتیں، ازار بند بنتے ہوئے کوئی بات چھڑ جاتی، گلے ہوتے، شکایتیں کی جاتیں۔ ایک دوسرے پر آوازیں کسی جاتیں۔ مگر قہقہے کی آواز آتی۔''
ادھر ڈیوڑھی میں مسئلے مسائل کی بات گرم رہتی۔ شریعت کے احکام بار بار دہرائے جاتے۔ احادیث کے حوالے دیے جاتے۔ اولیاء کرام کی حکایات سنائی جاتیں۔ ہنگامہ تو رہتا تھا مگر اس میں مزاح کی شیرینی نام کو نہ ہوتی۔ عورتوں کے مسلسل جھگڑوں اور مردوں کی خشک بحثوں کی وجہ سے مسلسل شور، محلہ کو اور بھی ویران کر دیتا۔ پھر احسان علی پنشن لے کر محلے میں آبسے۔ ان کے آنے کے بعد محلے کا رنگ بدل گیا۔ جب عورتیں ایک دوسرے کے گلے شکوے کرنے میں مصروف ہوتیں تو احسان علی آنکلتے اور آتے ہی ایسی بات کرتے کہ سبھی ہنس پڑتیں اور محفل کا رنگ ہی بدل جاتا۔ طعنے اور تمسخر کی جگہ ہنسی مذاق شروع ہو جاتے۔ آپس میں جھگڑتی ہوئی عورتیں مل کر احسان علی کے خلاف محاذ قائم کر لیتیں اور محلے کے چوگان میں قہقہے گونجنے لگتے۔ محلے کے بزرگ خشک مسائل چھوڑ کر احسان علی کے چٹکلے سننے لگتے۔ بات بات پر لاحول پڑھنے والے بڈھے لاحول پڑھنا بھول جاتے لیکن پھر بھی عادت سے مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی لاحول پڑھ دیتا۔ اس پر احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ ''بھائی جی کیا آپ کو بات بات پر لاحول پڑھنے کی

ضرورت پڑتی ہے۔ہم تو یہ جانتے ہیں جب تک شیطان کا خطرہ لاحق ہو لاحول کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی"

احسان علی کو لاحول سے چڑ تھی۔ ہاں تو واقعی احسان علی کے آنے پر محلے میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی۔

پھر......ایک روز ایک انوکھا واقعہ ہوا۔ چوگان میں عورتیں حسب معمول جمع تھیں نئی روشنی کے نوجوانوں کی بات چل رہی تھی کہ شاداں نے دور سے احسان علی کو آتے دیکھ لیا۔ چاچی کو اشارہ کر کے با آواز بلند بولی۔

"چاچی خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آج کل تو چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی چچا احسان علی بنے ہوئے ہیں۔ راہ چلتی لڑکی کو تاڑتے ہیں۔

"ہائے ہائے" چچی نے شاداں کا اشارہ سمجھے بغیر کہا۔ "تم تو خواہ مخواہ اس بیچارے۔۔۔۔"

شاداں نے پھر سے اشارہ دہرایا جسے دیکھ کر چچی کا غصہ مسکراہٹ میں بدل گیا۔

"آج کل کے مردوں کی کیا پوچھتی ہو چچی۔" شاداں نے پھر سے بات شروع کی۔ "بال کھچڑی ہو جاتے ہیں، پر عورتوں کو تاڑنے کی لت نہیں جاتی۔" "ہاں شاداں" چچی نے منہ بنا کر کہا۔ "زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے۔"

اس کے بعد مجمع پر خاموشی چھا گئی ہر کوئی احسان علی کی بات سننے کی منتظر تھی اگر چہ وہ سب یوں بیٹھ گئی تھیں۔ جیسے انہیں احسان علی کے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔ احسان علی آئے اور چپ چاپ ان کے پاس سے گزر گئے۔

انہوں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور حیران ہو گئیں۔

"اللہ خیر کرے آج احسان علی کو کیا ہوا ہے۔" چاچی زیر لب بولی۔

"میں تو آپ حیران ہوں۔" شاداں ہاتھ ملنے لگی۔ "اے ہے احسان علی اور چپ چاپ پاس سے گزر جائے۔"

میں کہتی ہوں ضرور کوئی بات ہے۔" بھابی نے انگلی ہلاتے ہوئے کہا۔

"کہیں گھر سے لڑ کر تو نہیں آئے تھے؟" جس روز نواب بی بی سے لڑتا ہے، اس روز تو اور بھی چہکا ہوا ہوتا ہے۔ کیوں بھابی، یاد ہے کل ہنس ہنس کر گھر کی لڑائی کی بات سنا رہا تھا۔"

"ہاں" بھابی مسکرائی جیسے لڑائی نہ ہوئی تماشا ہوا۔ "اس کا کیا ہے۔" چاچی بولی۔ "اس کے لئے تو ہر بات تماشا ہے۔ چاہے موت کی بات ہو یا بیاہ کی۔"

ہائے چاچی کیسی اچھی طبیعت ہے احسان علی کی کبھی ماتھے پر تیوری نہیں دیکھی۔ ایمان سے رنگیلا ہے رنگیلا"

"پر میں کہتی ہوں ضرور آج کوئی بات ہے" بھابی ہونٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی۔ شاداں ازار بند لپیٹتے ہوئے بولی۔ "چلو تو چل کر نواب بی بی سے پوچھیں۔"

اے ہے دو جوڑے تو چڑھا لینے دے۔ بھابی نے کہا۔

"ہونھ دو جوڑے، اتنا لوبھ بھی کیا" اس نے اٹھ کر بھابی کیا آزار بند کو زبردستی لپیٹ دیا۔

پہلے تو وہ نواب بی بی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں پھر چاچی نے بات چھیڑی، کہنے لگی: خیر تو ہے؟ احسان علی کو کیا ہوا ہے آج؟"

"ابھی اچھے بھلے باہر گئے ہیں۔" نواب بی بی نے جواب دیا۔

"وہ تو ہم نے بھی دیکھا تھا اسے باہر جاتے ہوئے۔" بھابی نے کہا۔

"میں نے کہا چلو دو گھڑی کا مذاق ہی رہے گا۔ پر انہیں یوں چپ چاپ دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی کہیں بری بات کا برا ہی نہ مان لیا ہو۔ توبہ میں نے بات ہی کیوں کی۔"

"اونہہ" نواب بی بی نے کہا۔ "برا ماننے والا نہیں ہے"

"کسی فکر میں پڑا تھا۔ جو یوں پاس سے گزر گیا۔" چاچی نے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" نواب بی بی نے کہا "اپنے حمید کا خط آیا ہے آج لڑکے نے اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہے۔"

"ہائیں! میں مر گئی" شاداں چلائی۔ "آپ اپنی شادی کے لئے لکھا ہے کیا؟ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے۔" چاچی بولی۔ "اللہ رکھے جوان لڑکا ہے۔ آپ کماتا ہے لکھ دیا تو کونسی قیامت آ گئی۔"

میں جانوں احسان علی کو دیر نہیں کرنی چاہئے اس بات میں۔"

انہیں خیال ہوتا اس بات کا تو یہاں تک نوبت ہی آتی۔ میں تو کب سے کہہ رہی تھی کہ لڑکے کو نامزد کر لیکن ان کے اپنے چاؤ بھی ختم ہوں۔ اتنی عمر ہو چکی ہے لیکن ابھی ہوس نہیں گئی۔"

"نہ بہن" چاچی بولی۔ "مجھ سے تو آپ انہوں نے کئی بار کہا ہے کہ چاچی جہاں لڑکا کہے گا اس کی شادی کریں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ آج یہ کام لڑکے کی مرضی بغیر نہیں ہوتے۔ یہ بات بھی سچی ہے"

یہ بات ہے۔" نواب بی بی بولی۔ "تو اب کیوں سر پیٹ کر باہر نکل گیا ہے۔ لڑکے نے اپنی بیوی تلاش کر لی ہے تو......"

"اپنی بیوی آپ تلاش کر لی ہے؟" شاداں چلائی سچ؟ بھابی ران پر ہاتھ مار کر بولی۔

"ہاں بھابی" نواب بی بی بولی "پہلے تو اسے اپنی مرضی کی بیوی تلاش کرنے کی پٹی پڑھاتے رہے اور اب اس نے اپنی بیوی کا چناؤ کر لیا ہے تو میاں گرم ہو رہے ہیں۔"

"کون ہے وہ؟" چاچی نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم سکول میں استانی ہے۔ لڑکے نے فوٹو بھیجی ہے اس کی۔"

"ہم بھی دیکھیں۔" شاداں نے منت کی۔

نواب بی بی اٹھ بیٹھی اور میز کی دراز میں سے فوٹو لے آئی۔

"ہائے چاچی یہ تو میم ہے میم" شاداں خوشی سے پھولے نہ سمائی۔

"اے ہے" چاچی بولی "ایسی ہی تو ہوتی ہیں یہ سکول والیاں"

"توبہ کیسی بنی ٹھنی بیٹھی ہے" بھابی ہنسی۔

"کتنی خوبصورت ہے" شاداں بولی۔ "احسان علی کو ایسی خوبصورت بہو کہاں سے مل سکتی تھی۔"

عین اس وقت احسان علی آ گئے، شاداں کی بات

سن کر وہ گھبرا گئے ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے پھر کمرے سے باہر جانے لگے، لیکن شاداں کب چھوڑنے والی تھی انہیں "مبارک ہو چچا" وہ بولی "نئی بہو مبارک ہو۔ محلے کی لڑکیاں تو تمہیں پسند نہیں تھیں۔ اللہ رکھے لڑکے نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔"

ایک ساعت کے لئے احسان علی کا رنگ فق ہو گیا لیکن جلد ہی وہ سنبھل کر غصے میں بولے۔ "وہ تو بیوقوف ہے! بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ خوبصورت لڑکیاں دیکھنے کے لئے ہوتی ہیں بیاہنے کے لئے نہیں۔ بھلا دیکھو تو اس لڑکی کا اس گھر میں گزارہ ہو سکتا ہے کیا؟"

"کیوں اس کو کیا ہے؟" شاداں بولی "دیکھو تو کتنی خوبصورت ہے۔"

"یہی تو مصیبت ہے" وہ سر کھجاتے ہوئے بولے۔ "آپ جو ساری عمر خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے پیچھے ہی پھرتا رہا ہوں نا بیاہ کر تو نہیں لایا کسی کو۔ یہ دیکھ لو یہ حمید کی ماں بیٹھی ہے" وہ جوش میں بولے۔ "دیکھ لو کیا ناک نقشہ ہے۔"

کیوں نواب بی بی کو کیا ہے۔" چاچی ہنسی۔

"میں کہتا ہوں کہ کچھ ہے۔ اگر کچھ ہوتا تو کیا میرے چولھے پر بیٹھ کر برتن مانجھتی رہتی؟"

"آخر حمید کا بھی تو جی چاہتا ہے کہ خوبصورت لڑکی ہو اس میں حرج ہی کیا ہے" شاداں مسکرائی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ جی نہ چاہے۔ لیکن چاچی یہ تیتریاں تو یارانہ لگانے کے لئے ہوتی ہیں۔ بیاہنے کے لئے نہیں۔"

"ہائیں" شاداں نے ناک پر انگلی رکھ کر لی۔

"احسان علی تم نے تو حد کر دی۔ کوئی محلے کی بیاہ لیتا پھر چاہے جہاں مرضی ہوتی یارانے لگاتا پھرتا......" احسان علی اپنی ہی دھن میں کہہ گئے۔

"توبہ میری، احسان علی تم تو بات کہتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔" چاچی بولی۔

"لو اسے دیکھو نا ذرا" احسان علی نے پھر تصویر ان کے سامنے رکھ دی "یہ آنکھیں! راہ چلتے کو روکتی ہیں یا نہیں۔ توبہ آنکھ بھر کے دیکھا نہیں جاتا۔"

"اے ہے دیکھا کیوں نہیں جاتا۔ اچھی بھلی تو ہے۔" شاداں مسکرائی۔

"مرد کی آنکھ سے دیکھو تو معلوم ہوتا" احسان علی ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگے۔

"اپنی بہو کے بارے میں کہہ رہے ہو؟" چاچی ہنسی۔

"بہو تو جب بنے گی تب دیکھا جائے گا۔ چاچی ویسے بات کر رہا ہوں۔ آخر مجھے بھی تو اسی گھر میں رہنا ہے۔" وہ مسکرائے۔

اس بات پر نواب بی بی کی ہنسی نکل گئی بولی۔ "ان کی تو عادت ہی ایسی ہے جو منہ میں آیا کہہ دیا۔"

ان کے چلے جانے کے بعد احسان علی پھر اسی طرح گم سم ہو گئے۔ حمید کی ماں نے کئی بار بات چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے خیالات میں گم تھے۔ دفعتاً وہ اٹھ بیٹھے "حمید کی ماں مجھے آپ جا کر اس سے ملنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے۔ سوٹ کیس میں دو جوڑے رکھ دے میں صبح پہلی گاڑی سے ہی چلا جاؤں۔"

حمید کے پاس پہنچ کر پہلے تو انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی، پہلے

ئے۔ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کو پیش کرنے کے لئے آپ بیتیاں بیان کیں، لیکن جب حمید نے کسی بات کا جواب نہ دیا تو وہ دلیلوں پر اُتر آئے۔ اس پر بھی حمید خاموش رہا تو انہوں نے اسے دھمکانا شروع کر دیا۔ جلد ہی دھمکیوں نے منتوں کی شکل اختیار کر لی۔ پر حمید بولا "ابا جی میں مجبور ہوں میں نسرین سے بیاہ کرنے پر مجبور ہوں" اس وقت احسان علی کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ڈوبتا ہوا، سہارا لینے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ دفعتاً وہ پھر جلال میں آ گئے بولے۔ "اچھا بیشک بیاہ لاؤ اسے لیکن وہ ہمارے یہاں کبھی نہیں رہے گی۔ ہم اس سے کبھی نہیں ملیں گے۔" اس پر حمید اٹھ بیٹھا بولا" آپ کی مرضی۔" "لیکن اس لڑکی کو لے پر تم اس قدر بضد کیوں ہو؟" انہوں نے پوچھا۔ "میں مجبور ہوں ابا جی۔" حمید نے کہا۔ "ہماری شادی ہو چکی ہے۔"

"ہو چکی ہے؟" وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے۔ "ہو چکی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہ حقیقت ہے۔" حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس بات کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔"

"ایک ہفتہ؟" انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ "یہ بات ہے تو پھر جھگڑا ہی کیا،" وہ دفعتاً ہنس پڑے لیکن ان کی ہنسی بے حد کھسیانی تھی۔

حمید اٹھ بیٹھا اور ساتھ والے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا۔ ایں! احسان علی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم تو کہتے تھے۔ یہ کمرہ پڑوسیوں سے متعلق ہے۔" "اور کیا کہتا ابا جی" حمید مسکرایا اور آواز بلند بولا۔ "نسرین آ جاؤ۔ ابا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ احسان علی کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔" "تو یہ بات ہے!"

نسرین بڑے پر وقار انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔ "سلام عرض کرتی ہوں۔" سریلی آواز کمرے میں گونجی دو ایک ساعت کے لئے وہ سامنے لٹکی ہوئی تصویر کو گھورتے رہے۔ پھر دفعتاً انہیں احساس ہوا کہ انہیں جواب میں کچھ کہنا چاہئے "بیٹھیے تشریف رکھیئے" وہ گھبرا کر بولے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسی صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی ہے۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں جو ہونا تھا ہو چکا" ہاں بھائی۔" وہ حمید سے مخاطب ہوئے۔ "تم انہیں محلے میں لاؤ نا۔ تمہیں وہاں آنا ہی پڑے گا۔ تمہاری ماں تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔" "سچ"۔ "کیا واقعی آپ چاہتے ہیں کہ ہم گھر آ ئیں؟"

اور تو کیا مذاق کر رہا ہوں میں۔ تمہیں چھٹی لینی چاہئے۔ ہاں۔" "چھٹی تو میں نے پہلے ہی سے لے رکھی ہے۔" حمید مسکرایا۔ "تو پھر یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا حماقت ہے۔" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کل ہی پہنچ جاؤ وہاں۔ اچھا میں اب جاتا ہوں نسرین کو ساتھ لانا سمجھے؟"

جس وقت حمید اور نسرین محلے میں داخل ہوئے وہ سب چوگان میں تھیں۔ نسرین نے کالا ریشمی برقعہ اتارا۔ ایک ساعت کے لئے وہ جھجک گئیں......رسمی سلام ہوئے۔ دعائیں دی گئیں۔ سر پر ہاتھ پھیرے گئے۔ جب دلھن اپنے گھر چلی گئی تو نکتہ چینی ہونے

لگی۔ ایک بولی'' لے بہن دلھن کا ہمارے ساتھ کیا میل۔ شاداں بولی'' کیوں ہم کیا کم ہیں کسی سے'' تیسری نے کہا۔'' منہ پر پوڈر دو دو انگل چڑھا ہوا ہے'' چوتھی نے کہا'' ویسے تو چودھویں کا چاند ہے۔'' احسان علی کا گھر تو منور ہو گیا۔'' ہاں بہن'' شاداں نے آہ بھر کر کہا۔'' اسے محلے والیاں پسند نہ تھیں۔'' شاداں نے سر اٹھایا تو سامنے احسان علی کھڑے تھے۔ بھابی بولی۔'' سنا احسان علی شاداں کیا کہہ رہی ہے۔'' لاحول ولاقوۃ۔'' احسان علی کے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔ شاداں کب چھوڑے والی تھی انہیں۔ بولی۔'' لو چاچی آج تو چچا کے منہ سے بھی لاحول سن لیا۔'' احسان علی کو دفعتاً اس کا احساس ہوا تو لگے سر کنے وہاں سے۔ شاداں نے بڑھ کر ہاتھ سے پکڑ لیا۔ بولی'' اب کہاں جاتے ہو میں تو گن گن کے بدلے لوں گی۔'' چاچی ہنسی بولی۔'' کیسی مبارک دلھن آئی ہے کہ احسان علی کے منہ سے عربی کے لفظ نکلے۔''

'' پر چاچی'' شاداں چلائی۔'' ان سے بھلا پوچھو تو آج لاحول پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے انہیں''

'' اے ہے شاداں!'' بھابی بولی'' کیا کہہ رہی ہے تو؟''

'' ٹھیک تو کہہ رہی ہوں''۔ شاداں چمکی۔ '' اس روز میں نے لاحول پڑھا تو احسان علی نے کس قدر شرمندہ کیا تھا۔ مجھے کہنے لگے جب لاحول پڑھا جائے تو شیطان کچھ دور نہیں ہوتا۔'' اب تو اسے جانے بھی دے گی یا نہیں'' چاچی چڑ کر کہنے لگی۔'' گھر بہو آئی ہے اور تو نے اسے یہاں پکڑ رکھا ہے۔''

اسی شام کو جب دولھا دُلھن اپنے کمرے میں چلے گئے تو شاداں نے حسبِ معمول ازراہ مذاق چچا سے کہا۔'' خیر سے اس طرف؟ کھلتی تھی۔ اس خیال پر وہ پھر چوگان میں آ کھڑے ہوئے۔ چوگان میں شاداں نے انہیں پکڑ لیا اور لگی مذاق کرنے۔ لیکن اس روز انہیں کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ بار بار اوپر کی طرف دیکھتے اور پریشان ہو جاتے۔ شام کو جب وہ گھر پہنچے تو نسرین مسکراتی ہوئی انہیں ملی۔ بولی'' رات کے لئے کیا بناؤں؟''

'' جو تم چاہو۔'' وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے نسرین انہیں کی چارپائی پر بیٹھ گئی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔'' اوہ۔'' ان کے منھ سے بیساختہ نکل گیا۔ نسرین چونک پڑی۔'' کیا چاہئے آپ کو؟''

'' میں تو بھول ہی گیا۔'' وہ اپنی ہی دھن میں بولے۔

'' کیا؟'' نسرین نے پوچھا۔

کچھ نہیں کچھ نہیں۔'' وہ بڑ بڑائے۔ میرا مطلب ہے۔'' انہیں خود سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ اور وہ اس قدر مضطرب کیوں ہیں۔ ان کی گھبرائی ہوئی نظریں جائے نماز پر جا پڑیں۔ اطمینان کا سانس لیا۔ جیسے ڈوبتے کو سہارا مل گیا ہو۔

'' میرا مطلب ہے۔'' وہ بولے۔'' مغرب کی نماز کا وقت تو جا رہا ہے۔'' انھیں وضو کرتے دیکھ کر نسرین نے جائے نماز بچھادی۔ اور آپ اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ کر سویٹر بننے لگی۔ وضو سے فارغ ہو کر وہ جائے نماز پر آ کھڑے ہوئے۔ ابھی نت باندھنے ہی لگے تھے کہ پیچھے سے خوشبو کا ایک لپٹا آیا، مڑ کر دیکھا۔ نسرین بیٹھی کچھ بن رہی تھی۔ وہ پھر بڑبڑانے

لگے۔ میرا مطلب ہے یعنی ابھی تو وقت ہے۔ کافی وقت ہے ابھی یہ پاس ہی تو مسجد ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے جوتا پہنا اور پیشتر اس کے کہ نسرین کچھ کہے، باہر نکل گئے۔ اس کے بعد انہیں پتا نہیں کہ کیا ہوا۔ وہ بھاگے بھاگے چلے گئے۔ کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھے بغیر آگے چلے گئے۔ ڈیوڑھی خالی پڑی تھی۔ وہاں مسجد کے دروازے پر کیسے پہنچ گئے۔ دروازے میں احسان علی کو دیکھ کر محلے والے متوجہ ہو گئے۔ ایک بولا:'' اس کو بھولا جانئے گیا گھر واپس آوے شام'' دوسرا کہنے لگا۔'' آخر کبھی نہ کبھی غلاظت کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔'' یہ سن کر معاً وہ مڑے جیسے وہاں سے بھاگ جانا چاہتے ہوں۔ عین اس وقت باباجی آ گئے۔ احسان علی کو پکڑ لیا'' آ کر واپس نہیں جایا کرتے احسان علی!'' وہ انہیں گھسیٹ کر مسجد میں لے آئے۔ اس بات پر انہیں اطمینان سا ہو گیا۔ بولے'' یہ دیکھو میں تو نہیں آیا لایا جا رہا ہوں۔'' '' چلو یونہی سہی'' باباجی نے کہا۔ تیسرا بولا'' آخر کوئی نہ کوئی بہانہ یا وسیلہ بن ہی جاتا ہے۔ نئی بہو کے قدم کو جادو بھئی'' چوتھے نے کہا۔'' ورنہ کہاں احسان علی کہاں مسجد'' اگر مسجد کا امام وقت تنگ سمجھ کر کھڑا نہ ہو جاتا تو جانے کیا کیا باتیں ہوتیں اس وقت۔

رات کو کھانے کے بعد نسرین نے انہیں کے کمرے میں اپنا بستر جما دیا اور پھر آپ چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے سویٹر بننے لگی۔ حقہ پیتے ہوئے وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بار بار نگاہیں ادھر ادھر بھٹکنے لگتیں۔ سامنے فرش پر نسرین کی خوبصورت سرخ چپلی ان کی آنکھوں تلے ناچتی، کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ اف وہ بار بار اپنی ناک سکیڑتے کیسی واہیات بو تھی۔'' وہاں وہ میری کتاب'' وہ آپ ہی آپ گنگنائے۔

'' کتاب؟'' نسرین کی آواز کمرے میں گونجی۔ '' میں دیتی ہوں آپ کی کتاب۔''

'' نہیں نہیں۔'' وہ چلائے۔'' میں خود لے لوں گا۔'' وہ اٹھ بیٹھے لیکن نسرین پہلے ہی الماری تک پہنچ چکی تھی۔

لاحول ولاقوۃ'' بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا۔ دور ہی رک گئے جیسے آگے بڑھنے سے ڈرتے ہوں۔'' وہ نیلی، وہ بائیں طرف والی، وہ چلائے''۔'' وہاں رکھ دو'' انہوں نے دور سے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔'' وہاں۔''

ان کی آنکھوں تلے کتاب کے لفظ ناچنے لگے۔ حاشیہ سرک سرک کر دائیں سے بائیں طرف جا پہنچتا اور پھر بائیں سے چلنا شروع کر دیتا۔ لفظوں کی قطاریں چلنے لگتیں اور پھر دفعتاً ایک جگہ ڈھیر ہو جاتیں۔ دور محلے والیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ سامنے نسرین کس انداز میں بیٹھی ہے انہوں نے سوچا۔ کیا نمائشی انداز میں'' اوہ'' وہ پھر چونکے '' کیا پھتے نائی کی ماں نہیں آئی'' وہ گویا کتاب سے پوچھنے لگے'' کوئی کام ہے کیا؟'' نسرین نے پوچھا '' نہیں نہیں'' وہ گھبرا گئے'' ویسے وہ سونے کو تو آئے گی ناں۔''

اس کی کیا ضرورت ہے'' نسرین بولی۔

'' میں جو ہوں۔'' '' وہ'' وہ سر تو گھبرا گئے۔

میں جو ہوں، میں جو ہوں'' دور محلے والیاں ڈھولک کے ساتھ گا رہی تھیں۔

'' اوہ گیارہ بج گئے۔'' انہوں نے گھڑی کی طرف

دیکھ کر کہا۔

ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں۔'' نسرین نے جواب دیا۔ ''وقت ہی نہیں گزرتا۔''

وقت ہی نہیں گزرتا'' گھڑی کراہنے لگی۔

وہ اٹھ بیٹھے اور بے خبری میں حمام کے سامنے بیٹھ کر وضو کرنے لگے۔

رات کو وہ گھبرا کر اٹھے۔ کمرے میں چھوٹی سی بتی جل رہی تھی۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے نسرین سوئی ہوئی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے پاؤں رضائی سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ''چینی چینی'' کسی نے تمسخر سے ان کے کان میں کہا۔ سرہانے تلے پر کان بالوں کا ڈھیر لگا تھا۔ سرہانے تلے پتلی پتلی انگلیاں بڑی تھیں جن پر روغن چمک رہا تھا۔ ''فضول'' انہوں نے منہ بنایا۔ اٹھ بیٹھے اور باہر نکل گئے۔ صحن میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دور محلے والیاں گا رہی تھیں۔۔۔ بال گوری دے بچھیر کالے، نہ جانے کیوں انہوں نے محسوس کیا جیسے ان کی زندگی کی تمام تر رنگینی ختم ہو چکی تھی۔

اندر آ کر وہ سوچنے لگے ''ہوں تو دو بجے ہیں'' وقت گزرتا ہی نہیں۔'' گھڑی چلانے لگی۔

جائے نماز کو دیکھ کر انہوں نے سوچا حمید نے کس قدر فحش غلطی کی ہے بیوقوف! انہوں نے نسرین کی طرف دیکھ کر سوچا اور پھر ان جانے میں جائے نماز پر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت ایک شخص اپنے دفتر میں بیٹھا مسلسل کچھ لکھ رہا تھا کہ اس کا دوست اسے ملنے آیا، تب بھی وہ اپنے حساب میں غرق رہا تو دوست نے حیرت سے پوچھا ''بھائی! یہ کیا لکھ رہے ہو؟'' ''کچھ نہیں یار! دراصل میری بیوی آج کل ڈائٹنگ کر رہی ہے۔ اس کا وزن ہفتے میں چار پونڈ کے حساب سے کم ہو رہا ہے۔ اس کا پورا وزن ایک سو اڑسٹھ پونڈ ہے۔ میں حساب لگا رہا ہوں کہ اگر چودہ ماہ تک وزن اسی طرح گھٹتا رہا تو بیوی سے نجات مل جائے گی۔ انہیں نماز گویا یاد ہی نہ تھی۔ میرے اللہ میرے دل سے آوازیں آ رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دیں۔ رکوع کے بغیر وہ سجدے میں گر گئے۔ عین اس وقت شاداں چاچی کے ساتھ کوٹھے سے نیچے اتری ''چپ'' شاداں زیر لب بولی۔ ''وہ سوچ رہے ہوں گے۔ آج تو چچا احسان علی سے وہ ایسا مذاق کر کے رہے گی کہ یاد کریں گے۔'' چاچی ہنس پڑی بولی ''تجھے بھی تو ہر سے شرارتیں ہی سوجھتی ہیں۔'' ''اور وہ کیا کرتے ہیں میرا؟'' شاداں نے کہا۔

''ہائیں'' انہیں سجدے میں پڑے دیکھ کر شاداں نے اپنا سینہ سنبھالا ''میں مر گئی یہاں تو تہجد ادا کی جا رہی ہے۔ نہ جانے بہو نے کیا جادو کر دیا ہے۔''

''چچ'' چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی۔ ''اور یہ دیکھو دلھن سو رہی ہے جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو''

احسان علی چونک کر اٹھ بیٹھے ان کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ ''ہائے میرے اللہ'' شاداں نے پھر اپنے آپ کو سنبھالا۔ احسان علی نے انہیں دیکھا تو دفعتاً منہ ڈھیلا پڑ گیا۔ چہرے پر جھریاں چھا گئیں جیسے یک لخت وہ بوڑھے ہو گئے ہوں۔ ''احسان علی'' شاداں نے چیخ سی ماری۔

احسان علی نے منہ پھیر لیا۔ ایک ہچکی نکل گئی اور وہ سجدے میں گر پڑے۔ انہوں نے محسوس کیا گویا چینی کا نازک سا کھلونا ریزہ ریزہ ہو کر ڈھیر ہو گیا۔ ■■■

بہروپیا

ایک بن بلائے مہمان کا قصہ۔ اسے باتیں بنانا خوب آتی تھیں کبھی جو کوئی قیمتی وقت کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی لے جائے۔

محمد اسلم ہنگورا

اسٹیشن

پر ریل رکے ایک گھنٹہ بیت چکا تھا مگر روانگی کی اب بھی کوئی خبر نہ تھی۔ ہفتہ بھر سے جاری بارشوں اور برف باری نے ریلوں کی آمدورفت شدید متاثر کر دی تھی۔ میں نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر کی طرف نظر دوڑائی اور صورت حال دیکھنی چاہی، لوگوں کی آمدورفت اس موسم میں بھی جاری تھی۔ ٹھنڈ کے باعث لوگوں کی اکثریت چائے کے کھوکھوں پر جمع تھی۔ بارش کے باعث لوگ پلیٹ فارم کی چھت کے نیچے ہی دبکے بیٹھے تھے۔ چہل پہل کم ہی دکھائی دے رہی تھی۔ اکا دکا قلی مسافروں کا سامان اٹھائے اسٹیشن سے باہر جا رہے تھے۔ پلیٹ فارم کے نیچے ایک تختی نما سیاہ رنگ کا بورڈ زنجیروں سے لٹک رہا تھا۔ اس پر سفید جلی حروف میں ''دانش پور'' لکھا تھا۔

تو گویا اس قصبے کا نام ''دانش پور'' ہے۔ میں نے دل میں کہا۔

کچھ دیر مزید انتظار کے بعد میں نے ایک قلی کو بلایا اور پوچھا کہ ریل کیوں رکی کھڑی ہے؟

صاحب! ''بیس کلومیٹر آگے سیلاب کی وجہ سے پٹڑی اکھڑ چکی۔ مرمت کا کام جاری ہے۔'' وہ آستین سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''تو مزید کتنا وقت ریل رکے گی؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''یہ بتانا ابھی مشکل ہے۔ اگر آپ کہو تو اسٹیشن ماسٹر سے بات کروں۔'' اس نے کہا۔

''کس بارے میں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ ریل کی روانگی تک آپ اس کے کمرے میں ٹھہر جائیں۔ ویسے بھی ان کے باہر ہونے سے کمرہ خالی ہو گا۔ اس چھوٹے کمرے سے وہ کمرا بڑا ہے۔ وہاں آپ بہ سہولت آرام کر سکیں گے۔'' قلی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے! بات کرو۔'' میں نے کہا۔

قلی چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد دوبارہ لوٹا اور بتایا ''صاحب! بات ہوگئی۔ آپ ریل کی روانگی تک ان کے کمرے میں ٹھہر سکتے ہیں۔''

کمرے میں ایک چھوٹا سا پلنگ، الماری، میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ مغربی سمت ایک چھوٹی کھڑکی تھی۔ دیوار پر دو سالہ پرانا کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ اس کے اوپر ایک گھڑی نصب تھی۔ گھڑی خراب تھی اور اس پر سوئیاں دو بجا رہی تھیں۔ فرش کا پلستر اکھڑا ہوا تھا تاہم کمرا صاف ستھرا تھا۔

''جیسے ہی ریل کی روانگی کی کوئی اطلاع ملی، میں آپ کو مطلع کردوں گا۔'' قلی نے میرا بریف کیس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ایک پیالی گرم چائے مل جائے گی۔'' میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔

میں نے ایک کرسی میز کے قریب سرکالی اور اس پر بیٹھ گیا۔ اپنی قیمتی گھڑی کلائی سے اتار کر میز پر رکھی۔ بیگ سے ایک کتاب نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ قلی چائے کی پیالی لیے کمرے میں داخل ہوا اور میز پر رکھ دی۔ بارش کے باعث وہ پورا بھیگا ہوا تھا۔ وہ ہتھیلیوں سے منہ پونچھتے ہوئے بولا ''آپ مجھے سرکاری افسر معلوم ہوتے ہیں؟''

ہاں! مگر دانشور ہونا میری شناخت ہے۔''

یہ بات میں نے قلی کی جانب توجہ سے دیکھتے ہوئے کہی۔ میں اس کے تاثرات جاننا چاہتا تھا مگر اس نے بنا کسی حیرت کے کہا: ''اچھا تو آپ دانشور ہیں۔''

اس کا انداز مجھے عجیب لگا۔ مجھے امید تھی کہ شاید قلی میری دانشورانہ زندگی کے متعلق کچھ پوچھے گا۔ اسے اپنے تئیں خوشی ہوگی کہ آج وہ ایک دانشور سے محوِ گفتگو ہے۔ مگر اس نے تو بے پروائی سے بات ٹال دی۔ گویا احساس برتری کا تاثر جو میں اپنی شخصیت کے بارے میں قائم کرنے کا متمنی تھا، فوراً رفو چکر ہوگیا۔ قلی باہر گیا تو میں چائے پیتے ہوئے کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں؟'' ایک وجیہہ، لمبے قد کا شخص جس نے برساتی کوٹ اور سر پر ہیٹ پہن رکھا تھا، مجھ سے اجازت کا طلب گار ہوا۔

''جی!'' میں اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا: ''میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کی تنہائی اور آرام میں مخل ہوا۔ یہاں سے گزر رہا تھا کہ بارش اچانک تیز ہو گئی۔ سوچا آپ کے کمرے میں پناہ لی جائے۔''

''کوئی بات نہیں'' میں نے اشارے سے اسے کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ وہ کرسی کو، میز کے قریب سرکاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

''شاید آپ کسی کاروباری سلسلے میں سفر کر رہے ہیں؟'' ہیٹ اتار کر دونوں گھٹنوں کے درمیان رکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں، ایک سرکاری کام کے سلسلے میں۔'' میں نے جواباً کہا۔

''تو آپ سرکاری افسر ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی!'' میں اس تعارف میں اضافہ کرتا مگر سابقہ تجربے کا سوچا، تو اسی پر اکتفا کیا۔ ''اور آپ.....؟''

''میں یہاں ایک دوست کی آمد کا منتظر ہوں۔ اس نے میرے استفسار سے پہلے ہی بتا دیا۔

''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔'' اجنبی نے پھر میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔

''مجتبیٰ فاروقی! اور آپ کا؟'' میں نے پوچھا۔

''ضرار آفندی!''

ضرار آفندی! کچھ عجیب سا نام ہے۔ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''کبھی کبھار میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ مگر یہ نام میرے والدین نے رکھا تھا، اس میں میرا کیا دخل؟''

''مگر آپ یہ نام تبدیل بھی کرسکتے تھے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے ضرورت محسوس نہیں کی، ویسے بھی ناموں سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''فرق کیسے نہیں پڑتا! نام کے اثرات انسان کی شخصیت پر ضرور مرتب ہوتے ہیں۔'' میں نے پُرزور انداز میں بولا۔

''کیسے اثرات؟ منفی یا مثبت؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید دونوں کے طرح کے۔'' میں نے کہا۔

''یعنی اچھے نام اچھے اثرات اور بُرے نام کے برے اثرات! یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟''

''شاید!'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''صاحب! میرے محلے میں ایک بھنگی راجکمار رہتا ہے۔ وہ صبح سے شام تک محلے کی گندگی صاف کرتا ہے۔ اسی طرح میرے پڑوس میں شہزادی نام کی خاتون رہتی ہے۔ اس کا شوہر فیکٹری میں مزدور ہے۔ جب کہ ہمارے اس چھوٹے شہر کے امیر ترین شخص کا نام مسکین خان ہے اور تو اور ہمارے پٹواری کا انیس سالہ بیٹا جو دماغی طور پر پاگل ہے اور پورا دن محلے کی گلیوں میں پھٹے کپڑوں میں گھومتا ہے، اس کا نام فہیم ہے۔ اب آپ بتائیے! ناموں کے کون سے اثرات شخصیت کو متاثر کرتے ہیں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''بہرحال میں اس بارے میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔'' میں نے دوبارہ موضوع کو ختم کرنا چاہا۔

اس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''ہر شخص بات کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے ہی نقطۂ نظر سے اس کی تکذیب اور تردید کرتا ہے۔ مگر حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ ہمارے خیالات اس کی ماہیت تبدیل نہیں کرسکتے۔''

''مگر آپ یہ تو تسلیم کریں گے کہ ایک ہی شے کے متعلق دو مختلف خیالات رکھنے والوں میں سے ایک دوست غلط ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔ ''نہیں'' میں اس بات سے اتفاق نہیں کروں گا۔ یعنی آپ کہنا چاہتے ہیں اگر ایک ہی چیز کے بارے میں دو مختلف نظریات ہوں، تو وہ بیک وقت درست ہوسکتے ہیں۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''شاید!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔''

''آپ کو یہ عجیب لگے مگر میرے لیے تو عام بات ہے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو بات کسی ایک کے لیے عام ہو، وہ دوسرے کے لیے خاص ہوتی ہے۔''

''مثلاً'' میں نے بھی اسے زیر کرنے کی خاطر پوچھا۔

''مثلاً آپ اپنی گھڑی کو ہی لے لیجیے۔'' اس نے میز پر رکھی میری گھڑی اٹھاتے ہوئے کہا ''اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

''یہی کہ یہ ایک قیمتی گھڑی ہے۔ پچھلے برس ملائشیا میں سیاحت کے دوران وہاں کے مقامی بازار سے 80 ہزار پاکستانی روپوں میں خریدی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا یہ بتائیے اس وقت گھڑی میں کیا بجا ہے؟''

''قریباً چار بج کر پچاس منٹ۔'' میں نے گھڑی پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''اور یہی وقت یعنی چار بج کر پچاس منٹ اس وقت میری گھڑی بھی بجا رہی ہے۔ حالانکہ اس کی قیمت بمشکل ہزار روپے ہے۔'' وہ اپنی کلائی پر بندھی

گھڑی پر ایک نظر ڈال کر بولا۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے اظہار حیرت کرتے ہوئے پوچھا۔

''کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دونوں گھڑیاں ایک طرح سے کام کر رہی ہیں، ان کی قیمتوں میں فرق ہے کارکردگی میں نہیں! آپ کی گھڑی مہنگی ضرور ہے مگر قیمتی نہیں۔''

لیکن ابھی آپ قبول کر چکے کہ آپ کی گھڑی تقریباً ایک ہزار روپے کی ہے۔ جب کہ میری گھڑی کی قیمت 80ہزار روپے یعنی آپ کی گھڑی کی قیمت سے 80 گنا زائد قیمت اور پھر بھی.....''

''میں اسی بات کی وضاحت کر رہا ہوں۔ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔'' کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ جب آپ نے یہ گھڑی خریدی تو کیا بازار میں یہی ایک گھڑی دستیاب تھی۔

''نہیں! اس قسم کی سیکڑوں گھڑیاں دکان میں رکھی تھیں۔'' میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آپ کی گھڑی مہنگی ضرور ہے۔ قیمتی نہیں۔ کیونکہ ہم گھڑی کو قیمتی تب کہتے ہیں جب پورے بازار میں ایسی صرف چند گھڑیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ اس لیے جو چیز کم دستیاب ہو، وہ نایاب ہوتی ہے اور نایاب چیز ہی قیمتی ہوتی ہے۔''

میں کچھ ساعتیں حیرت سے اسے تکتا رہا۔ پہلے اس کی احمقانہ وضاحت پر ہنس پڑا پھر یکبارگی چہرے پر سنجیدگی لاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔''میں سمجھتا ہوں! ہم ایک لاحاصل اور فضول گفتگو پر اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔''

''دنیا میں کئی معاملات پر مباحث ہوتے ہیں جن کا بسا اوقات کچھ نتیجہ نہیں نکلتا، پھر بھی وہ فضول نہیں کہلاتے۔ مثلاً ہمارے ٹی وی چینلوں پر مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما ملکی معاملات پر ایک دوسرے سے مباحثے کرتے ہیں۔ اکثر ایک فریق کے دوسرے سے اختلاف یا متضاد رائے کی بدولت پورا مباحثہ لاحاصل رہتا ہے۔ پھر بھی ہم اسے فضول نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح دنیا میں بہت سے ملکوں کے تنازعات طویل مذاکرات کے بعد بھی لاحاصل رہے ہیں۔ پھر بھی ہم انہیں فضول نہیں کہہ سکتے۔ اس نے گفتگو کو نیا رخ دے دیا۔

میں اپنے تئیں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ میرا اجنبی مہمان کوئی دانشور ہے یا صرف ایک باتونی شخص جسے بات سے بات نکالنے کا فن خوب آتا ہے۔

''میرا خیال ہے بارش اب کچھ تھم چکی، مجھے چلنا چاہیے۔ میں نے پہلے ہی آپ کا قیمتی وقت لے لیا۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''نہیں، بلکہ آپ کے ساتھ وقت اچھا گزر گیا۔'' میں نے اخلاقاً کہا۔

اس نے دونوں ہاتھ کوٹ میں ڈالے اور باہر چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر اسی کے خیال میں گم رہا۔ اچانک قلی دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔

''ریل آدھے گھنٹے میں روانہ ہو گی۔'' اس نے بتایا۔

''کیا یہ شخص کوئی دانشور تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کون؟'' قلی نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہی جو میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔'' میں بولا

''دانشور! وہ تو ایک بہروپیا تھا۔ قلی حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بہروپیا!'' میں نے بے اختیار کہا۔

''جی ہاں! دیکھنا کہیں کوئی چیز تو نہیں لے گیا؟''

چیز! میری آواز حلق میں ہی اٹک گئی اور ہاتھ غیر ارادی طور پر کوٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ پھر میری نظر میز پر پڑی اور چیخ اٹھا۔ اوہ! میری قیمتی گھڑی!'' ■■■

سچی کہانی

(مدرز ڈے پر خصوصی)

جتھے پیر اُتھے خیر

ایک بیٹے کی کہانی، اسے اپنی ماں ہی ایک کہانی لگتی تھی
مائیں جو ایسی نہ ہوتیں تو زندگی کی تکمیل کیونکر ہو پاتی

نوید اسلام صدیقی

مجھے اچھی طرح یاد ہے 2005ء میں کراچی ایئر پورٹ سے پی آئی اے کے جہاز میں لاہور آنے کے لیے سوار ہوا تھا۔ میرے ساتھ کی سیٹ پر ایک نوجوان خاموش اور گم سم آکر بیٹھ گیا۔ جہاز میں اناؤنسمنٹ (Announcement) ہوئی کہ جہاز کے اڑنے سے قبل سیٹ بیلٹ باندھ لیں لیکن اس نوجوان نے اس اعلان کو کوئی اہمیت نہ دی۔ میں نے سمجھا کہ یہ نوجوان ہماری نئی نسل کی نمائندگی کر رہا ہے جو اپنے آپ کو کسی اصول قاعدے کا تابع نہیں سمجھتی۔ کچھ دیر بعد ایئر ہوسٹس ادھر آ گئی اور اس نے کہا کہ آپ نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی ہے۔ جواباً نوجوان نے کہا ''سوری'' اور سیٹ بیلٹ باندھ لی۔

کچھ دیر بعد ہم فضا میں تھے اور جہاز کا عملہ مسافروں میں کھانا تقسیم کر رہا تھا۔ اس کے سامنے ٹرے رکھی گئی تو اس نے اشارے سے کہا لے جائیں۔ میں کافی دیر خاموشی سے اس کی عجیب و غریب حرکات دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرے منہ سے نکلا'' آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ خدا خیر کرے۔'' کہنے لگا ''میری والدہ گزشتہ رات انتقال کر گئی ہیں، میں جنازے میں شرکت کے لیے گاؤں جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا ''میں آپ کے غم کا اندازہ کر سکتا ہوں کیونکہ

پچھلے سال تین جنوری کو ہم بھی اس ہستی سے محروم ہوگئے جو ہمارے لیے ہر وقت دعا گو رہتی تھی۔ ہم نے اس کو اپنا مسئلہ بتانا اور اس نے مصلّٰی لے کر سجدے میں گر جانا۔ اور مصلّٰی تب ہی چھوڑنا جب اس نے خدا سے اپنی دعا کی قبولیت کا یقین حاصل کر لینا''۔ اچانک اس نوجوان نے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔ تمام لوگ کھانا پینا چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک ایئر ہوسٹس اور فلائیٹ سٹیورڈ بھاگ کر ہماری سیٹ کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ میں حالات کو نارمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں نے نوجوان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اگر میری کسی بات کو آپ نے Feel کیا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ وہ نوجوان کہنے لگا'' آپ جو کچھ دعا کے حوالے سے اپنی والدہ کے بارے میں بتا رہے تھے وہ تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے آپ میری والدہ کی بات کر رہے ہیں۔ آہ! میری ماں ایسی ہی تھی، ایسے ہی مصلّے پر بیٹھ کر ہمارے لیے دعائیں کرتی تھی۔ آپ کی بات سے مجھے ایک دم خیال آیا کہ ہم پر کیا قیامت گزر گئی ہے۔ اب کون ہے جو ہمارے لیے راتوں کو جاگ جاگ کر دعائیں کرے گا! بھائی صاحب! آپ نے اچانک میرے دل پر اتنے زور سے دستک دے دی کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور وہ آنسو جو میں نے بڑی مشکل سے روکے ہوئے تھے بے اختیار بہنے لگ پڑے۔ آپ کو میں کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں، وہ ماں ہی نہیں تھی وہ تو ایک انسٹی ٹیوشن (Institution) تھا۔ ہماری ماں نے ہمیں انسان بنایا۔ بڑوں چھوٹوں کا احترام سکھایا، صفائی ستھرائی سلیقہ کے بارے میں اسی نے بتایا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارا خاندان جو جاہلوں، گنواروں اور اجڈ لوگوں کا خاندان تھا آج پورے کا پورا خاندان اس کی جلائی ہوئی شمع علم سے منور ہو رہا ہے۔''

میں نے کہا'' یقیناً آپ کی ماں ایک عظیم عورت ہوگی، آپ مجھ کو اُن کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔'' نوجوان نے جواباً کہا کہ ہمارا گاؤں چکوال کے پاس ہے۔ میرا نام انعام الٰہی ہے، میں چار بھائیوں میں سے تیسرا ہوں۔ ہم چاروں بھائیوں سے چھوٹی ہماری ایک بہن ہے۔

میں نے ایک چھوٹے تنگ و تاریک مکان میں آنکھ کھولی۔ ہمارا باپ مستری تھا۔ مکانوں کی تعمیر و مرمت کا کام کرتا تھا۔ برائے نام سی دیہاڑی ہوتی تھی۔ وہ گھر میں پیسے کم ہی لاتا تھا۔ ہر وقت حقہ یا سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ اس کو بچوں کی تعلیم و تربیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اکثر ہماری ماں سے کہا کرتا تھا: ''تُو جو چاہے کر لے ہماری حیثیت اس معاشرے میں گدھے گھوڑے جتنی ہی رہنی ہے۔ جو اشرف المخلوقات ہوتے ہیں وہ اشرف المخلوقات کے گھر ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔'' ہماری ماں کا صرف ایک ہی جواب ہوتا تھا''ہر انسان خدا کی نظر میں برابر ہے، وہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ انسان میں فرق صرف تعلیم و تربیت ہی سے پڑتا ہے۔''

ہم باپ کی حرکات سے، اس کے لاابالی پن کی وجہ سے اس کے بارے میں کوئی نامناسب بات کر دیتے تو ہماری ماں اس حرکت کو بالکل برداشت نہ کرتی تھی۔ کہا کرتی تھی کہ بیٹا! یاد رکھو باپ ہی گھر کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اسی کی وجہ سے ایک گھر کی عزت بنی ہوتی ہے۔ ہر وقت دعا کرتے رہا کرو کہ اللہ تعالیٰ اُس کو صحت اور ہمت دے، اس کو خوش رکھے۔ نہ جانے وہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ ہمارے والد نے ہماری ماں کی کبھی کوئی قدر نہ کی لیکن ماں ان کی دل و جان سے خدمت کرتی تھی۔ جب وہ کام کرنے کے لیے گھر سے نکلتے تھے تو بار بار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے ہوتے تھے'' جتھے پیر، اُتھے خیر''

(جہاں جہاں آپ کا قدم پڑے، وہاں وہاں ہر طرح خیریت رہے)۔ جب گھر سے باہر نکل جاتے تو کافی دیر بیٹھی ان کے لیے دعا کرتی رہتی۔ کئی دفعہ ہمارے والد نے بتایا کہ آج میں بس مرتے مرتے بچا۔ لیکن تمہاری ماں کی دعاؤں نے مجھے بچا لیا۔ آج میں سوچتا ہوں وہ ہمیں بڑوں کا احترام، ان کی عزت کرنا سکھا رہی تھی۔

ہمارا بڑا بھائی اکرام الٰہی جو فوج سے بطور صوبیدار ریٹائر ہوا تھا، اُس کو پڑھانے کے لیے میری ماں نے بہت محنت کی۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر پہلا بچہ صحیح لائن پر چل پڑا تو پھر باقی بچے خود بخود اُس کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے۔ اُس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو لکھنا پڑھنا مجھ کو ایک نارمل کام محسوس ہوا۔ پرانے زمانے میں چھ سال کی عمر میں اسکول میں بچہ داخل ہوتا تھا۔ اُس وقت تک وہ اچھا خاصا شُتر بے مہار ہو جاتا تھا۔ میری ماں نے سوچا کہ بیٹے کو مصروف رکھنا چاہیے۔ اس کے لیے اس نے طرح طرح کے کام سوچے مثلاً اس کو قرآنی قاعدہ لے کر دیا۔ بچہ مولوی صاحب کے گھر میں جتنی دیر قاعدہ پڑھتا وہ ادھر ہی رہتی اور پڑھانے کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہتی۔ گھر آ کر بھائی کو پڑھے ہوئے الفاظ بار بار دہرانے کے لیے مجبور کرتی۔ بھائی کے ساتھ وہ خود بھی ہر چیز سیکھ رہی تھی۔ چھ سال کی عمر میں جب میرا بھائی اسکول میں داخل ہوا تو وہ پہلی جماعت کی سب کتابیں پڑھ سکتا تھا اور ایک سے سو تک گنتی سنا سکتا تھا۔ ہاں ایک دلچسپ بات یاد آئی میرا بھائی بتایا کرتا تھا کہ گرمیوں میں ہم چھت پر لیٹتے تھے اور آسمان پر تاروں کے ذریعے ہم گنتی سیکھا کرتے تھے، جمع تفریق کے سوال حل کیا کرتے تھے، ماں جب کبھی کپڑے دھونے گاؤں سے کچھ فاصلے پر برساتی نالے پر جاتی تھی تو مجھ سے ریت کے اوپر ا، ب، ج اور گنتی لکھنے کی پریکٹس کروایا کرتی تھی۔

جب دوپہر کو اسکول میں چھٹی ہوتی، میری والدہ بھائی کو لینے کے لیے اسکول کے دروازے پر موجود ہوتی۔ گھر جاتے ہی بیقراری ظاہر کرتے ہوئے ہر مضمون کے بارے میں پوچھنا آج کیا کیا پڑھا ہے۔ مجھ کو بھی بتاؤ۔ جہاں بھائی نے اطمینان بخش جواب نہ دینا، اُس

کے پیچھے پڑ جانا کہ بات مجھے سمجھ نہیں آئی اچھی طرح سمجھاؤ۔ یہاں تک بھی ہوا کہ اگلے دن صبح سویرے اسکول پہنچ جانا، بھائی کے استاد سے ملنا کہ میرے بیٹے کو فلاں بات سمجھ نہیں آئی ہے، مہربانی کریں اس کو دوبارہ سمجھادیں۔ کئی دفعہ استاد نے کہا کہ ایسی خبطی ماں میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ ایک دفعہ استاد غصے میں آکر میری ماں کو ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس لے گیا اور اُن سے میری ماں کی شکایت کی کہ ''یہ خبطی عورت ہر دوسرے دن آکر مجھے ڈسٹرب کرتی ہے۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب نے ماں سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ ماں کا جواب سن کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا ''میں ایسی ماں کی عظمت کو سلام کرتا ہوں جس کو تعلیم کی اہمیت معلوم ہے، جو اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے دیوانی ہورہی ہے۔'' ہیڈ ماسٹر صاحب نے استاد سے پوچھا کیا اس گاؤں کے کسی اور بچے کے ماں باپ بھی کبھی تمہارے پاس آئے ہیں؟ استاد نے بتایا کہ اکثر آتے رہتے ہیں، وہ عام طور پر بچوں کی غیر حاضری کی وجوہات بتانے یا چھٹیاں لینے کے لیے آتے ہیں لیکن کسی نے تعلیم کے حوالے سے آکر مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔ نجانے اس خبطی عورت کے پیٹ میں تعلیم کا کیا درد ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے استاد سے کہا کہ آئندہ یہ 'خبطی ماں' جب بھی آپ کے پاس آئے آپ نے اسے مطمئن کرکے پورے احترام سے بھیجنا ہے۔ اس جاہل معاشرے میں یہ ایک حیران کُن مثال ہے۔

آپ یقین کریں گے کہ میرا بھائی پہلی سے پانچویں تک ہر جماعت میں اسکول میں اول آیا۔ پانچویں جماعت کے وظیفے کے امتحان میں وہ شریک ہوا اور اس نے وظیفہ حاصل کیا۔ جب میرا بڑا بھائی پانچویں میں پڑھ رہا تھا تو اس سے چھوٹا بھائی رحمت الٰہی تیسری جماعت میں وہی کمالات دکھا رہا تھا۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو پڑھانے میں ماں کا کافی ہاتھ بٹایا۔ مجھے تو دونوں بھائیوں نے پڑھایا، ماں کو میرے ساتھ زیادہ دماغ سوزی نہیں کرنا پڑی۔ ہاں یہ بھی بتاتا چلوں ہمارے گھر میں ہر بات تعلیمی نقطۂ نظر سے کی جاتی تھی۔ مثلاً ہم گھر میں آپس میں اردو میں بات کیا کرتے تھے، کھانا کھاتے ہوئے آدھی یا چوتھائی روٹی مانگنے کے بجائے ہم ایک بٹا دو روٹی یا ایک بٹا چار روٹی طلب کرتے تھے۔ ماں ہر وقت کہتی رہتی تھی آپ پڑھے لکھے بچے ہیں آپ کے منہ سے کوئی گندہ لفظ، کوئی گالی نہیں نکلنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے ہم سب کی زبانیں گالیوں سے پاک صاف رہیں۔

میٹرک کرنے کے بعد اکرام الٰہی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ فوج میں اس کو میڈیکل کور میں بطور کمپاؤنڈر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ تین سال ڈیپوٹیشن پر وہ سعودی عرب میں بھی رہا جس سے ہمارے خاندان کی معاشی حالت میں ایک انقلاب آگیا۔

جن دنوں بھائی کی پوسٹنگ کراچی میں تھی۔ اس نے ماں کو خط لکھا کہ مجھے یہاں ایک پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی کا رشتہ ملتا ہے۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ آپ کراچی آکر اس لڑکی کو دیکھ کر اپنے فیصلہ سے آگاہ کریں۔ ماں فوراً تیار ہوگئی۔ ہمارے باپ نے، خاندان نے اور پورے گاؤں نے ماں کو یہ 'احمقانہ' قدم اُٹھانے سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ سب ایک ہی بات کہہ رہے تھے کہ شہری لڑکی خطرناک اور 'چتر' (چالاک) ہوتی ہے۔ بہو گھر لاتے لاتے تم اپنے لڑکے کو بھی گنوا

بیٹھو گی۔ میری ماں ہر ایک کی بات بڑے تحمل سے سنتی، اُس کا ہر ایک کو ایک ہی جواب ہوتا تھا میری تربیت ایسی ہے کہ مجھے اپنے بچوں پر پورا اعتماد ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ میرے بیٹے میں کوئی گُن ہے جس کو دیکھ کر لڑکی والوں نے شادی کی خواہش ظاہر کی ہے اور یہ گُن سوائے تعلیم و تربیت کے اور کچھ نہیں ہے۔ پھر میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ پڑھی لکھی بہو تو سونا ہے اور سونے کا یہ کمال ہوتا ہے کہ سونے کے ساتھ جو مٹی لگے وہ بھی سونا بن جاتی ہے۔ مجھے یہ حقیقت معلوم ہے کہ ماں کی گود بچے کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے۔ انشا اللہ میری یہ بہو میرے خاندان کو چار چاند لگا دے گی۔

قصہ مختصر ہم سب بہن بھائی کراچی کی سیر کرنے کے بہانے کراچی پہنچ گئے۔ وہ بھی کیا زمانے تھے، سیدھا سادا دور تھا۔ ہم نے رہنا تو چھاؤنی میں ایک فوجی کوارٹر میں تھا لیکن ہماری ہونے والی بھابھی شائلہ کے والدین ہمیں زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ چند ماہ بعد شادی ہوگئی۔ شائلہ بھابھی کا ہمارے خاندان میں آنا ایک انقلاب کا باعث بنا۔ وہ بی اے، بی ایڈ تھی، کراچی کے ایک سکول میں پڑھا رہی تھی۔ اُس نے ماں سے کہا کہ آپ حکم دیں تو میں نوکری چھوڑ کر گاؤں میں آکر آپ کی خدمت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن ماں نے کہا تم نوکری نہ چھوڑو اور کراچی ہی میں رہو۔ ہماری بھابھی

ہم سب بہن بھائیوں کو کراچی لے گئی۔ ہمارے والدین اپنی خواہش پر گاؤں ہی میں رہے۔ پڑھے لکھے خاندان کی بیٹی نے ہماری تعلیم و تربیت میں رہی سہی کمی کا تدارک کر دیا۔ ہم سب بھائیوں کی شادیاں کراچی میں ہی بھابھی کے خاندان کے تعاون سے ہوئیں۔ ماں نے جو علم کی شمع گھپ اندھیرے میں جلائی تھی آج یقین نہیں آتا کہ اس کی روشنی اتنے دور دور تک کیسے پہنچ گئی۔ میں ایم اے انگلش ہوں اور آج کل کراچی کے ایک گورنمنٹ کالج میں لیکچرار ہوں۔ میرا بڑا بھائی فوت ہوچکا ہے لیکن اس کے دو بیٹے ڈاکٹر ہیں۔ میرا بھائی رحمت الٰہی سعودی عرب میں کئی سال سے کاروبار کر رہا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ میری چھوٹی بہن اسلام آباد میں ایم ایس سی کی طالبہ ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ اسکالرشپ پر پڑھ رہی ہے۔

ہم نے اور ہمارے خاندان نے جو غربت دیکھی ہے آپ اس کا تصور نہیں کرسکتے۔ ایک واقعہ جو ہماری ماں نے ہمیں کئی دفعہ سنایا وہ میں آپ کو سناتا ہوں۔ بتاتی تھی کہ ایک دفعہ میں ایک کھیت کے پاس سے گزر رہی تھی، میں نے دیکھا ایک گدھا کسی کے کھیت میں گھسا ہوا ہے۔ میں پتھر وغیرہ اس کی طرف پھینک رہی تھی تاکہ کھیت سے باہر نکل جائے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔ اتنے میں اس کھیت کا مالک آگیا اور غصے سے

مجھے کہا کہ تمہارا گدھا میرے کھیت میں کیوں گھسا ہوا ہے۔ میں نے کہا ''بھراوا! میں کتھے کھوتیاں جوگی'' (بھائی! میں اس قابل کہاں کہ میرے بھی اپنے گدھے ہوں) پھر ماں کی زندگی ہی میں وہ وقت بھی آیا کہ ہمارے اپنے دو ٹرک تھے، بڑے بھائی کے پاس کار تھی۔ ماں جب کار میں بیٹھتی تو بھائی کہتا ماں! ذرا وہ قصہ پھر سناؤ ناں کہ میری قسمت میں گدھا کہاں۔

تھوڑی دیر میں ہماری فلائیٹ ایئر پورٹ پر اترنے والی ہے مگر میں آپ کو والدہ کا ایک لطیفہ سنا دوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہماری ماں کتنی سادہ طبیعت کی مالک تھی۔ ہمارے بھائی نے آج سے کئی سال قبل والدہ کو حج پر جانے کے لیے سعودیہ کا ٹکٹ بھیجا۔ خود ہی بتایا کرتی تھی کہ جب ہم کراچی ایئر پورٹ کے اندر بس پر بیٹھ کر ہوائی جہاز کے قریب گئے تو جہاز کی بلندی اور اس کے ساتھ لگی ہوئی لمبی سی سیڑھی دیکھ کر میرا خون خشک ہوگیا۔ میں نے سیڑھی کے قریب کھڑے پی آئی اے کے افسر کو بتایا کہ میں نے نہیں جانا مجھ کو ڈر لگ رہا ہے۔ وہ مسکرایا اُس نے جہاز کے دروازے میں کھڑی ایئر ہوسٹس کو نیچے بلایا اور پتا نہیں اسے کیا کہا، وہ مجھے کہنے لگی اماں ابھی تو یہ جہاز دو تین گھنٹے ادھر زمین پر چلتا رہے گا، دو تین گھنٹے بعد ہی معلوم ہوگا کہ یہ اُڑے گا یا نہیں۔ جتنی دیر اُڑتا نہیں اتنی دیر تو جہاز میں بیٹھنے کے مزے لے لو۔ کھاؤ پیو عیش کرو۔ (پھر اس نے ایک جہاز کی طرف اشارہ کیا جو ایئر پورٹ کے اندر زمین پر چل رہا تھا۔) ماں کہتی ہے اسی طرح مجھے باتوں میں لگا کر اوپر لے گئی اور مجھے کھڑکی میں سے کہا کہ باہر دیکھتی رہو یہ ہوائی جہاز کافی دیر ہمیں یہاں ایئر پورٹ پر سیر کرائے گا۔ پھر وہ ایک عورت کو لے آئی جو ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگ گئی۔ میرے بچوں کا پوچھنے لگ گئی۔ میں جب اپنے بچوں کا قصہ شروع کردوں تو پھر مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ کبھی جہاز والے جوس پلائیں، کبھی کھانا کھلائیں اور کبھی چائے پلائیں..... اسی طرح باتوں باتوں میں کافی وقت گزر گیا۔ جہاز والے کوئی اعلان کررہے تھے، میں نے اس عورت سے پوچھا کہ یہ بار بار کیا اعلان ہورہا ہے۔ اُس نے بتایا وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے حضور پاک ﷺ کے صدقے نورانی مقدس سرزمین پر پہنچ چکے ہیں۔ تم باہر دیکھو ہمارا جہاز زمین کے اوپر چل رہا ہے مگر یہ زمین پاکستان کی نہیں سعودی عرب کی ہے۔ ماں یہ سب حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

لاہور ایئر پورٹ پر جہاز سے اتر کر انعام الٰہی کے ٹیکسی لینے تک میں اس کے ساتھ رہا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا آپ کی وجہ سے میرا دماغ پھٹنے سے بچ گیا۔ آپ نے جس خلوص اور محبت سے میری باتوں کو سنا ہے اس کے لیے میں آپ کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ اب میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ انعام ابھی مجھ سے سلام لے کر رخصت ہونے لگا تو خدا جانے کیوں میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''انعام صاحب! جتھے پیر اُتھے خیر۔'' انعام نے مجھے گلے لگا لیا۔ یہ مجھے یاد ہے کہ میں نے انعام الٰہی سے کہا تھا کہ آپ کی عظیم ماں کے بارے میں مضمون لکھا جانا چاہیے۔ انعام الٰہی کا پتا میرے پاس تھا جو کاغذات کے انبار میں کہیں گم ہوگیا۔ اللہ کرے انعام الٰہی صاحب کی نظر سے یہ مضمون گزرے۔

■■■

تازہ افسانہ

مہرو

ایک ویران گھر کی ویرانی کا ماجرا
اس نے ایک دل کی دنیا ہی ویران کر ڈالی تھی

وقار احمد ملک

یہ قصبہ آج بھی اس بھری پری دنیا سے کٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں صدیوں سے اداسی، خاموشی اور ویرانی کی حکومت ہے۔ یہاں کے لوگ بھی دھیمے لہجے میں باتیں کرتے ہیں۔ وہ بولتے بھی اشد ضرورت کے وقت ہیں۔ عام طور پر معمول کی باتیں اشاروں کے ذریعے سے ہی کہہ دی جاتی ہیں۔ اس قصبے میں کبھی کسی رنگین پرندے نے بسیرا نہیں کیا۔ اور نہ ہی کبھی کسی مہاجر پرندے کی مدھ بھری چہکاریں کسی نے سنی ہیں۔ یہاں کی

دو شیزائیں الھڑ ہوتے ہوئے بھی جسم کے پھول کھلتے ہی گھڑاپے کی چادر اوڑھ لیتی ہیں۔ نہ کوئی گھر پھسر، نہ آنکھ مٹکے، نہ تانک جھانک۔ وہ جوانی کو بھی صوفیوں کی طرح گزار دیتی ہیں۔ نوجوان گھروں میں دبکے رہتے ہیں۔ کوئی بہ امرِ مجبوری ان کو اپنے کوٹھوں کچیروں سے باہر نکلنے پر مجبور کر بھی دے تو ایسے سر جھکائے چلتے ہیں جیسے جوانی کی اتراہٹ ان کے گرم خون سے کسی نے نچوڑ لی ہو۔ اس قصبے میں سب کچھ چپکے چپکے ہی ہو جاتا ہے۔ بچے خاموشی سے لڑکپن کو عبور کرتے ہوئے بڑے مودب انداز میں جوانی کو خوش آمدید اور پھر الوداع کہہ کر بڑھاپے کی کٹیا میں داخل ہو کر ہلکی اور کپکپاتی ہوئی کھانسی کھانس کھانس کر ویران قبروں میں جا پڑتے ہیں۔ یہاں کی فضائیں شادی بیاہ کے بینڈ باجوں سے انجان ہیں تو فوتیدگی کے بین اور آہ وزاریاں بھی ان کے لیے اجنبی ہیں۔

یہاں سے چند میل دور ریل کی پٹڑی اور صدیوں پرانا ریلوے اسٹیشن ہر وقت اونگھتا رہتا ہے۔ تاہم دو گاڑیاں جو دن بھر میں یہاں سے گزرتی ہیں اس اسٹیشن اور قرب و جوار کی خاموشی کے لیے واحد رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ بھلا ہو سرکار کا جس نے ان گاڑیوں کی آمد و رفت معطل کر کے اس علاقے کی سو فیصد خاموشی کو یقینی بنا دیا ہے۔

اکیسویں صدی کے درجن بھر سال گزرنے کے باوجود یہاں تک پٹرول، ڈیزل اور سی این جی کی بدبو نہیں پہنچی۔ کچھ سائیکل اور چند تانگے باہر کی دنیا سے رابطے کا ذریعہ ہیں۔ تانگا اسٹینڈ سے جنوب کی طرف جائیں تو دو سو قدم کے فاصلے پر ایک کچا راستہ دائیں طرف مغرب کو مڑ جاتا ہے۔ یہ راستہ سیدھا جائیں تو بوڑھے درختوں کا ایک پراسرار سا جھنڈ اور اس سے آگے قبرستان ہے۔ جھنڈ سے تھوڑا پہلے دائیں ہاتھ پر دو کچیروں یعنی کچے کمروں پر مشتمل ایک بوسیدہ سا مکان ہے۔ اس مکان میں مہرو نامی خاتون اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ مہرو کا یہ مکان شاید کبھی گھر ہوا کرتا تھا لیکن اب یہ ایک گھر کی بنیادی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ کچا صحن جس پر شاید برسوں پہلے آخری مرتبہ مٹی کا لیپ دیا گیا تھا اب جا بجا ٹوٹ پھٹا ہے۔ اس کے اردگرد چار دیواری کی شکست و ریخت کے آثار موجود ہیں۔ مہرو کے ان کچے کوٹھوں پر وقت کا پہیہ اپنی گردش بھلا بیٹھا ہے۔

مہرو پہلے بھی خاموش تھی آج بھی چپ ہے۔ اسی چپ کے سہارے مہرو اپنی اس جاگیر کے اندر جانے کتنی صدیوں سے سانس کی ڈوری بٹ رہی ہے۔ تنہا لوگوں کی طرح اس نے کبھی خود کلامی کا بھی سہارا نہیں لیا۔ لیٹے، بیٹھے، چلتے پھرتے بس اس کچے راستے کو تکے جاتی ہے جو ان کوٹھوں کو باہر کی دنیا سے ملانے کا واحد ذریعہ ہے۔ مہرو کو اپنی سابقہ زندگی کے پرمسرت دن بھی یاد نہیں ورنہ کبھی تو اس کے پھیکے چہرے پر ہلکا سا تبسم دکھائی دے جاتا۔

مہرو کی شادی بخشو سے ہوئی تو وہ بینا تھی۔ گو زیادہ گوری چٹی نہ سہی لیکن قبول شکل سے بھی کچھ بہتر تھی۔ دراز قد، بھرا پرا جسم، دراز زلفیں اور آنکھوں میں اجنبیت اس کو پہلی مرتبہ دیکھنے والے کے لیے پہلا تعارف تھے۔ بخشو قصبے سے کچھ فاصلے پر بھٹے پر اینٹیں تھاپتا تھا۔ چند سو روپے بھی اس سستے زمانے کے لحاظ سے ایک معقول آمدن تھی۔ ایک مرتبہ بخشو

شہر گیا تو وہ مہرو کے لیے امرتیاں لایا۔ مہرو نے جلیبیاں پہلی مرتبہ دیکھی تھیں۔ اس علاقے میں حلوے پر مٹھائی کی دنیا شروع ہوتی ہے اور حلوے پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس نے ان کو کنگن جیسی کوئی چیز سمجھ کر کلائیوں میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن بخشو کے منع کرنے پر اس نے امرتیوں کو پہننے کے بجائے کھانا شروع کیا۔ مہرو نے زندگی میں پہلی مرتبہ بازار کی شے کھائی تھی۔ کتنے ہی دن امرتیوں کی مٹھاس اس کی زبان پر موجود رہی۔ بخشو نے شادی کے بعد اپنے اس گھروندے کے اردگرد چھ فٹ بلند چار دیواری تائم کی تو اس کے دوست احباب سرگوشیاں کرنے لگے کہ دیکھو دیکھو بخشو اپنی حور کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بخشو کی عادت تھی کہ دوپہر کو کام سے لوٹتا تو کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتا۔ ایک دن بخشو کے ہاتھ بھٹے کی آگ میں جھلس گئے۔ مہرو نے اس دن بخشو کو اپنے ہاتھوں سے روٹی کھلائی۔ ان کے گھر میں کھجور کے بان سے بنی دو چارپائیاں تھیں۔ مہرو اس کے آنے سے پہلے اس کی چارپائی پر سرخ رنگ کی چادر بچھا دیتی تاکہ بخشو کے جسم پر کھجور کے بان کی چبھن محسوس نہ ہو۔ ایک روز مہرو چادر بچھانا بھول گئی۔ اس دن بخشو کو بھٹے کے مالک نے کسی بات پر گالیاں دی تھیں۔ بخشو غصے میں تلملا رہا تھا۔ چارپائی کو چادر کے بغیر دیکھ کر اس نے جانے کیسے مہرو کو کہہ دیا کہ کیا اندھی ہو گئی ہو یا تمہارا دماغ کہیں اور ہوتا ہے؟ مہرو نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ لیکن اس کے بعد چادر کا بچھانا اس کے لیے ایسے ہو گیا تھا جیسے سانس کا لینا۔ پھر ایک دن بخشو نے جب اس کو یہ بتایا کہ بہتر روزگار کے لیے کل میں شہر جا رہا ہوں تو بھی مہرو خاموش رہی۔ لیکن اپنی کم گوئی کے باوجود آنکھوں کو نم ہونے سے نہ بچا سکی۔ بخشو کے جانے کے بعد مکان کی خاموشی دبیز ہو گئی۔

بخشو دراز قد خوبصورت نوجوان تھا۔ لاہور شہر میں باٹا فیکٹری میں ملازمت ڈھونڈنے میں اس کو دیر نہ لگی۔ محنت کے بل بوتے پر بہت جلد افسران کا اعتماد حاصل کر لیا۔ ہر ماہ پہلے ہفتے وہ اپنے گاؤں آتا تو مہرو کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آتا۔ فیکٹری کے اسسٹنٹ منیجر نے اس کو گھر میں رہائش فراہم کی تو بخشو کی بچت بڑھ گئی۔ بخشو نے ڈرائیونگ بھی سیکھ لی اور اب وہ سہیل صاحب کے بچوں کو اسکول لانے اور لے جانے کا کام بھی کرنے لگا۔

مہینا کی پہلی تاریخ سے مہرو کے کان بخشو کی چاپ کا انتظار شروع کر دیتے۔ بخشو چکر لگا جاتا تو باقی دن اچھے گزر جاتے کیونکہ اس کو انتظار کی کوفت سے تو نجات مل جاتی۔ اس چین اور بے چینی کے امتزاج نے مہرو کی صحت پر برا اثر ڈالا اور وہ کمزور ہونا شروع ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ بخشو کے قصبے آنے کے وقفے بڑھتے گئے۔ مہرو کمزور ہوتی گئی۔ پھر اچانک کسی دن جب بخشو آجاتا تو مہرو کے اس خزاں رسیدہ چمن میں چپکے سے بہار آ جاتی اور کئی مہینوں کے بیمار جسم کو قرار سا آ جاتا۔

بخشو کا آنا گو اب ایک تکلف بنتا جا رہا تھا لیکن مہرو ان تکلفات سے بہت دور زندگی گزار رہی تھی۔

مریم اپنے والدین کی حادثاتی موت کے بعد اپنے چچا سہیل کے پاس رہائش پذیر تھی۔ مریم کا والد ورثے میں بیٹی کے لیے کافی کچھ چھوڑ گیا تھا جس میں ضلع قصور میں ایک وسیع و عریض زرعی فارم بھی تھا۔ مریم اکثر اپنی سیاہ رنگ کی گاڑی پر بخشو کے ساتھ اس فارم پر جایا کرتی۔ مریم ایک پڑھی لکھی اور تصوراتی دنیا میں زندگی گزارنے والی لڑکی تھی۔ رومانویت کی ساری خصوصیات مریم میں موجود تھیں۔ لیکن دیہی اور ویران علاقوں کی زندگی نے تو اس کو مغلوب کر رکھا تھا۔ رومینٹک ہونے کے باوجود شیلے اور بائرن اس کو پسند نہ تھے۔ وہ اکثر والٹر سکاٹ اور ورڈزورتھ کی کتابوں میں گم رہتی۔ بخشو کو جب وہ خدا بخش کہتی تو بخشو کو یوں لگتا کہ وہ کسی اور سے مخاطب ہے۔ مریم اب بخشو کو صرف ڈرائیور نہیں سمجھتی تھی بلکہ انتہائی عزت اور احترام سے برتاؤ کرتی۔ یہ سب کچھ ان سے منسلک لوگ بھی محسوس کر رہے تھے۔

ایک روز جب مریم نے چچا کو یہ خبر دی کہ میں نے خدا بخش کو اپنا جیون ساتھی چن لیا ہے تو سہیل صاحب کو کوئی حیرت نہ ہوئی۔ پچھلے چند روز سے ان کے تال میل کو وہ بصیرت کی نگاہوں سے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور آج ان کا اندازہ سو فیصد ٹھیک ثابت ہوا تھا۔

مریم کی شادی کی خبر ملک خدا بخش نے سرسری طور پر اولاد نہ ہونے کا بہانہ کرتے ہوئے مہرو کو دی تو مہرو نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہ کیا۔ اس نے صرف ایک گزارش کی کہ مجھے اپنے اس گھر سے نہ نکالنا اور مہرو کو اپنے نام سے جدا نہ کرنا۔ خدا تجھے خوش رکھے، میں اپنی زندگی گزار لوں گی۔ ملک خدا بخش کو آج پہلی مرتبہ مہرو پر دل سے پیار آیا۔

مہرو کا گاؤں ویسے کا ویسا ہی ہے۔ اس کا مکان بھی جوں کا توں ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ اس میں گراوٹ کی گنجائش نہیں تھی۔ صرف یہی کچھ ہوا کہ اس کے کھیروں کے ارد گرد کچی دیوار گر گئی اور گاؤں کے مریل لوگوں نے مردوں کو گورستان لے جانے کے لیے اس کے صحن کو رستہ بنا لیا۔

یہاں کی زندگی ابھی بھی ٹھہری ٹھہری سی ہے۔ نہ پرندوں کے گیت، نہ جانوروں کی آوازیں، نہ بچوں کا رونا، نہ جوانوں کے قہقہے۔ ہر طرف ہُو کا عالم ہے۔ مہرو کب کی بڑھاپے کی سلطنت میں داخل ہو چکی ہے۔ پتھریلی آنکھیں، کھچڑی بال، سوکھا جسم لیکن سانس پھر بھی رواں دواں ہے۔ غربی سمت میں بوڑھے درختوں میں آج جانے کہاں سے طوطوں کا جوڑا اڑ کر آ گیا ہے اور ٹیں ٹیں کر کے اس علاقے کی اداس خوبصورتی کو خراب کر رہا ہے۔ تو میر شروع ہو چکا ہے۔ سرد ہوائیں چلنا شروع ہو چکی ہیں۔ تتر بتر سوکھے پتوں نے مہرو کے آنگن میں رقص شروع کر دیا ہے۔ مہرو اپنے صندوق کے ساتھ کونے میں زمین پر اکڑوں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس صندوق کی چابی پچھلے سال کہیں گم ہو گئی تھی۔ نظر نہ ہونے کے باوجود اس نے کئی دن کمروں اور صحن میں ٹٹول ٹٹول کر چابی ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن چابی کو ملنا تھا نہ ملی۔ اس دنیا میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو مہرو کے صندوق کی نئی چابی بنوا دیتا۔ صندوق کی چند چیزیں

دراصل میں یادوں کا خزانہ تھیں اس کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ مہرو کی بے نور آنکھوں کو دیکھ کر کبھی ڈر لگتا ہے تو کبھی ہنسی آتی ہے۔ کبھی حیرت تو کبھی افسوس۔ بصارت ہی اس کی کل کائنات تھی۔ وہ بھی نہ رہی۔ طوطی اور طوطے کی اٹھکیلیاں مہرو کو غمگین کر رہی ہیں۔ اگر اس کی آنکھیں ہوتیں تو وہ کب کا پتھر مار مار کر ان پرندوں کو اڑا چکی ہوتی۔

اچانک دور سے کسی موٹر کے آنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مہرو کے دل میں طوطوں کے ملاپ کا دکھ اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ بھاں بھاں کرتی ایک بھاری بھرکم گاڑی مہرو کے آنگن میں آ رکتی ہے۔ ہلکے گرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس کالی عینک لگائے ملک خدا بخش اپنی میم مریم اور دو بیٹوں کے ساتھ گاڑی سے نیچے اترتا ہے۔ گاڑی کے چار دروازوں کے ٹھاہ ٹھاہ ٹھاہ کی چار آوازیں اس پرسکون خاموشی کے خاتمے کے لیے کافی ہیں۔ ننھا مبشر امی کا بازو پکڑ کر چیخ کر کہتا ہے امی امی وہ دیکھو بکس کے ساتھ کمرے میں ایک چڑیل بیٹھی ہوئی ہے۔ دوسرا بھائی احسن بھائی کی درستی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ چڑیل نہیں بلکہ کوئی بھکارن ہے۔ ملک خدا بخش کو ننھے فرشتوں کی معصوم بولیاں سن کر ہنسی آ جاتی ہے۔ وہ چاروں مونجھ داڑو کے کھنڈرات سے خوب محظوظ ہو رہے ہیں۔ مہرو بخشو کی آواز پہچان چکی ہے۔ مہرو کی زبان جلیبیوں کی مٹھاس سے لپڑ گئی ہے۔ مہرو کو اپنی کالی کالی سوکھی کلائیوں پر سرخ سرخ موٹی موٹی رسیلی جلیبیاں لپٹی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ مہرو چشم تصور میں بخشو کے مونہہ میں مکئی کی روٹی کے چھوٹے چھوٹے نوالے ساگ اور مکھن میں ڈبو ڈبو کر ڈال رہی ہے۔ مہرو سوچوں میں گم چڑیل، فقیرنی اور منگتی بنے صندوق کے پاس کونے میں لپٹی بیٹھی ہے۔ اس چڑیل، فقیرنی اور منگتی کو کچھ مانگنا ہے۔ لیکن یہ اندھی بڑھیا آج گونگی بھی ہو چکی ہے۔

ملک خدا بخش اپنے بچوں کو مونجھ داڑو کی سیر کراتے کراتے دوسرے کمرے میں لے آتا ہے۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ جاتا ہے۔ دائیں طرف دیوار کے ساتھ بان کی دو چارپائیاں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی پڑی ہیں۔ ایک چارپائی پر سرخ رنگ کی چادر بغیر سلوٹوں کے بچھی پڑی ہے۔ یہ سرخ رنگ اس گھر کا واحد رنگ ہے اور اس کے علاوہ ہر طرف بے رنگ اور پھیکی دنیا آباد ہے۔ مریم اس پُرسکون رومانوی ماحول سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ اس خاموش پرستانی ماحول میں وہ معروف انگریز جوانمرگ شاعر John Keats کی شہرۂ آفاق نظم Ode to Autumn کے اشعار گنگنانا شروع کر دیتی ہے۔ وہ اپنے پرس سے چند سرخ رنگ کے نوٹ نکال کر اندھی فقیرنی کے ہاتھ میں دے کر اپنے بچوں اور سہاگ کی سلامتی کا صدقہ اتارتی ہے۔

تھوڑی دیر میں یہ چھوٹا سا قافلہ اپنی آرام دہ گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کی راہ لیتا ہے۔ فقیرنی ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ بے نور آنکھوں سے بخشو کو الوداع کہہ کر اپنے عروسی کمرے میں آ کر سرخ چادر کو لپیٹ لیتی ہے۔ دوپہر کے بعد چادر کا چارپائی پر پڑا رہنا اسے اچھا نہیں لگتا۔ طوطی اور طوطا مہرو کے کھیرے کی منڈیر پر آ بیٹھے ہیں۔ ان کی ٹیں ٹیں نے اس پرسکون اور خاموش مکان کو پھر سے ایک گھر بنا دیا ہے۔

■■■

پانی پر مہر

حبیب اشرف صبوحی

کہا جاتا ہے کہ انسان کے دانہ پانی پر مہر ہوتی ہے۔ جہاں اس کا رزق ہوتا ہے وہاں خود پہنچ جاتا ہے اور جس سرزمین پر اس کی موت کا وقت لکھا ہوتا ہے وہ خود وہاں پہنچ جاتا ہے۔ یہ فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ دانہ پانی کے سلسلہ میں ایک واقعہ ضبط تحریر میں لا رہا ہوں۔

اپنی ملازمت کے سلسلہ میں کچھ عرصے کے لیے میری تعیناتی گوجرانوالہ میں ہوگئی جبکہ میں لاہور میں مقیم تھا۔ ہم 5/6 لوگ صبح مقررہ جگہ پر اکٹھے ہو جاتے اور وہاں سے گاڑی پر لاہور سے گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہوتے اور واپسی پر وہی گاڑی گوجرانوالہ سے لاہور لاتی۔

ایک روز سخت گرمی تھی۔ گوجرانوالہ سے چلتے وقت میں نے منرل واٹر کی ایک بڑی بوتل اور 2/3 گلاس لے لیے تاکہ راستہ میں کسی کو پیاس لگے تو پانی پی لے۔ اتفاق سے راستہ میں کسی نے پانی نہیں پیا۔

جب ہم لاہور کے راوی پل پر پہنچے تو میں نے سوچا کہ پانی کسی نے نہیں پیا اور یہ بوتل بیکار جائے گی۔

جب گاڑی راوی کے پُل کے درمیان پہنچی تو ٹریفک کی وجہ سے بلاک ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ کوئی جلوس نکلا ہوا ہے جس کی وجہ سے ٹریفک رُکی ہوئی ہے۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک بہت بوڑھا آدمی اپنے بیٹے کے ساتھ پُل پر پیدل چل رہا ہے۔ جب وہ ہماری گاڑی کے قریب آیا تو گرمی کی وجہ سے سڑک پر گر گیا اور بے ہوش ہوگیا۔ اس کا بیٹا لوگوں سے پانی مانگ رہا تھا۔ ہم نے اسے پانی دیا اور اس کے بوڑھے والد کو سڑک سے اُٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹایا اور پانی کے چھینٹے اُس کے منہ پر مارے۔ کچھ دیر بعد اُس نے آنکھ کھولی اور اپنی کمزور آواز میں پانی کا مطالبہ کیا۔ ہم نے اُسے پانی پلایا۔ پانی پینے سے اس بوڑھے آدمی کی توانائی بحال ہوگئی۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُس میں کسی نے تازہ روح پھونک دی ہے۔

آدھی سے زیادہ بوتل اُس نے پی لی اور پوری طرح اپنے حواس میں آکر ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اتنے میں ٹریفک بھی کھل گئی۔ ہم نے اُس کو اور اُس کے بیٹے کو اُن کی منزل مقصود پر پہنچا دیا۔ میں یہ سوچتا رہا کہ یہ پانی گوجرانوالہ سے چلا۔ اس کو کسی نے نہیں پیا۔ اس پر اس بوڑھے آدمی کی مُہر تھی۔ اس لیے اس کے کام آگیا۔

اروڑ کا مست

ایک مست کا قصہ جو ہوش مندوں کو سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیتا تھا

امر جلیل کی سندھی کہانی

ترجمہ: سراج چنا

میں اللہ بخش مست کی زیارت کرنے اروڑ آیا تھا۔ قدیم مسجد کے پاس گھوڑے سے اترا۔ روہڑی سے اروڑ تک بغیر رکے سفر کیا تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا، لیکن کپتان کو ہوا میں اڑاتا آیا تھا۔ گھوڑا ہانپ رہا تھا اس کے کھر پسینے اور مٹی میں اٹ گئے تھے۔ اسے ببول کے درخت کے ساتھ باندھ کر شاباش دی۔ وہ میرا پرانا ساتھی ہے، اسے بے حد چاہتا ہوں۔ ہر مصیبت اور مشکل میں وفا دار رہا ہے۔ میں اسے کپتان کہتا ہوں۔

میرا پیروں اور فقیروں پر اعتقاد نہیں۔ میں رہزن ہوں، خونی ہوں۔ مجھے اپنے یونانی خنجر اور رائفل پر اعتبار ہے، اپنی قوت پر میرا اعتماد ہے۔ جسے چاہوں، جب چاہوں قتل کر دیتا ہوں۔ جان بخشی صرف ان کی کرتا ہوں جو قرآن اٹھا کر امان مانگتے ہیں۔ ایسوں کو صرف لوٹتا ہوں اس قدر کہ جسم کے کپڑے بھی

اتروالیتا ہوں۔ لیکن میرا جگری یار عارف ماچھی قرآن کو بھی نہیں مانتا، کسی کو منت سماجت کرتے دیکھ کر ایک پل ضائع کیے بغیر ختم کر دیتا ہے، لیکن ایک رات عارف ماچھی گم ہو گیا۔

اللہ بخش مست کے معجزات کے قصے سن کر، فیصلہ کر کے آیا تھا کہ اگر مست سے عارف ماچھی کا پتا نہ چلا تو رائفل کی ساری گولیاں مست کے سینے میں اتار دوں گا۔

منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول کر پسینہ صاف کیا، اِدھر اُدھر دیکھا کوئی بھی انسان دور دور تک دکھائی نہ دیا۔ رائفل کو مضبوطی سے تھام کر، ٹوٹی دیواروں، تباہ شدہ بنیادوں اور اِدھر اُدھر بکھری ہوئی لال اینٹوں پر قدم رکھتا ہوا اروڑ کے کھنڈروں میں جا پہنچا۔ پیچھے قدیم قبرستان کی قبریں تھیں اور سامنے پہاڑوں کی خوف ناک ڈھلانیں۔ اچانک خاموشی میں اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ کچھ پتھر پہاڑ کی ڈھلانوں سے گرتے، قلابازیاں کھاتے نیچے جا گرے۔ میں نے کمر کے ساتھ بندھے ہوئے خنجر کے دستے پر ہاتھ رکھ کر بجلی کی سی تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا ''کون ہو؟''

وہ پیچھے ہٹ گیا۔ دبلا پتلا کمزور سا آدمی تھا۔ کالی چادر اور اجرک سے میرا منہ چھپا ہونے کی وجہ سے اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''تم کون ہو؟''

'مسافر ہوں۔''

''خوش آمدید بھائی!'' اس نے اپنا کمزور ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہاتھ ملایا اور اسے بتایا کہ ''میں اللہ بخش کی زیارت کرنے آیا ہوں۔''

''خوش آمدید بھائی! ہمارے سر آنکھوں پر۔''

''پتا بتاؤ گے؟''

''میں خود سائیں کو سلام کرنے جا رہا ہوں، ساتھ ہی چلتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا، چلتے چلتے میں نے اس سے پوچھا ''آپ اروڑ کے ہو کیا؟''

''ہاں، میں پلا بڑھا بھی یہیں ہوں۔'' اس کے پاؤ کھنڈروں میں جم جم کے پڑ رہے تھے اور قدم بھی وہ بڑے بڑے اٹھا رہا تھا۔ ایک قدم مجھ سے آگے چل رہا تھا۔ چلتے چلتے اس نے پوچھا ''تم کون ہو؟''

''جی!'' میں گھبرایا۔

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''ہاں، تم کون ہو؟''

''میں مچھیرا ہوں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''ہماری آنکھوں پر بھائی جی! آئیے۔''

وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتا آگے بڑھتا رہا۔ اس نے پوچھا ''پہلی دفعہ آئے ہو؟''

''ہاں۔''

''مجاہد والی مسجد کے پاس تمھارا گھوڑا بندھا ہے؟''

''مجاہد! کون سا مجاہد؟''

''محمد بن قاسم۔''

''ہاں، میرا گھوڑا ہے۔''

ہم لال اینٹوں پر پیر رکھتے ہوئے قلعے کے کھنڈروں سے ہوتے ہوئے ایک سالم مسجد کے قریب آ پہنچے تو اس نے بتایا۔ ''یہ مسجد بھی مجاہد کی تعمیر کردہ ہے۔''

'یہ تو بہتر حالت میں ہے!''

''اللہ کی رحمت ہے۔''

''اور اس پرانی مسجد پر؟'' میرے سوال پر مڑ کے اس نے میری طرف دیکھا اور کڑک دار آواز میں پوچھا ''تو مسلمان ہے؟''

''پکا۔'' میں نے کہا۔

مسجد کے پیچھے پہاڑی پچرا اترتے وقت اس نے کہا ''اس زمین سے مجاہد نے کفر کا خاتمہ کیا۔''

میں چلتے چلتے رک گیا، چار سو نظر گھما کر دیکھا تو ہر طرف کھنڈر ہی کھنڈر نظر آئے۔ ویرانی تھی۔ میں نے کہا ''اس زمین پر باقی کچھ بھی نہیں بچا۔''

اسے میری بات اچھی نہ لگی، وہ باقی پچرا دوڑتا ہوا اتر گیا۔ پہاڑ کے نیچے اتر کر اس نے اپنی شلوار جھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، جیسے وہ میرے محتاط انداز سے اترنے پر ہنس رہا ہو۔ میں بھی بالآخر پہاڑ سے اتر گیا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس نے اپنی پتلی کمر پر ہاتھ رکھے اور ایک جگہ کھڑے ہو کر کہا ''اس میدان میں سلائج کے بیٹے چچ نے دھوکے سے بادشاہ مہیرت کو قتل کر دیا تھا۔''

میں چچ اور مہیرت کے ناموں سے متاثر نہ ہوا، دونوں میرے لیے اجنبی تھے، لیکن میں نے دونوں کے درمیان دھوکے کی دیوار دیکھ لی تھی۔ صدیوں سے چلتی ہوائیں بھی فریب کو چھپا نہ سکی تھیں۔

میں نے خنجر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''یہ زمین دھوکے اور فریب کو جنم دیتی رہی ہے کیا؟''

قمیص کے نیچے، کمر کے ساتھ بندھے ہوئے خنجر کو وہ نہ دیکھ سکا، لیکن میرے جمیل کی چبھن اس نے محسوس کر لی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت ابھر آئی۔ مجھ سے کمزور اور ڈرا نہ ہوتا تو ضرور مجھے طمانچہ رسید کر دیتا۔

''گالیاں برداشت کرو گے۔'' اس نے اچانک عجیب سا سوال کیا۔

''میں سندھی ہوں۔''

''مست کی گالیاں۔'' اس نے وضاحت کی۔

''اوہ! ہاں اپنی مراد پانے کے لیے مست کی گالیاں برداشت کر لوں گا۔''

میں اللہ بخش مست کے بارے میں بہت کچھ سن کے آیا تھا۔ میں نے سنا تھا، وہ عرض داروں کو فحش اور ننگی گالیاں دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان پر گندا کچرا بھی پھینکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے اس کی کرامتوں کے قصے بھی سنے تھے۔ وہ جوان عورتوں کے جن نکالتا تھا، بے اولاد، اولاد اور نامراد، مراد پاتے تھے۔ اس کے فیض سے بچھڑے ہوؤں نے وصال اور پیاسوں نے پانی پایا تھا۔ مجھے اپنے بچھڑے دوست کی تلاش تھی۔ عارف ماچھی میرا جگری یار تھا۔ مذاق ہی مذاق میں مَیں اسے کھو بیٹھا۔ ایک رات میں نے اسے بھنگ میں جمال گھوٹا ملا کے پلا دیا تھا، اسی رات وہ اپنی قمیص کا گریبان چاک کر کے اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔ میں نے سندھ کا کونا کونا چھان مارا، لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ جب میں ہر طرف سے مایوس ہو چکا تو ایک نیک بندے سے اللہ بخش مست کے معجزات کے قصے سنے، میں بھی اپنے من کی مراد پانے اروڑ آ گیا تھا۔

''اروڑ مدرسۂ عارفی کی وجہ سے مشہور ہے، طلبہ یہاں مفت مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔'' اس اجنبی نے کھنڈروں سے گزرتے وقت بتایا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اس پہاڑ کے پیچھے درگاہِ عارفی ہے اور اس درگاہ کے سامنے مائی کالکاں کا غار اور مندر ہے۔''

میں نے کوئی دلچسپی نہ لی، میری سوچ کا مرکز تو اللہ بخش مست تھا۔

اس نے کہا ''کالکاں کی مورتی اور مندر کے بت مدرسۂ عارفی کے طلبہ نے توڑ دیے ہیں۔''

میں اجنبی کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا، کیونکہ میں اللہ بخش مست کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس نے ٹوپی اتار کے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

میں نے پوچھا ''تم کون ہو؟''

''عارفی۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا کام کرتے ہو؟''

''اروڑ میں سندھی ماسٹر ہوں۔''

''تو عالم ہو!''

اس کی چھوٹی آنکھوں میں چمک ابھر آئی، خوش ہوتے ہوئے بولا ''کیسی باتیں کرتے ہو بھائی! اس زمانے میں عالم کی قدر کہاں ہے۔''

''سچ کہتے ہو جناب۔'' میں نے کہا۔

سفید مینار کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا ''شاہ شکر گنج کا مینار دیکھ رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''اور زمین کا یہ حصہ بھی شاہ شکر گنج کا ہے۔''

میں نے پوچھا ''اللہ بخش مست کی درگاہ ابھی دور ہے کیا؟''

''کیوں؟ تھک گئے ہو؟''

''نہیں۔''

''سامنے فصیل دیکھ رہے ہو، اس کے پیچھے اللہ بخش مست کی درگاہ ہے۔'' اس نے بتایا کہ فصیل پر چڑھ کر راجا داہر کے سپاہی پہرا دیتے تھے۔

ہم جہاں سے گزر رہے تھے، وہ زمین پتھریلی تھی۔ کسی وقت میں پانی کے مسلسل بہاؤ کی وجہ سے پتھر چکنے ہو گئے تھے۔ قریب ہی اناروں کے درخت تھے۔ یقین کرنے کے لیے میں نے پوچھا ''یہ انار کے درخت ہیں نا؟''

''ہاں، یہ انار کے درخت ہیں۔'' اور اشارہ کرتے ہوئے بولا ''سامنے دودھ کا کنواں ہے۔''

''دودھ کا کنواں!''

''ہاں، آؤ دکھاؤں۔'' ہم کنویں کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے وہ سوکھا ہوا تھا اور اس میں پتھر پڑے تھے۔

اس نے کہا ''یہ دودھ کا کنواں اور انار کے درخت شاہ شکر گنج کے ہیں۔''

''اس میں تو پتھر پڑے ہیں جناب!''

''ہاں لیکن پرانے زمانے میں، اس کنویں میں دودھ اور ان درختوں میں انار ہوتے تھے۔'' ہم کنویں سے ہٹے اس نے اپنی بات جاری رکھی ''شاہ کی وفات کے بعد اس کے لالچی زائرین نے دودھ اور انار بیچنے شروع کر دیے۔ ایک دن کنواں سوکھ گیا اور درختوں نے پھل دینے چھوڑ دیے۔ اب درختوں میں پھول ہوتے ہیں لیکن انار نہیں۔''

درخت لال پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ میں نے مینار کی طرف دیکھا۔ وہ بولتا رہا۔ شاہ شکر گنج کے مقبرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا ''مقبرے کے پیچھے سفید پتھر کے چکنے میدان ہیں، چودھویں کی رات وہاں زبردست جوا کھیلا جاتا ہے۔ سکھر، روہڑی، شکارپور اور جیکب آباد کے بڑے بڑے سیٹھ، زمیندار اور افسر جوا کھیلنے آتے ہیں۔''

میں نے کہا ''اس چودھویں کو میں اپنے دوستوں

کے ساتھ آؤں گا اور جواریوں کی ساری دولت لوٹ کے لے جاؤں گا۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو بھائی! یہاں بڑے بڑے جواری آتے ہیں۔ لاکھوں کا جوا کھیلا جاتا ہے۔ ہم غریبوں کے بس کی بات نہیں ہے۔''

میں نے رائفل بائیں کندھے سے اتار کر دائیں میں مضبوط کرتے ہوئے کہا ''جس رات میں آؤں گا، اس رات یہاں کے سب جواری اپنی جھولیاں میرے سامنے خالی کر دیں گے۔'' دبلے پتلے ماسٹر کو میری بات پر ہنسی آ گئی۔ میں نے پوچھا ''پولیس بھی آتی ہے؟''

''ہاں، ایک دو تھانے دار اور چند سپاہی آتے ہیں لیکن کسی سے کچھ نہیں کہتے۔''

''جس رات میں آؤں گا، اس رات سندھیوں اور عربوں کی روحیں چیخ اٹھیں گی۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو اروڑ کرامتوں کا شہر ہے۔'' ''شہر یا کھنڈر؟''

اسے غصہ آ گیا۔ ''کرامتوں پر اعتبار نہیں ہے تو پھر مست کی زیارت پر کیوں آئے ہو؟'' اس نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے کہا ''میں سندھی ہوں، سندھیوں کا بچہ بچہ پیروں، فقیروں اور مرشدوں کے آگے گردن جھکاتا ہے۔''

ہم فصیل کے قریب آ گئے، فصیل کے پیچھے اللہ بخش مست کی درگاہ تھی۔ درگاہ کے سامنے ایک تنگ راستہ تھا، جہاں پر لوگوں کا بہت بڑا ہجوم کھڑا تھا۔ میں غلط راستے سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پختہ راستہ بھی تھا جو گھومتا جاتا تھا۔

ماسٹر نے مجھ سے کہا ''یہاں کسی کی نہیں چلتی، جو طاقتور وہی آگے بڑھے۔''

ماسٹر مجھ سے ہاتھ ملا کے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ ہجوم میں مرد کم اور عورتیں لاتعداد تھیں، گاؤں کی معصوم، بھولی بھالی، شہر کی گوری عورتیں بھی تھیں۔ چالاک، چست اور ہوشیار۔

میں ہجوم کو چیرتا، دھکے کھاتا بالآخر مست کی کوٹھی کے قریب جا پہنچا۔ اس وقت وہ کوٹھی میں کسی عورت کا جن نکال رہا تھا۔ اندر سے ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ وہاں موجود لوگ کہہ رہے تھے ''عورت کا جن سائیں سے جھگڑا کر رہا ہے۔''

کوٹھی کا دروازہ کھلا ایک دوشیزہ بال درست کرتی باہر نکلی۔ کچھ دیر بعد اللہ بخش مست باہر آیا۔ ایک جانگیے کے سوا اس کے بدن پر کچھ نہیں تھا۔ مٹی سے اٹا بدن، گھنی داڑھی اور آنکھیں لال تھیں۔ باہر آ کر بیٹھ گیا۔ میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے جا بیٹھا۔ اس نے ابتدا ہی میں تین چار گالیاں دے دیں، میں نے برداشت کیا۔

اللہ بخش مست نے گھور کے میری آنکھوں میں دیکھا، کچھ دیر تک دیکھتا رہا، آنکھیں گویا لال لہو۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے جھٹکے سے میری چادر اتار دی۔ میں اب بھی خاموش رہا۔ منہ پر بندھے ہوئے کپڑے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے کہا ''مست بابا، میری عزت رکھنا۔''

اس نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، اٹھ کھڑا ہوا اور کہا ''اندر آ!'' میں اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا، بولا ''کیوں آیا ہے؟''

''اپنے دوست کی تلاش میں آیا ہوں۔'' میں نے ادب سے کہا ''میں نے سندھ کا چپہ چپہ چھان مارا ہے،

لیکن کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔"

اس نے لال آنکھوں سے گھور کے میری طرف دیکھا۔ آنکھیں آنکھوں سے ملاتے ہوئے بولا "تُو عبدالرحمان ڈاکو ہے نا۔"

میں خوف سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا..... اس کی کرامت کا معجزہ دیکھ کر اعتقاد سے میرا دل بھر آیا۔

اس نے کہا "اور تُو اپنے دوست عارف ماچھی کی تلاش میں ہے۔" اللہ بخش مست کے متعلق جو کچھ سنا تھا وہ آنکھوں سے دیکھ لیا۔ پورا سندھ پیروں فقیروں سے بھرا ہوا لیکن سائیں اللہ بخش جیسا ڈھونڈے بھی نہ ملتا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس کا ایک ایک لفظ درست تھا۔

"تُو سکھر والی پرانی درگاہ کے گدی نشیں میاں سکل پتھارے دار کا آدمی ہے۔"

"بس سائیں، بس!" میں اس کے پیروں میں بیٹھ گیا، میں نے کہا "اب پتا بتاؤ کہ عارف ماچھی کہاں ہے؟"

سائیں اللہ بخش نے مجھے کندھے سے پکڑ کے کھڑا کیا۔ مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھنے کے بعد وہ میرے پیچھے آ کے کھڑا ہو گیا اور اچانک زور دار آواز میں بولا "عارف ماچھی مر گیا ہے، تُو بھی سورج غروب ہونے سے پہلے اروڑ سے نکل جا۔"

اس نے کوٹھی کا دروازہ کھولا اور مجھے دھکا دے کے باہر نکال دیا۔ میں گردن جھکا کر پانی کے مٹکوں کے پاس بیٹھ گیا۔

میں سندھ کا بدنام ڈاکو عبدالرحمٰن ہوں۔ میں، عارف ماچھی اور دوسرے سرکش ڈاکو سکھر والی پرانی درگاہ کے گدی نشیں میاں سکل کے سائے میں رہتے ہیں۔ بڑے بڑے خونی اور نامور ڈاکو اس کے پاس سکھ اور سلامتی کی زندگی گزارتے ہیں۔ بہت پہنچے والا بندہ ہے۔ کسی میں ہمت ہی نہیں کہ اس کے بندوں کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھے۔ اس کے سائے میں ایسے ایسے ڈاکو رہتے ہیں جن کا نام سن کر اردگرد کے شہر اور گاؤں کانپ اٹھتے ہیں۔

عارف ماچھی جیسے ڈاکو کے گم ہونے کی خبر سن کے لوگوں نے خوشیاں منائی تھیں اور میں کچھ عرصے بعد عارف ماچھی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔

"کیا تمھارے من کی مراد پوری ہوئی؟" میں نے اوپر دیکھا سامنے وہی ماسٹر کھڑا تھا۔ "نہیں۔"

"ایسے نہیں ہو سکتا اس مست نے پتھر سے پانی نکالا ہے۔"

"تمھارے لیے نکالا ہوگا۔"

"تمھارا تو کرامتوں اور معجزوں پر اعتبار نہیں ہے۔"

"کورا اعتبار کیسے کروں؟"

"تمھیں کیا کہا مست نے؟"

"اس نے کہا، تیرا دوست مر گیا ہے۔"

"تو مر گیا ہوگا۔"

"کیسے مر گیا ہوگا؟" میں نے کہا "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میرا یار زندہ ہے۔"

"تم غلطی پر ہو دوست، مست کی بات پتھر پر لکیر کی طرح ہے۔"

میں نے غصے میں کہا "میں تمھیں اور اور تمھارے مست کو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔"

"کفر بک رہے ہو، تمھاری بندوق کو فقیر ایک اشارے سے خاک کر دے گا۔"

"میں خون سے شب قدر مناتا ہوں۔"

"تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"آج تمھارے بھرکی اور میری تلاش کی آخری شام ہے۔" میں نے رائفل ہاتھ میں تھام لی تو دبلا پتلا ماسٹر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا "کیا طاقتور اور خوبصورت نوجوان ہو، کم سے کم اپنی جوانی پر ہی رحم کھاؤ اور واپس لوٹ جاؤ۔"

ایک لمحے کے لیے میں نے ماسٹر کی طرف دیکھا اور اس سے پوچھا "کیا مست بتا سکے گا کہ میرا دوست کہاں دفن ہے؟"

کیوں نہیں۔" اس نے فخر سے کہا۔ "ارے وہ اللہ کا پیارا بندہ ہے، اسے ستر ہزار فرشتے اروڑ میں چھوڑ گئے تھے۔"

"ستر ہزار فرشتے! ہاں۔" ماسٹر نے بتایا "کچھ سال ہوئے کہ اللہ بخش مست اس فصیل کے سامنے بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے کالی قمیص پہنی ہوئی تھی اور قمیص کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ اس کے سینے پر گہرے زخم کا نشان تھا۔

"کالی قمیص، گہرا زخم۔" میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ ماسٹر کو دھکا دے کے میں ہجوم کو چیرتا ہوا اللہ بخش مست کی کوٹھی کے قریب آ گیا۔ اس وقت وہ نذرانہ لینے دو نوجوان عورتوں سمیت کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا۔ میں ایک دم اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ عورتیں خوف سے ایک طرف ہٹ گئیں۔ مست نے گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے مست کو بازو سے پکڑا۔ پورا ہجوم اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی نے ڈنڈے اٹھائے، کسی نے جوتے ہاتھ میں پکڑ لیے اور کئی لوگوں نے کلھاڑیاں اٹھا لیں۔ اللہ بخش مست کو کوٹھی کے اندر دھکا دے کے میں ہجوم کے سامنے رائفل سیدھی کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے انھیں بتایا "میں عبدالرحمٰن ڈاکو ہوں۔"

لوگوں پر جیسے برف گر گئی، جو ایک دم آگے بڑھ کے آئے تھے، ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ کسی نے کہا "اسے چھوڑ دو، مست خود سیدھا کر دے گا۔"

اندر جا کے میں نے کوٹھی کا دروازہ بند کر دیا۔ مست کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے خنجر نکال کے اس کے سینے پر رکھا۔

میں نے کہا "تُو جھوٹا ہے، فریبی ہے۔" اس نے جواب میں گالیاں دینی شروع کر دیں۔

میں نے اسے گردن سے پکڑتے ہوئے کہا "تُو عارف ماچھی ہے۔"

اس کی آنکھوں کی آگ ٹھنڈی ہو گئی، ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنی گردن سے ہٹاتے ہوئے کہا "پہلی نظر میں تو نہ پہچان سکا۔"

ہم ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ میں نے کہا "بڑے بہروپیے بن گئے ہو۔"

"بننا پڑا ہے۔"

"واپس نہیں چلو گے؟"

"بیٹھ تو جاؤ۔" ہم دونوں بیٹھ گئے، جو عرصہ الگ گزرا تھا، بیٹھ کے خوب اس کی باتیں کیں۔ باتیں کرنے کے بعد میں نے کہا "عارف! تمھارے بن کلہاڑی پر زنگ لگ گیا ہے۔"

"میرے مرید بنو گے؟" ہنستے ہوئے اس نے کہا۔

"کیوں اپنی چمڑی کے دشمن بنے ہو۔" ہم دونوں ہنس پڑے۔ میں نے کہا "پہلے تم کہتے تھے، ڈاکا زنی کے بغیر میں مر جاؤں گا، اب کیوں کر زندہ ہو؟"

اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ کہا ''ارے بے وقوف! کیا سندھی صرف کلھاڑی اور بندوق سے لُوٹے جاسکتے ہیں۔''

اس نے نیچے بچھی ہوئی چٹائی کا ایک حصہ اوپر اٹھا کر گڑھے میں پڑے ہوئے زیورات اور پیسوں کا ڈھیر دکھایا اور بولا ''کسی دن آکے یہ سب لے جانا۔''

میں نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ''بہت مال جمع کرلیا ہے۔''

اس نے کہا ''سندھ میں کرامتوں والے پیر بن جاؤ یا رہزن، ڈاکو دونوں دھندے ایک جیسے ہیں۔ دونوں میں ایک جیسی کمائی ہے۔''

''کفر بک رہے ہو تم۔''

''میں پیر ہوں، یاد رکھ!'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ڈاکو کے لیے قانون ہے، لیکن خود ساختہ کرامتوں والے پیر کے لیے کوئی قانون نہیں۔''

''تجھ سے بحث کرنا شیطان سے بحث کے برابر ہے۔''

''یہ جملہ سننے کے لیے کان ترس رہے تھے، رحمان! پرانے دن یاد آگئے۔

''چلو گے؟''

''نہیں، ابھی اور بھی مال جمع کرنا ہے۔''

''پکڑے نہ جاؤ۔''

''ماہر ہوگیا ہوں۔ اس ڈاکے کا نہ خوف ہے، نہ خطرہ، سیدھے سادے اور معصوم لوگ ساری جمع پونجی نذرانے کے طور پر دینے آجاتے ہیں۔''

باہر لوگوں میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ باہر سے آوازیں اندر آرہی تھیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس سے پوچھا ''یہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے کیا؟''

''ہاں، جب تک راز، راز رہے گا، میں پیر بنا رہوں گا۔ نہیں تو تم سے آملوں گا۔''

''میں انتظار کروں گا، سائیں اللہ بخش مست۔'' وہ ہنس پڑا، کہا ''سندھ میں پاگلوں کو پیر اور دیوانوں کو پہنچا ہوا کہتے ہیں۔''

''اچھا عارف! چلتا ہوں، خوش ہوں کہ تجھے ڈھونڈ لیا۔''

''ٹھہر جاؤ۔'' وہ میرے سامنے کھڑا ہوگیا اور بولا ''میرا کام خراب کردیا ہے تم نے، اس لیے اب میری ساکھ برقرار رکھنے کے لیے تم سب کے سامنے میرے پیروں پر ہاتھ رکھ کے ایک طرف چلے جانا۔''

ہم ایک دوسرے کے گلے لگ کر وداع ہوئے، میں نے کہا ''تم تو موٹے ہوگئے ہو۔''

''دیسی گھی اور خوب صورت جوانیوں کی مہربانی ہے۔''

عارف ماچھی کوٹھی کا دروازہ کھول کر باہر آ کھڑا ہوا۔ لوگوں کی زبانیں تالوؤں سے لگ گئیں۔ میں باہر آیا۔ عارف کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے پیروں پر ہاتھ رکھے تو لوگوں کا اعتقاد مزید پختہ ہوگیا۔ آواز اٹھی ''واہ وا، اللہ بخش مست! تُو نے عبدالرحمن جیسے ڈاکو کو جھکا لیا۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا، گردن جھکائے آگے نکل گیا۔ کسی نے کہا ''سائیں کی کرامت تو کوئی کوٹھی میں دیکھے۔''

فصیل سے ہوتے ہوئے میں نے اروڑ کے تباہ شدہ قلعے کا رخ کیا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ کھنڈروں اور پہاڑوں پر اندھیرے کی کالی چادر چھا گئی تھی۔

■■■

ادھورا سپنا

نیند کی دہلیز پہ بیٹھے ایک سپنے کا ماجرا اسے ایک ادھورے سپنے نے نگل لیا تھا

عاکف آزاد

نیند کی دہلیز پر کنڈی مار کے بیٹھا ہوا سپنا برسوں پرانا تھا۔ سپنے تو اس نے بہت دیکھے تھے۔ کسی کو چاہنے کا سپنا، کسی کو اپنانے کا سپنا، کسی سے روٹھ جانے کا سپنا، کسی سے مل کر بچھڑ جانے کا سپنا، سپنے ہی سپنے اور ہر سپنے میں کسی اجنبی کا ساتھ۔ ایک ایسا نوجوان دیکھا تھا جو شناسا سا لگتا تھا، اپنا سا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے سارے سپنے اپنی نیند میں محفوظ کر رکھے تھے اور خاص طور سے اجنبی کو تو اس نے بہت اچھی طرح سے چھپا کر رکھا تھا کہ کسی کو بھنک نہ پڑ جائے۔

اسے خوابوں کی لت پڑ گئی تھی، سپنے پہلے تو خود اس کی نیند میں گھس آتے۔ چپکے سے آتے اور کہانی شروع کر چپکے سے پلٹ جاتے۔

پھر اسے چاٹ پڑ گئی اور وہ سپنوں کو پالنے لگی۔ اسے سپنوں کا نشہ چڑھنے لگا۔ شام کا سایہ گہرے ہوتے ہی اسے نیند کے دروازے پہ سپنوں کی دستک سنائی دینے لگتی۔ وہ بے بسی سے کہتی ''تم سرِ شام نہ آیا کرو۔ تمھیں پتا بھی ہے میری ماں سپنوں کی دشمن ہے!''

پل بھر کے لیے دستک خاموش ہو جاتی، پھر اچانک کسی البیلی کہانی کی خوشبو اسے گھیر لیتی اور اسے اپنی پلکوں پہ نیند کا بوجھ محسوس ہوتا اور وہ بے خودسی ہوکر سو جاتی۔

کرن کی ماں سپنوں کی دشمن تھی۔ وہ کرن کو اسی طرح سینت سینت کر رکھنا چاہتی تھی جس طرح کرن اپنے سپنوں کو سینت کر رکھا کرتی تھی۔ کئی مرتبہ ماں کی تیز نظروں نے اسے کہا ''تو کیوں اپنے آپ کو روگی کرتی ہے؟ سپنوں کا کیا بھروسہ یہ تو کانچ کی صورت ہیں۔ ٹوٹ بکھریں تو جڑا نہیں کرتے تو کیوں بے وجہ اپنے آپ کو روگی کرتی ہے؟''

وہ کسمسا جاتی اور سوچتی ''بھلا سپنوں پر بھی پابندی لگائی جاسکتی ہے؟ بھلا سوچوں پر بھی پہرے لگتے ہیں؟ یہ تو بے مہار اونٹ کی طرح ہیں، جس خیال کا جب جی چاہے منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ اب کسی کا کیا بس جوان خیالوں کو روکے۔ میرا بس چلے تو اپنی سوچوں کے گرد باڑھ لگالوں۔''

ایک مرتبہ تو اس نے سچ مچ ماں کی بات مان کر سپنوں کا بوجھ سر سے اتار پھینکا تھا۔ مگر جب وہ اچھی طرح نہا دھوکر، کنگھی کر کے، سرمہ ڈال رہی تھی تو اس نے غور سے شیشے میں دیکھا تو اسے اپنا روپ بہت بھلا لگا۔ وہ دوسری آنکھ کی پتلی اٹھا کر سلائی پھیر رہی تھی کہ اسے خیال آیا کہ وہ اس روپ میں بہت اچھی لگے گی۔

''میں اچھی لگوں گی، لیکن کس کو؟ کیوں؟'' سلائی آنکھ میں پھیر کر باہر نکالی تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے سلائی کی جگہ کوئی نیا خواب بھی آنکھوں میں پھر گیا ہے اور پھر اچانک کئی خواب اس کی آنکھوں میں سجنے لگے۔

''اونہہ! بھلا خوابوں پر بھی پابندی لگتی ہے، بھلا سوچوں پر بھی پہرے لگتے ہیں؟'' اس نے شانے کے ساتھ سلائی کی نمی کو خشک کیا، گویا اس کی ماں یہ نمی دیکھ کر اس کا سپنا پہچان لے گی۔

سپنے سوتے میں روزانہ آیا کرتے تھے۔ وہ ہر رات کوئی نیا سپنا دیکھ لیتی۔ پھر سپنے طویل ہوکر نیند کے پیالے سے چھلکنے لگے۔ ایک خواب کئی راتوں تک چلتا جیسے کوئی ڈراما سیریل قسط وار ٹی وی پر چلتی ہے۔ جاگتے میں، نیند کے پیالے میں سر اٹھا کر جھانکتے ہوئے سپنے کو دیکھ کر وہ بے چین ہو جاتی۔ اس کی سانسیں پھولنے لگتیں اور آنکھیں بوجھل ہو جاتیں۔ پھر ایک دن ماں کی تیکھی نظروں نے اس کا منہ سپنوں سے زبردستی موڑا تو پہلی مرتبہ کسی سپنے نے باہر قدم نکالا۔

نیند کے پیالے سے نکلنے والا پہلا سپنا بڑی خاموشی کے ساتھ آیا تھا جس طرح وہ کبھی سوتے میں آیا کرتا تھا۔ اسے محسوس بھی نہیں ہوا کہ وہ جاگتے میں سپنے دیکھنے لگی ہے اور پھر تو جیسے سپنے نڈر ہوکر، چھن چھن کرتے آنے لگے تھے۔ وہ انھیں سمجھاتی تھک جاتی۔

کہتی! ''تم دن کے اجالے میں نہ آیا کرو۔ ماں کو بھنک پڑ جائے گی تو میری شامت آجائے گی۔''

مگر اب سپنے تنگ کر اسے جواب دیتے ''اونہہ! بھلا سپنوں پر بھی پابندی لگتی ہے؟ بھلا سوچوں پر بھی پہرے لگتے ہیں؟'' مگر پھر بھی وہ ان سب کو سینت سینت کر رکھتی کہ یہ سارے سپنے اس نے خود بُنے تھے۔ وہ انھیں کھونا بھی نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی انھیں ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ بس نیند کی دہلیز پہ بیٹھا وہ تنہا سپنا تھا جو اسے اپنا نہیں لگتا تھا۔ اس نے دیکھا:

''طویل و عریض چار دیواری میں بہت سے باغیچے ہرے بھرے درختوں میں گھرے ہیں۔ اندر رنگ برنگے پھول جابجا پھیلے ہیں، سرخ، سفید، موتیا، گلابی، ہلکے اور تیز رنگ پھولوں کے گچھے بے ترتیبی کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں۔ چار دیواری کی اوٹ سے سورج ابھی نہیں نکلا، مگر روشنی کافی پھیل چکی تھی۔ سفید گلاب کے پودے پر ایک خوش رنگ تتلی سو کر اٹھی تھی۔ اس نے آنکھیں مسل کر انگڑائی لی اور آہستہ سے اڑان بھری۔ اڑتے اڑتے وہ تیسرے باغیچے میں ایک ننھے سے پھول کے پاس آئی جو ابھی نیند کے عالم میں تھا۔ تتلی نے اپنے پر پھڑ پھڑا کر اسے جگایا اور پھر دونوں باتیں کرنے لگے۔

پھول نے کہا ''میری پیاری دوست مجھے زرد رنگ بہت پسند ہے۔''

''ہاں میں جانتی ہوں۔ مجھے بھی بہت بھلا لگتا ہے۔'' تتلی نے جواب دیا۔

''میری پیاری دوست میں یہ رنگ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری مدد کرو گی؟''

''مگر ان دنوں یہ رنگ تو باغ میں ختم ہو چکا ہے؟'' تتلی نے فکرمندی سے کہا۔

''میری دوست مجھے یہ رنگ بہت پسند ہے۔'' یہ کہہ کر گلاب کے ننھے سے پھول کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔

''کہیں سے لا دو میری دوست، میں تمھارا احسان نہیں بھولوں گا۔'' گلاب کے آنسو دیکھ کر تتلی کا دل پسیج گیا۔ وہ بولی ''فکر نہ کرو میرے دوست! میں باغ سے باہر جا کر تلاش کرتی ہوں، شاید کہیں سے مل جائے۔ مگر مجھے یہ اونچی فصیل سر کرنی ہو گی۔ یہ میرے بس میں تو نہیں مگر میں پوری کوشش کروں گی۔ اپنے آنسو پونچھ لو میرے دوست۔''

یہ کہہ کر تتلی اڑی اور فصیل پار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی پرواز فصیل سے بہت پست تھی مگر وہ بار بار کوشش کرتی رہی۔ کئی مرتبہ وہ گری بھی مگر پھر کامیاب ہوگئی۔ قریب ہی ایک کھیت میں اسے زرد رنگ مل گیا۔ اس نے اسے اپنے پروں میں چھپالیا اور واپسی کی راہ لی۔

''مجھے ہمت سے کام لینا ہوگا اور جلد باغ میں پہنچنا ہوگا۔'' تتلی نے اپنے آپ سے کہا اور ایک لمبی اڑان بھر کے بہت دور نکل گئی۔

''اگر ذرا بھی دیر ہوگئی تو پتنگے مجھے دیکھ لیں گے۔ وہ تو ہیں میرے پیارے پروں کے دشمن..... ہائے اللہ میرے پر..... اُف، جیسے جان نکل رہی ہو.....''

تتلی فصیل کے برابر بلند ہونے کے لیے پورا

زور لگا رہی تھی۔ تھکن کی وجہ سے اسے اپنے پروں اور جسم میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ فصیل کے برابر ہوئی اس نے دیکھا پتنگوں کی پوری فوج اس کے چمکتے ہوئے خوبصورت پر نوچنے چلی آ رہی ہے۔ اس کے حواس گم ہو گئے، وہ اور قوت سے اڑی تاکہ جلدی سے باغ کے اندر پہنچ جائے۔ مگر جونہی وہ باغ کے احاطے میں پہنچی ایک پتنگے نے اس کے دائیں پر پہ وار کر دیا۔ اس کا پر ٹوٹ گیا اور وہ نیچے گرتی چلی گئی۔

''کرن! او کرن! اٹھ بھی جا۔ اتنی دیر ہو گئی۔'' اس کی ماں نے اسے زبردستی جگا دیا اور خواب کا دھاگہ ٹوٹ گیا۔

اس نے سوتے جاگتے بہت مرتبہ کوشش کی کہ اس کے ادھورے سپنے میں گرہ لگ جائے مگر نہ لگی۔ زبردستی گرہ لگائی بھی تو بس اتنی کہ تتلی رنگ لے کر لوٹی تو ایک پتنگے نے حملہ کر کے اس کا پر توڑ دیا۔ وہ نیچے گر گئی..... اس کی سانسیں پھول رہی تھیں۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ پتنگے اس کے نزدیک آتے جا رہے تھے۔ بہت نزدیک، خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔'' اور بس۔ آگے بس نہ چلا۔ اس نے اپنے سارے سپنے یونہی گرہیں لگا لگا کر مکمل کر لئے تھے۔ بس یہی ایک ادھورا سپنا تھا۔ کبھی وہ سوچتی کہ اسے مکمل کرنا اتنا ضروری نہ تھا کہ یہ تو پرایا سپنا تھا، کسی اور کا۔ اپنے تو وہ تھے جس میں اجنبی بھی تھا اور ہم عمر بھی، پہلی ملاقات میں ہی اس نے ایسا سحر اس کے کان میں پھونکا کہ وہ اپنا سب کچھ اسے سونپ کر خود ایک طرف ہو گئی تھی۔

سپنوں میں اجنبی کے خاکے میں بھی ندیم کے

غزل

کمالِ دستِ ہنر سے اُسے سہارا جائے
بشر کو بحرِ حوادث میں جب اُتارا جائے
وہ جس سے حُسنِ تخیل میں ضوفشانی ہے
کبھی نہ دُور مری آنکھ سے ستارا جائے
میں ناخُدا کی پراندیشیوں سے ڈرتا ہوں
نہ وسوسوں میں کہیں ہاتھ سے کنارا جائے
جُنوں میں شدتِ وارفتگی یہی تو ہے
طلب کو آبلہ پا دشت میں پکارا جائے
کبھی تو وادیٔ دِل میں بھی روشنی پھوٹے
کوئی تو منظرِ خُوش آنکھ سے گزارا جائے
بے نیازیٔ سُود و زیاں غنیمت ہے
کہیں تو اپنے مقدر سے بھی خسارہ جائے
لہو کی گردشِ پیہم شعار اپنا رہے
کہ ہر مقام سے آگے قدم ہمارا جائے
ریاض سرعتِ ہستی کو پھر ضرورت ہے
جگر کے خُون سے پھر اُسے سنوارا جائے

(شاعر: سید ریاض حسین زیدی، ساہیوال)

نقوش ابھرنے لگے تھے۔ سپنوں کی فصل ہری بھری ہو کر پکنے کے قریب تھی کہ ندیم کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ پتا چلا کہ اس کے سوا اور بھی دو تین اس جیسی تھیں جن کے سپنوں میں ندیم بسا ہوا تھا۔ اس کے خواب مرجھا گئے اور ماں بھی سپنوں کی بیری ہو گئی۔

جب اس کے سارے سپنے دھندلا چکے تو پرایا سپنا ہرا بھرا ہو گیا۔ سارے میٹھے سپنے تو ندیم نے توڑ دیے تھے۔ اب تو بس پرایا سپنا ہی ایک اپنا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ رنگ برنگی تتلی ہے۔ بہت

سے پتنگے اسے خوبصورتی سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ ندیم بھی ایک پتنگا ہے جس نے حملہ کر کے اس کا ایک خوبصورت پر توڑ دیا ہے۔ اس کی خوبصورتی ماند پڑ گئی ہے اور وہ اب کبھی منزل تک نہیں پہنچ پائے گی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ بے بس ہو کر نیچے گرتی جا رہی ہے پھر اسے اپنی سانسیں پھولتی محسوس ہوتیں۔ وہ ہانپنے لگتی۔ بہت سے پتنگے کالے، پیلے، بھورے قریب آتے محسوس ہوتے۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل جاتیں اور وہ ادھورے سپنے کے ٹوٹے دھاگے کی سولی پہ چڑھ جاتی۔

نیند کی دہلیز پہ بیٹھا یہ خواب برسوں پرانا تھا۔ اسے نیند کی دہلیز پر ہمیشہ یہی خواب کنڈلی مار کے بیٹھا نظر آتا۔ اسے لگتا کہ یہ سپنا تمام میٹھے سپنوں کو کھا جائے گا۔ وہ سوتی تو کوئی خواب نیند کی دہلیز کے قریب بھی نہ آتا۔ نیند کی بستی میں خوابوں کے تمام گھر ویران پڑے تھے۔ صبح اس کی رخصتی تھی۔ اس کا دل اندیشوں کے بوجھ سے بیٹھ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پر کٹی تتلی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ چند لمحوں کی خطا نے اسے فطری خوبصورتی سے محروم کر دیا ہے اور شاید اب وہ کبھی اپنی منزل سے ہمکنار نہ ہو۔ اندھیرا بہت گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو گرم لحاف میں اچھی طرح سمیٹا اور لاچاری سے بولی'' آ بھی جاؤ میرے سپنو!..... آج میں اکیلی ہوں..... اندھیرے میں ہی چلے آؤ..... کوئی سپنا تو میرا جی بہلائے!'' اس نے بے بسی سے کہا'' پھر اپنے دہکتے رخسار اور نم آنکھیں تکیے میں گاڑ دیں۔

اچانک اسے کسی میٹھے سپنے کی آہٹ محسوس ہوئی مگر دوسرے ہی پل ادھورے سپنے نے اسے نگل لیا۔ پھر دوسرا..... تیسرا..... چوتھا..... سارے سپنے ایک ایک کر کے ادھورے سپنے کے پیٹ میں اترتے چلے گئے۔

اس کے بعد ادھورا سپنا اپنا پھن پھیلائے اس کی نیند میں اتر آیا۔ اس نے دیکھا'' ایک تتلی اپنے ننھے سے دوست گلاب کے لیے زرد رنگ لینے جاتی ہے۔ وہ فصیل پار کر کے بڑی مشقت سے رنگ ڈھونڈ کر لاتی ہے۔ واپسی پر پتنگے اس کے پروں کی خوبصورتی چھیننے کے لیے اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ پر ٹوٹ جاتا ہے اور وہ نیچے گر کر پھڑ پھڑانے لگتی ہے.....''

تیز و تند جھکڑ چلے، غبار دور دور تک پھیل گیا۔ اس کے انگ انگ میں خوف اتر آیا، اس نے سوچا ابھی ماں کی آواز آئے گی'' کرن!..... او کرن! اٹھ بھی جا'' اور پھر اسے ادھورے سپنے کی سولی پہ چڑھنا پڑے گا۔ مگر یہ آواز نہیں آئی۔ پل دو پل اس نے انتظار کیا پھر وہی ادھورا سپنا آگے چل پڑا۔ اس نے دیکھا ''تتلی فصیل سے گر کر پھڑ پھڑانے لگی ہے۔ پتنگے اس کے پاس پہنچنے والے ہیں اور اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلنے لگی ہیں۔ اچانک ایک ٹھنڈی ہوا چلی، گلاب کے پودے خوشی سے جھومنے لگے۔ ٹہنیوں پر لگے خواب رنگ شگوفوں اور کلیوں نے ایک دم مہک سی پھیلائی۔ پھر پھولوں کے بیچ سے سپنوں کا شہزادہ نکلا۔ اس نے بڑے پیار سے تتلی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر کر سینے سے لگایا اور ہر طرف میٹھے سپنوں کی روشنی پھیل گئی۔

■■■

حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

ماؤں کے اس ادھورے ارمان کا تذکرہ جسے پورا کرتے ہوئے وہ اپنی ہی بچیوں کو داؤ پر لگا رہی ہیں

توقیر عائشہ

کئی دن سے متواتر بازار جانا پڑ رہا تھا۔ وہ بھی بھری دوپہر میں، سبب خالہ زاد بہن کی شادی تھی کیونکہ شادی کی تیاری میں خالہ جان کا ہاتھ بٹانا تھا۔ دوپہر کے وقت جانے کا انتخاب یوں کیا کہ اس وقت دکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوتے ہیں۔ توجہ سے بات کو سن لیتے ہیں اور خریداری بھی اطمینان بخش طریقے سے ہو جاتی ہے۔ سو ہم خالہ بھانجی چار بجے کے قریب نکلتے۔ راستے میں فالسے والے ملتے، ٹن ٹن کرتے قلفی اور گولے گنڈے والے ملتے، باقی تو سب گھر بند کیے یو پی ایس اور جنریٹر کی چنگھاڑیوں میں ''آرام'' کر رہے ہوتے۔ بس ایک ہی ننھی مخلوق دیکھی جو بھری دوپہر میں وزنی بستے پیٹھ پر لادے دودو، چار چار کی ٹولیوں میں اس گلی سے نکل اُس گلی میں ہنستی بولتی چلی جا رہی ہوتی۔

یہ منظر روزانہ ہی دیکھنے میں آتا کہ نرسری سے لے کر بڑی کلاسوں تک کے بچے جھکی کمروں کے ساتھ ٹیوشن پڑھنے گھروں سے نکلے ہوتے یا کچھ بچے، بچیاں سپیارے ہاتھوں میں تھامے مدرسوں کی طرف جا رہے ہوتے۔ ہم خالہ بھانجی بچوں کے بارے میں باتیں کرتے جاتے اور دل میں اُن پر رحم کھاتے جاتے۔ ایک چیز ایسی مشاہدے میں آئی کہ جس نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا، وہ تھے ان کے لباس، اکثر بچیاں موٹی موٹی جینز کی پتلونوں میں پھنسی ہوئی اور بغیر آستین کے بنیان جیسی شارٹ قمیص یا صرف کندھوں کے اسٹیپ پر مشتمل پولی ایسٹر، جرسی یا نیٹ کے فراک پہنے ہوتیں اور مدرسے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسی پر ایک دھجی نما دوپٹا بھی زیب گلو ہوتا۔ وزنی بیگ اٹھانے میں بچے جھک جاتے اور ان کی قمیصیں پیچھے سے

اٹھ جاتیں۔

یہ ہمارا پہناوا تو نہیں..... اور اس قدر کھلا لباس موسم سے مطابقت بھی تو نہیں رکھتا۔ اب ذرا اس جگہ جا کر دیکھیے جہاں یہ بچے ٹیوشن پڑھنے بیٹھتے ہیں۔ اکثر گھروں میں فرشی نشست ہوتی ہے۔ جہاں ایک ہی محلے کے کئی گھروں کے بچے اکٹھے بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ ایسی پھنسی ہوئی جینز میں زمین پر بیٹھ کر لکھنا کس قدر مشکل کام ہے۔ وہ مائیں جو یہ لباس محض اپنی آسانی کے لیے پہنا کر بھیجتی ہیں وہ ان تکلیفوں کو محسوس نہیں کرتیں کیونکہ انھوں نے اپنے بچپن میں اس قسم کے لباس نہیں پہنے تھے یہ لباس تو اسی زمانے کا تحفہ ہیں۔

یہ بچیاں اس حلیے میں کیوں نظر آتی ہیں؟ اگر ماؤں سے پوچھا جائے تو جواب ملے گا کہ بازار میں اب یہی کچھ بک رہا ہے تو ہم خرید لیتے ہیں۔ حالانکہ جتنے پیسوں میں یہ تکلیف دہ اور عریاں لباس ملتا ہے اتنے ہی پیسوں میں لان یا کاٹن کے چھوٹے چھوٹے پرنٹس کے کپڑے خرید کر شلوار قمیص ٹراؤزر اور فراکیں بڑے آرام سے بنائی جا سکتی ہیں۔ یقین کیجیے ایک کے بجائے دو جوڑے بن جائیں گے جو پسینہ جذب کرنے کے ساتھ ساتھ اچھے بھی لگیں گے۔ اب بچے زمین پر بیٹھیں یا پارک میں جھولا جھولیں انھیں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

عریاں لباس کے کتنے دوررس اثرات ہیں اس پر غور کرنے کی کبھی زحمت نہیں کی گئی۔ جب ایک چھوٹی سی بچی ننگے بازوؤں والی فراک اور ٹیکر پہن کر گھر سے نکلتی ہے تو گڑیا سی لگتی ہے۔ دس روپے ہاتھ میں دبائے محلے کی دکان پر ''چیز'' لینے آتی ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ دُکانوں پر کھڑے فالتو اور آوارہ افراد اور محلے ہی کے لڑکے آلودہ ذہنوں کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور پھول سی معصوم بچیوں پر بری نظر ڈالتے ہیں۔ بہانے سے ان کے بازوؤں پر چٹکیاں لیتے اور مذاق کرتے ہیں۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ شام کے وقت جب محلے کے بچے کرکٹ کھیلنے گلی میں جمع ہوتے ہیں ان کے ہی درمیان یہ معصوم بچیاں، پکڑم پکڑائی اور پہل دوج جیسے کھیل، کھیل رہی ہوتی ہیں۔ میڈیا کی ''مہربانی'' سے جلد ''بڑے'' ہو جانے والے یہ چھوٹی عمر کے لڑکے اشتہارات کی بولیاں بولتے، رٹے رٹائے ڈائیلاگز بولتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں نازیبا اشارے کرتے ہیں۔ آخر کس نے یہ کہہ دیا ہے کہ اپنی معصوم بچی کو باربی ڈول بنا کر گلی میں کھیلنے بھیج دو۔

سب سے زیادہ گلہ مجھے ان والدین سے ہے جن کی بچیاں آٹھ سے تیرہ سال کی عمروں میں ہوتی ہیں۔ ماں باپ بہت بے خبر، بہت روشن خیال اور لبرل بن کر ان کو نامناسب لباسوں میں لیے سڑکوں پر چلتے پھرتے ہیں۔ جہاں جہاں یہ اس حلیے میں جاتی ہیں دکاندار حضرات، آئسکریم پارلر کے منتظمین، گلی محلے والے، سبزی والے ان پر جو نگاہیں ڈالتے ہیں حیرت ہے کہ والدین کو وہ تیر بھالے بن کر کیوں نہیں لگتے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

آئے دن تو ہم ان معصوم جانوں کے ساتھ ہونے والے روح فرسا واقعات تواتر سے

اخبارات میں پڑھ رہے ہیں۔ کبھی ''شہزادی'' کبھی ''نیلم'' اور کبھی ''ثنا'' کی شکل میں معصوم روحیں شیطان کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ ان المناک واقعات کے پس منظر میں جائیں تو آپ کو ایک طویل قطار بے حیائی کے بیج کاشت کرنے والوں کی ملے گی۔ ان میں اشتہاری اور فلمی صنعت سے وابستہ افراد، پریس میں ان کے خوشنما اور خوش رنگ تذکرے، نیٹ اور موبائل کے ایک کلک پر سب کچھ حاضر کر دینے والی گلیمرس دنیا اور بہت بہت کچھ...... جو عوام میں جنسی جذبات کی آگ کو بڑھانا چڑھانا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں، ملیں گے۔

جب انسان کو بھیڑیا بنانے والی اتنی ساری فیکٹریاں لگی ہوں تو آپ اپنے بچوں کے دفاع سے اتنے غافل کیسے ہیں؟

کسی بھی نجی محفل میں معاشرے میں بڑھتی ہوئی فحاشی و بے حیائی کا ذکر لے بیٹھیں تو ہر شخص بے حد دل گرفتہ اور ان نکات سے متفق دکھائی دے گا چاہے وہ کوئی مرد ہو یا خاتون مگر اس بے حیائی کے فروغ میں کس کا کتنا حصہ جا رہا ہے اس پر دھیان دینے پر کوئی تیار نہیں۔ ضرورت اپنے حصے کی منافقت دھونے اور اپنا طرز عمل تبدیل کرنے کی ہے۔

وہ خواتین جو زیادہ وقت مختلف چینلز کے پرکشش نظریات کے زیر اثر رہتی ہیں وہ تصور میں ان ہی ماڈلز اور اداکاروں جیسے لباس زیب تن کرنا چاہتی ہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو ایسے واہیات لباس پہنے محسوس کرتی ہیں اور وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ مخصوص خاندانی اور معاشرتی دباؤ کے تحت وہ یہ نہیں کر سکتیں تو وہ یہ شوق اپنی پھول جیسی بچیوں کے ساتھ پورا کر کے تسکین اور خوشی حاصل کرتی ہیں۔ لیکن ان کا یہ شوق ان بچیوں کے لیے کس قدر ہولناک نتائج لاتا ہے۔ کیا یہ میرا تجزیہ اور مشاہدہ ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہوگا؟

اس کا ایک بڑا اور اہم پہلو اور بھی ہے۔ ابھی تو آپ انھیں یہ لباس پہنا کر خوش ہو جاتے ہیں لیکن چند سال بعد یہ بچیاں بڑے ہو کر عمر کے اسی دور میں آجاتی ہیں جب ان پر معاشرتی اور مذہبی حدود کا اطلاق ہونے لگتا ہے۔ اب آپ ان پر پابندیاں لگانا شروع کرتے ہیں۔ انھیں آستینوں والے لباس، اسکارف اور عبایا پہنانا چاہتے ہیں تو ایک تصادم پیدا ہوتا ہے۔ حیا کا وہ بیج جو ابتداء میں مار دیا گیا تھا اب اسے مصنوعی طور پر اگانے اور اس میں پھول اور پتے لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں سے بغاوت جنم لیتی ہے اور ہماری مذہبی اور سماجی اقدار کہیں بہت دور کھڑی نظر آتی ہیں۔

ہمارے دین نے جو ثقافت اور سماجی اقدار ہمیں عطا کی ہیں۔ وہ فطرت کے عین مطابق ہیں۔ وہ ہیرا ہے اس کے سوا جتنے بھی زندگی گزارنے کے اطوار ہیں وہ کنکر ہیں، پتھر ہیں اور آگ ہیں۔ ہیرا مسترد کر دینے کا مطلب باقی تین ممکنات میں سے ایک کا انتخاب ہے۔

اس لیے اپنی پھول جیسی بچی سے پیار کا حق ادا کیجیے۔ اسے وہ پیراہن دیجیے جو اس کی حفاظت کا ضامن ہو نا کہ دوسروں کی بری نگاہوں کا مرکز بنا دے اور عزت و ناموس اور جان دونوں کو داؤ پر لگا دے۔

■■■

سفرنامہ

22000 طلبہ و طالبات

غزہ یونیورسٹی کے کلچر نے حیران کر دیا

وہاں کسی درخت کے نیچے، کسی دیوار کی اوٹ میں کوئی جوڑا بیٹھا نہ ملا

اسرائیل نے غزہ خالی کیوں کیا؟

اسرائیلی فوجی کی پانچ سال تک قید کی سنسنی خیز کہانی

شیخ احمد یاسین کی قبر پر کتبے میں کیا لکھا تھا؟

اختر عباس

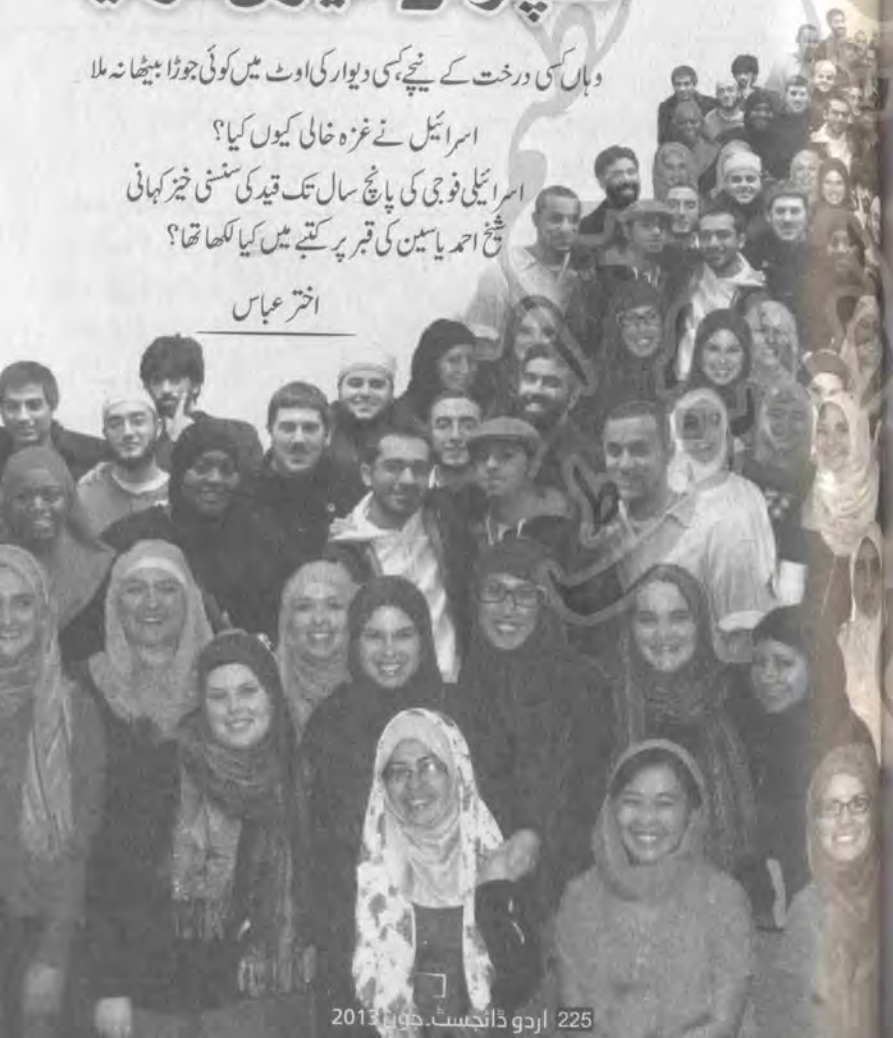

غزہ میں دوسرے دن ہوٹل کے کمرے میں دور کھلے سمندر سے آتی ہواؤں نے ایک خوشگوار دن کی نوید دی۔ ڈاکٹر عمران صحاف اور ڈاکٹر عمران غیور نے آج کا سارا دن آئی سرجنز کو ٹریننگ کرانی تھی۔ ٹریننگ کے لیے لایا گیا بیک ڈراپ بینر قاہرہ کے ہوائی اڈے پر ضبط ہو گیا تھا۔ بٹ صاحب نے راتوں رات لاہور سے اس کا ڈیزائن منگوا کر میزبانوں کے حوالے کیا۔ صبح تک فلیکس تیار تھی۔ ہم دونوں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ اتفاق سے ڈائننگ ہال میں ہم دو ہی تھے۔ پروگرام یہ طے پایا کہ پہلے ملاقاتیں کر لی جائیں پھر غزہ کا تفصیلی دورہ کیا جائے۔ پہلا پڑاؤ وزارت صحت کے ڈائریکٹر جنرل کے آفس میں ہوا۔

ڈاکٹر

انتظار حسین نے ڈی جی ہیلتھ کے ساتھ MOU پر دستخط کیے جسے رات بھر انھوں نے اپنے لیپ ٹاپ پر تیار کیا اور صبح دم سب کو پڑھایا، مشورے لیے اور سب کی اشیرباد سے اس کے فائنل پرنٹ لے کر ہم ڈاکٹر کاشف کے آفس پہنچے تھے۔ ڈاکٹر کاشف بہت اچھی اور رواں انگلش بولتے ہیں۔ اس لیے گفتگو میں روانی تھی۔ بٹ صاحب نے انھیں لاہوری خلیفہ کے بسکٹ اور خطائیاں دیں جو انھوں نے فوری طور پر کھول کر چکھیں پھر اپنی دونوں اسٹاف آفیسرز کو بلایا۔ ان کی سیکرٹری ریحام تو اس پورے دورے کے انتظام وانصرام میں بنیادی کوآرڈینیٹر تھیں۔ ایم او یو پہ دستخط ہو گئے تو ڈاکٹر کاشف اپنی خوشی اور کامیابی کو شیئر کرنے فوری طور پر وزیر صحت کے آفس چلے گئے۔ دونوں کے باہمی تعلقات کی قربت کا اندازہ چند لمحوں بعد ہی ہو گیا جب ڈاکٹر مفید نے ہمیں آ کر گلے لگا لیا۔ وہ اس قدر مشکور تھے کہ ان کے ہر لفظ اور جملے سے اظہار ہو رہا تھا۔ کہنے لگے ''آپ تو نہیں جانتے ہم یہاں صحت کی سہولتوں کی کس قدر کمی کا سامنا کر رہے ہیں۔ کینسر کا علاج نہیں کر سکتے، کڈنی، ماں اور بچے کی نگہداشت کے لئے حساس آپریشنز سے محروم ہیں۔ 400 سے زائد ایسی ادویات ہیں جو پورے غزہ میں موجود ہی نہیں۔ ہمارے 13 ہسپتالوں اور 56 پرائمری ہیلتھ سنٹرز میں 10 ہزار سے زائد میڈیکل ورکرز خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان سب کو بہتر تربیت کی ضرورت ہے۔ کہیں ساز وساماں ہے تو اس کی ضروری اسسریز موجود نہیں۔ رکے ہم پھر بھی نہیں، 3 سال پہلے اوپن ہارٹ سرجری شروع کی۔ جہاں ویسکولر آپریشن، نروس سسٹم پہ کام ہوا وہاں آپ کی آمد سے ایک ماہ پہلے کڈنی ٹرانسپلانٹیشن کا بھی آغاز کر دیا ہے۔'' پھر وہ بولے۔

''ہمیں مشکلیں دوہری ہیں۔ لوگوں کا ایک دشمن ہوتا ہے۔ 6 سال سے ہم اسرائیل کے ساتھ ساتھ اپنے ہی فلسطینی ہم وطنوں الفتح کا بھی نشانہ بن رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے۔''

ڈاکٹر مفید نے پاکستان اور اہل پاکستان سے جس والہانہ محبت کا اظہار کیا۔ پتا چلا کہ وہ 1995 میں تین سال کراچی میں رہے جہاں سے انھوں نے گریجوایشن کی تھی۔ ڈاکٹر مفید نے ہمارے ساتھ تصاویر بنوانے کے بعد ڈرامائی طور پر ایک تصویر میں ڈاکٹر کاشف اور ڈاکٹر انتظار کو یوں اپنی بانہوں کے حصار میں لیا کہ باپ بھی بیٹوں سے کیا محبت کا اظہار کر پاتا ہوگا۔ طے

ہوا کہ ہم کل ان کے آفس میں ان سے ملیں گے۔

وزارت صحت کا دفتر تیسرے فلور پر تھا اور لفٹ سے اتر کر جب آفس میں جانے والے تھے تو ایک بورڈ پر نظر پڑی، لکھا تھا ''القدس 79.36 کلومیٹر۔'' یہ اندازِ فکر تو خود کو بھی اپنی منزل اور اپنا مقصود ومطلوب بھولنے نہیں دیتا ہوگا۔

وزارتِ صحت پہنچنے تک میں دل میں پریشان تھا کہ ہمارے گائیڈ بھی خوب ہیں۔ سوائے مسکرانے کے اور اپنے ڈرائیور سے گفتگو کے کوئی کام ہی نہیں کر سکتے مگر جب وزارت صحت کے دفتر پہنچے تو پتا چلا کہ ان کے روابط ہر جگہ بہت اچھے ہیں۔ سرکاری گاڑی سے اترتے ہی ایک پروٹوکول آفیسر نے خوشدلی سے استقبال کیا اور استقبالیہ ڈیسک اور لفٹوں سے ہوتا ہوا اوپر لے گیا۔ سیکیورٹی گارڈ ہر جگہ بہت موثر اور متحرک اور چوکنے تھے۔

شیخ احمد الجابری کی قبر پر

35000 ڈالر کی مشین

ہمیں وزیر صحت کے اسٹاف آفیسر کے حوالے کر کے اس نے اجازت چاہی۔ پتا چلا شدت سے انتظار ہو رہا ہے، اگلے ہی لمحے ہم ڈاکٹر مفید کے کمرے میں تھے۔ ڈاکٹر صاحب گرمجوشی سے گلے ملے پھر انھوں نے تین بار گال ملائے، پیار کیا اور ڈاکٹر موسیٰ محمد نور الدین سے ملوایا جو ملائیشیا سے آئے ہوئے تھے۔ وہ فیما (FIMA) ملائیشیا کے صدر رہے اور Viva Palestine Malaisia (ملائیشیا میں فلسطین کی آزادی اور غاصبانہ قبضے کے خلاف کام کرنے والی تنظیم کے چیئرمین ہیں) ڈاکٹر موسیٰ کی اہلیہ اور بیٹی بھی غزہ آئی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر مفید نے اس موقع پر بتایا کہ وہ پچھلے ہفتے قاہرہ گئے تو ڈاکٹر کاشف نے آنکھوں کے آپریشن کرنے والی ایک مشین پسند کی، اس کی قیمت 35000 ڈالر تھی۔ بٹ صاحب نے کہا کہ ہم اس کی ادائی وہیں قاہرہ میں کر دیں گے۔ آپ ایک مشین اور ضروری سامان مزید بھی پسند کر لیں۔ قاہرہ میں ادائی سے آپ کو مشین کی فری سروس اور آفٹر سیلز گارنٹی کی بھی سہولت مل جائے گی۔

قہوے کے گھونٹ بھرنے کی اداکاری

تمام سرکاری ملاقاتوں میں قہوہ بڑے التزام سے پیش کیا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے فنجان سرخی نما سیاہی رنگت کے قہوے سے لبالب بھرے ملتے ہیں۔ میں نے ایک دو بار کوشش کی مگر پینے میں ناکام رہا۔ اس عمر میں کھانے پینے کی عادتیں کہاں بدلتی ہیں، ہوٹل میں تو ''اوکھے سوکھے'' ہو کر دودھ والی چائے بنوا کر پیتے رہے۔ یہاں ڈاکٹر مفید سے اجازت لے کر اٹھنے لگے تو ان کی نظر میرے سامنے رکھے فنجان پر پڑی وہ قہوے سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے سارا الزام گفتگو پر دھر دیا کہ جس کے باعث میں قہوے جیسی نعمت سے محروم رہ جانے والا تھا۔ انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بزور بٹھا دیا اور بولے ''برادر نو پرابلم!

پلیز نیک اٹ، وی ول ویٹ۔'' وہ کھڑے رہے اور میں نے ٹھنڈے قہوے کو ہونٹ لگا کر گھونٹ بھرنے کی اداکاری کی۔ اداکاری ہوگئی مگر قہوہ حلق کے اندر جانے سے انکاری رہا مجھے سمجھ نہ آئے کہ کیا کروں۔ مروت اپنی جگہ پر، محبت بھی سر آنکھوں پر مگر کڑوا قہوہ کیسے پیا جاتا، وہ تینوں گفتگو میں پوری شدت سے محو تھے۔ میں نے موقع پا کر ساتھ پڑے ہوئے ایک خالی کپ میں آدھا قہوہ انڈیل دیا۔ اس میں رسک تو بڑا تھا مگر بڑی بڑی ملاقاتوں میں ایسے چھوٹے چھوٹے رسک تو لینے پڑتے ہیں۔

وزارت صحت کے دفاتر میں اور بھی کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ ڈاکٹر مفید، اسلامی یونیورسٹی غزہ میں ڈین اور پروفیسر تھے۔ حماس نے الیکشن جیتا اور کابینہ بنائی تو چن چن کر ایسے لوگوں کو وزیر بنایا جو دنیا کی اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں سے پڑھ لکھ چکے تھے۔ علم کے ساتھ جنون ہو تو عمل دو آتشہ کیوں نہ ہو، ڈاکٹر موسیٰ نے دفتر سے باہر آ کر دو جملے کہے ''مفید از ایکسیلنٹ وہ جانتا ہے کہ اسے کب اور کہاں سے اپنے لوگوں کے لیے کیا چاہیے۔''

اس بلڈنگ کے دوسرے فلور پر مشیر صحت محمد اشرف الدر، ڈاکٹر مروان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا ''جس بلڈنگ میں وزارۃ کے دفاتر ہیں اس کا افتتاح یاسر عرفات کے ہاتھوں ہوا تھا۔ آپ اس کی پالیسیوں کے 180 درجے مخالف ہیں پھر بھی کسی نے اس کی افتتاحی تختی کا منہ نہ کالا کیا، نہ اس پر سکریچ ڈالے نہ اکھاڑ کر پھینکا۔'' سوال کرتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے بیسیوں اداروں کے ٹوٹے ہوئے بورڈز، اکھاڑے ہوئے پتھر اور اسٹیل کی پوری خوب صورتی سے بنی ہوئی یادگار افتتاحی تختیاں تھیں مگر حکومت اور افراد کے بدل جانے سے بے وقعت جان کر یا مخالف پارٹی اور گروپ کے باعث شاہ کے وفاداروں نے ان تختیوں کے بھی تختے الٹا دیئے تاکہ مزاج شاہاں پر ناگوار ہی نہ گزرے۔

ان کا جواب دلچسپ بھی تھا اور حکمت بھرا بھی، ''ہمیں امید ہے ایک روز ہم سب فلسطینی پھر سے اکٹھے ہوں گے اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف، خالد مشعل نے بہت وضاحت سے کہہ دیا ہے۔ حالات بدتر نہیں بہتر ہوں گے حالانکہ ہم مستقل ''انڈر اٹیک'' ہیں۔ ہر حملے کے بعد ہمیں لاشوں اور زخمیوں کے علاوہ سرکاری اور ذاتی نقصانات کو نئے سرے سے سنبھالنا پڑتا ہے۔ غزہ کے باہر سے آنے والے اسی لیے خوفزدہ رہتے ہیں کہ اتنی بے یقینی تو موسم کی بھی نہیں ہوتی جتنی ہمارے ہاں حالات کی ہوتی ہے۔ اپنی آنکھوں میں امید اور دل میں یقین کم نہیں ہونے دیتے۔ یہ شارٹوں کے افتتاح کی تختیاں تو بہت معمولی چیز ہے۔ بڑے مقاصد کے لیے دل بڑا کرنا چاہیے۔''

''کیا واقعی آپ کی حکومت اور وزیر اعظم کا دل ایسا ہی بڑا ہے۔'' میں نے ذرا سنبھل کر سوال کیا۔

وہ مسکرائے ''ہمارے وزیر اعظم اسماعیل ھنیا لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں۔ وہ لوگوں کے بھائی ہیں، بیٹے ہیں۔ لوگ ان سے مل سکتے ہیں، وہ بھی پوری جرأت کے ساتھ مساجد میں جاتے ہیں۔ خطاب کرتے ہیں، ابوطاہر (کچھ لوگ یوں بھی انھیں مخاطب کرتے ہیں) گلی محلوں میں، کھلی جیپ میں پھرتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ زندگی ہر لمحے داؤ پر ہے۔ اسرائیل لمحہ لمحہ مانیٹر کرتا ہے تو الفتح والے بھی گھاس کے نیچے چلتے پانی

جیسی بے آواز حرکیات کے ساتھ موجود ہیں۔

ہمیں پوری امید ہے کامیابی کے لیے جس قدر محنت، اخلاص اور اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم اس میں پیچھے نہیں ہیں، ہمارے دل مکمل آزادی اور مکمل انقلاب کے لیے ترسے ہوئے ہیں۔ اس لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت بھی نہیں دی جاتی۔ مقصد سے نگاہ نہیں ہٹائی جاتی۔''

40 ہزار نوجوان سرکاری ملازم

وزارتِ صحت سے روانہ ہوئے تو وزارتِ تعلقات عامہ ہماری منزل تھی۔ وہاں جاتے ہی ایک نوجوان آفیسر محمد عبیداللہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا ''ابھی تو بظاہر خاموشی اور سکون ہے مگر کسی بھی وقت ہم حملے کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ ہماری وزارت اور شعبہ ان لمحوں کے لیے تیار رہتا ہے تاکہ دنیا کو بلاتاخیر حقائق سے آگاہ رکھا جا سکے۔

عبیداللہ سے انگریزی میں گفتگو کا بہت فائدہ ہوا۔ میں نے ایک دم سے الاقصام کا پوچھ لیا۔ ایسی وزارتوں والے عام طور پر لبرل ہوتے ہیں۔ ان کی وفاداریاں اپنی نوکریوں اور ذاتی ترجیحات سے ہوتی ہیں۔ وہ اپنی قیادت اور فوج سمیت کسی بھی ادارے کے بارے میں جب اور جہاں موقع ملے ''پھولوں کی چادریں'' چڑھانے سے باز نہیں آتے۔ ہم نے تو اپنے مرکز اور صوبوں میں یہ منظر بہت تواتر سے دیکھے ہیں۔ اس 22 سالہ نوجوان نے کہا ''الاقصام ہمارا بازوئے شمشیرزن ہے۔ اس نے ہمیں عزت دی ہے، ہماری حفاظت کی ہے ہم باقاعدہ فوج نہیں رکھ سکتے مگر یہ ہماری Dignity اور Independance کی علامت اور ضامن ہے اس کی پاور نے سیاسی اور عسکری سطح پر معاملات کو کافی توازن دیا ہے۔ اب ہم اتنے لاچار نہیں کہ صرف مرنے پر لاشیں ہی گنتے رہیں۔ عسکری طور پر جواب دینے کی صلاحیت نے ہی سیز فائر کو ممکن بنایا ہے''۔ عبیداللہ سے گفتگو جاری تھی کہ سلامہ ماروف آ گئے یہ بھی نوجوان تھے۔ پتا چلا کہ وزارت کے اس شعبے میں جنرل مینیجر ہیں۔ انھوں نے بڑی محبت سے وزارت کے دفاتر میں آنے کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے پوچھا ''ہر طرف نوجوان نظر آ رہے ہیں۔'' بولے ''یہ بائی چوائس ہے۔ قریباً چالیس ہزار نوجوان اس وقت حکومت کے دست و بازو ہیں۔ ان میں 30 فیصد لڑکیاں ہیں۔ حکومت امتحانات کے لیے مراکز بناتی ہے۔ جو کامیاب ہو جائیں ان کی اچھی تعلیم اور اچھی تربیت حکومت کے ذمے ہوتی ہے۔ سلامہ نے مسکرا کر ہمیں دیکھا پھر بولے آپ کی اتنی دور سے آمد کا شکریہ، دین نے ہمیں باہم باندھ رکھا ہے۔ ورنہ اتنی دور آنا، ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو محسوس کرنا کسی اور وجہ کا سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ ہمارے یہاں جو لوگ دین سے جڑے ہیں، حکومتی سطح پر ان کے لیے آسانیاں زیادہ ہیں۔ جو اسلامی زندگی اور اس کی روایات کو ترجیح دیتے ہیں۔ حکومت بھی ان کی قدر کرتی ہے، کتاب مبین کو جو حفظ کر لے تو اعلیٰ تعلیم کے دوران اسے فیس معاف ہو جاتی ہے۔ جیل میں ہو تو سزا معاف ہو جاتی ہے۔ چند برسوں میں 40 ہزار سے زائد نوجوانوں نے سرکاری سرپرستی میں قرآن پاک کو حفظ کیا ہے۔ ہم وزارتِ مذہبی امور کے ساتھ مل کر ہر سمر میں کیمپ لگاتے ہیں اور 10 ہزار نوجوانوں کو اڑھائی ماہ میں قرآن پاک حفظ کرنے کو ممکن بناتے ہیں۔

غزہ میں جرم اتنا کم کیوں ہے؟

''بہت عمدہ اور اچھی بات ہے۔'' میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر ''کیا غزہ کا معاشرہ واقعی اسلامی اخلاق اور معاملات میں ڈھل گیا ہے۔ مناسب سمجھیں تو اپنی جیلوں کا احوال دیجیے۔''

جواب کئی حیرتیں لیے تھا۔ ''بولے ہمارے ہاں دو جیلیں ہیں، جرائم بہت ہی کم ہیں، چوری جیسے چھوٹے موٹے جرائم ہوں تو پولیس حرکت میں آتی ہے۔ لوگوں کو پکڑتے ہیں مگر عدالتی نظام جن کے سپرد ہے وہ لوگوں کو سزائیں دے کر برباد کرنے پر یقین نہیں رکھتے۔ جیل میں ان کو باقاعدہ اسلام کی تعلیم دی جاتی ہیں، ان کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ حفظ کر لیں تو سزا معاف، قرآن پڑھ لیں، احادیث یاد کر لیں، فقہ سیکھ لیں تو بھی سزا میں معقول معافی ہو جاتی ہے۔''

غور کیجیے ہماری کمیونٹی ایک گھر کی طرح ہے، بہت بڑی نہیں ہے تاہم باہم جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے جرم کم ہے، بچوں کی شادیاں جلدی کروائی جاتی ہیں اور اگر کوئی نوجوان کسی شہید کی بیٹی سے شادی کا فیصلہ کرتا ہے تو حکومت شادی کے سارے اخراجات ادا کرتی ہے۔ یہ حماس اصل میں کیا ہے؟ میں نے ان کی بات کو درمیان سے کاٹا، ان میں کچھ باتیں کسی نہ کسی حوالے میں اس سے پہلے پوچھ چکا تھا اور اب ایک اعلیٰ حکومتی عہدے دار ان کی تصدیق کر رہا تھا۔ تو پوچھنا بے حد ضروری تھا۔

''دیکھیں، انھوں نے پوری توجہ اور محویت سے سوال سن لیا تھا'' Hammas is a faith based organization''۔

ان کے آنے سے جہاد کا اصل تصور، شہادت کی پوری روح کے ساتھ اس طرح حکومتی پالیسی کا حصہ بنا ہے کہ دین سے محبت حکومتی پالیسیوں کا لازم حصہ بن گئی ہے۔ آپ غور کریں کہ جیلوں میں قید قریباً 92 فیصد لوگ اس لیے رہا کر دیئے گئے کہ انھوں نے اپنی اصلاح کے پروگرام کے مطابق سیکھا اور بہتر طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔

75% قیدیوں کو پوری سزا بھگتنی نہیں پڑتی۔ اچھی نیچر کے قریب جانا انسانوں کے لیے آسان ہوتا ہے۔ حماس نے اسے ممکن بنا دیا ہے۔

لومیرج یا ارینجڈ میرج

گفتگو جس رخ پر جا رہی تھی۔ اس لحاظ سے میرا سوال ایک لحاظ سے تو سپیڈ بریکر ہی تھا۔ میں دو روز سے غزہ میں چلتے پھرتے محسوس کر رہا تھا کہ لڑکیاں بہت آزادی اور حفاظت سے ہیں اور بازار، دفاتر حتیٰ کہ چھوٹی گلیوں میں لڑکے بالے انھیں مڑ مڑ کر نہیں دیکھتے۔ اسکارف اور پورے لباس میں ملبوس لڑکیوں کی اکثریت بے حد خوب صورت نین نقش والی تھیں۔ مصر کی لڑکیوں سے بہت مختلف، لباس، اطوار اور صحت کے ظاہری اظہار کو اگر ''پیمانہ'' مانا جائے تو فلسطین میں

درجے خوب صورتی والا محاورہ عملاً دیکھا جا سکتا تھا۔

آپ کے ہاں شادی کا کیا معمول ہے۔ لومیرج یا والدین کی طرف سے فیصلے کو جبراً منوا لیا جاتا ہے، جواب میری توقع سے ہٹ کر تھا۔

بولے ''دونوں طرح کا معمول ہے۔ روایتی شادی اور لومیرج بھی۔ ہمارے ہاں شرعی قاضی مذہب کے معاملات میں ایکسپرٹ ہیں۔ ان کی رائے مقدم مانی جاتی ہے۔ انھوں نے طے کیا ہے کہ ایسی صورت میں خرچ سارا شوہر پورے کرے گا۔ وہ لومیرج میں مدد کرتے ہیں مگر کوشش کر کے جوڑے کو ان کے خاندان سے بھی جوڑے رکھتے ہیں۔''

''فلسطین میں فی خاندان بچوں کا ریشو سنا ہے کافی زیادہ ہے۔'' میں مسکرایا تھا۔ بظاہر شرارتی سا جملہ ہے مگر مجھے اصل حقائق بھی تو جاننا تھے اور ضروری نہیں تھا کہ آنے والی ملاقاتوں میں ہر اعلیٰ آفیسر کے ساتھ گفتگو کا ایسا ہی دوستانہ ماحول میسر آتا۔

ہر گھر میں اوسطاً بچوں کی تعداد اور خوب صورتی کا معیار

فلسطین میں ہر گھر میں اوسط 7 بچے ہیں مگر غزہ میں اوسط زیادہ ہے۔ یہاں فی خاندان بچوں کی تعداد 8 ہے۔

بٹ صاحب نے سوال کرنے کا ارادہ کیا پھر جھینپے اور بول پڑے ''یہاں خوب صورتی کا کیا معیار ہے؟ مجھے افریقہ کے کافی ملکوں میں پھرنے اور کام کرنے کا موقع ملا۔ وہاں تو اچھی خاصی کالی لڑکیوں کو بھی خوبصورت سمجھ کر شادی کر لی جاتی ہے۔ ہم جیسے لوگ اوپر سے مذاق اور اندر سے توبہ توبہ کر رہے ہوتے تھے۔''

سلامہ معروف کا جواب سیدھا اور سمجھ آنے والا تھا بولے ''برادر خوب صورتی ہر ایک کے لئے مختلف ہوتی ہے۔ کہیں عزت اصل معیار ہوتا ہے، کہیں خاندان، کہیں اعلیٰ دینی تعلیم اور کہیں پاؤں کی خوب صورتی کو معیار مانا جاتا ہے۔''

شبیر تو دیکھے گا

غزہ میں روزانہ شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد 4 ہے، 3 ہفت روزہ ہیں۔ تین سٹلائیٹ چینل ہیں جن کے نام 1 الاقصیٰ 2۔ ھنا القدس اور 3۔ الکتاب ہیں۔ 20 ایف ایم ریڈیو سٹیشن بھی کام کر رہے ہیں۔

الراعی ایک سرکاری ویکلی پیپر ہے..... ویب سائٹ Alray.com.ps عملے نے اشارہ پا کر ضروری رسائل اور تحائف ہماری نظر کئے اور ہم نے جوس پی کر وہاں سے اجازت لی۔ سہولت یہ ہوگئی کہ انھوں نے محمد عبیداللہ کا ہمارے لئے باقاعدہ بطور ترجمان تقرر کر دیا۔ رسمی طور پر اب ہماری باقاعدہ پہلی ملاقات اپنے گائیڈ اور فوٹو گرافر سے گاڑی میں ہوئی کیونکہ پہلے تو ''بے زبانی تھی زبان میری'' والا معاملہ تھا۔

جونہی گائیڈ نے منہ نیچے کر کے اپنا نام شبیر بتایا۔ بٹ صاحب کہے بغیر نہ رہ سکے، کوئی دیکھے یا نہ دیکھے شبیر تو دیکھے گا۔ سعید شبیر کا کمال یہ تھا کہ اس نے ہر جگہ بہت عمدگی سے رابطہ کیا ہوا تھا۔ آتے جاتے، چلتے پھرتے، لفٹ میں، گاڑی میں مسلسل اپ ڈیٹ دے اور لے رہا تھا۔

غزہ کے مچھیروں کی پریشانی

غزہ سٹی میں اچھی خاصی گرمی تھی۔ ساتھ سمندر ہونے کا تو بظاہر موسمی فائدہ بھی نظر نہیں آیا۔ رات دیر گئے ہم جیپ پر جب شہر کا راؤنڈ لے رہے تھے تو ساحل سمندر پہ واقع پورٹ بھی دیکھنے گئے وہاں صرف کھنڈر ہی تھے اور دور دور تک تھکی ہاری کشتیاں

تھیں جنھیں علی الصبح شکار کے لیے روانہ ہونا تھا۔ آتی جاتی کشتیوں اور بوٹس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ مچھیرے صرف 3 کلومیٹر تک جاسکتے ہیں اس کے آگے اسرائیلی بحریہ کی عمل داری ہے۔ وہ قریب آنے والی ہر کشتی اور بوٹ کو پکڑ لیتے ہیں۔ اس لئے اکثر مچھیرے جو مچھلیاں پکڑنے جاتے ہیں، زیادہ دور جانے کا زیادہ رسک نہیں لیتے اور کھلے سمندر میں مصری ملاحوں سے مچھلیاں خرید کر واپس آجاتے ہیں۔

فلسطین۔ سچ کے اندر کی کڑواہٹ

ہماری اگلی منزل غزہ سے شائع ہونے والے روزنامہ فلسطین کا دفتر تھا۔ لفٹ سے اوپر پہنچے تو استقبالیے پر نائب مدیر محمد یٰسین سے ملاقات ہوگئی۔ میٹنگ روم میں ڈاکٹر حسن منتظر تھے یہ مدیر اعلیٰ ہیں۔ انھوں نے دیکھتے ہی کہا ''میں بہت خوش ہوں آپ کو یہاں پاکر۔ ہمارا اخبار 2007 میں شروع ہوا تھا۔ یہ یہاں کا پہلا قومی اخبار ہے۔ بے شک وسائل کا مسئلہ رہتا ہے مگر ہم روز ترقی کر رہے ہیں۔ ہمیں اب میڈیا ایکسپرٹ جانا اور مانا جارہا ہے۔ ہمارا اخبار ویسٹ بنک سے بھی شائع ہوتا ہے۔ وہاں تقریباً 15 ہزار اس کی اشاعت ہے۔ ساتھ تین میگزین ایڈیشن بھی چھپتے ہیں ۔سیکیورٹی، سوشل اور اکنامکس پر۔''

کیا حکومتی سطح پر کبھی مشکلات پیدا کی گئیں؟ میری بات سن کر ڈاکٹر حسن نے اپنی عینک اتار کر لمحہ بھر کو سوچا پھر بولے ''ہر صحافی اور اخبار کو دنیا میں کم وبیش ایک جیسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب کو پورا سچ بتا نہیں سکتا۔ سچ کے اندر کڑواہٹ ہمیشہ سے رہی ہے۔''

ڈاکٹر حسن یہاں کے معروف کالم نگار ہیں۔ اس شام اپنے ہوٹل کماڈور میں منعقدہ ایک کانفرنس میں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا ڈاکٹر صاحب بطور صحافی غزہ کی صورت حال کو کیسے دیکھتے ہیں۔ بولے ایک مشکل صورت حال ہے۔ ہماری قوم حالتِ محاصرہ میں ہے۔ یہ انسانی ڈگنٹی کے ہی خلاف ہے۔ سوسائٹی کی سوچ اور مزاج پر اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔ نومبر 2012 جنگ کے بعد لوگوں کو بہت اچھا لگا Resistance (مزاحمت) اصل میں Reaction (ردعمل) ہے۔ لوگ اس مزاحمت کے باعث Reorganize ہورہے ہیں۔

گفتگو کے اس موڑ پر اچانک میرے منہ سے نکلا نیوز ویک جیسے رسالے کا ایڈیٹر فرید ذکریا اپنی تجزیاتی صلاحیتوں کی بنیاد پر اس قدر پسند کیا جاتا رہا ہے کہ کچھ حلقے اسے امریکا کا آئندہ وزیر خارجہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے ہاں کیا کیفیت ہے۔

روزنامہ ''فلسطین'' کے نائب ایڈیٹر محمد یٰسین نے جوس میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''ہمارے ڈاکٹر یوسف حسن صاحب اس منزل سے گزر آئے ہیں۔ یہ سابق وزیر اطلاعات ہیں۔ بات آپ کی بالکل درست ہے۔ تجزیے درست ہوں تو قوم اور حکومتیں دونوں قدر کرتی ہیں۔''

یہاں شادی کتنی آسان ہے؟

میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پروٹوکول افسر عبیداللہ سے پوچھا۔ وہ مسکرایا، گناہ مشکل ہے، شادی آسان ہے۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ جن لڑکیوں کے ماں اور باپ اسرائیلی حملوں میں شہادت پا جاتے ہیں۔ وہ ایک دم سے قوم کی بیٹیاں ہو جاتی ہیں۔ ان سے جو لڑکا شادی کا پیغام دے تو حماس حکومت شادی کے سارے اخراجات خود برداشت کرتی

ہے۔ شہید کی بیٹی کے لیے اس عزت افزائی سے بڑا مثبت اثر پڑا ہے۔''

مجھے اس لمحے بری طرح احساس ہو رہا تھا کہ ہمارے 5 دن قاہرہ میں ضائع ہوئے۔ وہ یہاں صرف ہوتے تو غزہ کے لوگوں کو مزید جاننے کا موقع ملتا۔ آتے جاتے راستوں میں بازاروں میں جتنی بھی لڑکیاں نظر آئیں، ان کا لباس زیادہ ساتر اور ڈھکا ہوا تھا۔ مصر میں اسکارف بے شک عام ہے اور اچھا بھی لگتا ہے۔ مگر سینے پر دوپٹا لینے کا کوئی رواج ہی نہیں ہے۔ ٹائٹ شرٹ اور کسی ہوئی جینز کی پینٹ، پہننے والی کو جاذب تو ضرور بناتی ہے مگر اسے ڈھانپتی نہیں ہے۔ فلسطین کی لڑکیوں اور خواتین کا لباس بے حد اچھا لگا۔ یہاں اسکارف لینے والیوں کی تعداد سو فیصد تھی۔ جینز کی پینٹ کے ساتھ لمبی اور نسبتاً کھلی شرٹ پہنتی ہیں، یہاں لڑکیاں ہمیں زیادہ خوبصورت نظر آئیں۔

فلسطینی بچے ڈرتے کیوں نہیں؟

کتنے ہی برسوں سے ہم فلسطین کو ان کے بچوں کے حوصلے اور خطرناک ایڈونچر کی حد تک بے خوفی کے ساتھ اسرائیلی فوجیوں حتیٰ کہ ٹینکوں تک پر پتھراؤ کرتے اور اسرائیلی فوجیوں کی گولیوں کا براہ راست نشانہ بنتے دیکھتے آرہے ہیں۔

اسرائیل نے بھی مقبوضہ علاقوں خاص کر مجدو، حشارون اور عوفر کی جیلوں میں قید بارہ سے سولہ برس کی عمر کے چار سو بچوں کو لمبی قید کی سزائیں سنائی ہیں۔ 2013ء ہی میں اسرائیل نے ایک اور خطرناک پالیسی اختیار کی ہے کہ مارنے کی بجائے گرفتار کر کے والدین اور بچوں دونوں کو ڈرایا اور دھمکایا جائے۔ اس سال سات سو سے زائد بچے گرفتار کیے جاچکے ہیں اور یہ اکثر گرفتاریاں مظاہروں کے دوران عمل میں لائی گئیں۔ جیل میں بچوں کو اذیتیں دے کر ڈرایا دھمکایا جاتا ہے کہ وہ باہر نکل کر دوبارہ اسرائیل مخالف مظاہرہ کا حصہ نہ بنیں۔ عرب بچوں کے حقوق کی ایک تنظیم ''لیگل سنٹر عدالہ'' کے وکیل ریما ایوب نے گزشتہ دنوں بین الاقوامی میڈیا کو یاد دلایا تھا کہ عالمی قوانین کے تحت جیل میں قید بچوں کو تعلیم کے حق سے محروم نہیں رکھا جاسکتا۔ تعلیم بچوں کا بنیادی حق ہے۔ اسرائیل انھیں اس حق سے محروم رکھ رہا ہے۔

وزارت صحت کے فوٹو گرافر احمد یونس نے میرے استفسار پر بتایا آپ کو پتا ہے کہ اسرائیلی حملے کے بعد جب زخمیوں کے خون سے زمین گیلی ہوتی ہے، گری ہوئی دیواروں سے مٹی اڑ رہی ہوتی ہے اور والدین اپنے شہید ہو جانے والے بیٹے اور بیٹیوں کو گود میں لے کر بیٹھے آخری کلام کر رہے ہوتے ہیں۔ پہلا آدمی میں ہوتا ہوں جوان جگہوں پر پہنچتا ہوں، تب بھی جب ایک ہی حملے میں 250 سے زائد لوگ شہید ہو گئے تھے۔ کسی بھی جگہ، کسی ایک فلسطینی شہید بچے یا بچی کو

ہاتھوں میں اٹھائے اس کی ماں یا باپ نے یہ نہیں کہا کہ ہائے یہ کیا ہوگیا۔ لوگ شہدا کے وارثوں کو مبارک دیتے ہیں، ان کے گھروں پر کھانا دینے آتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا گھر باقی بچا ہو جس گھر سے کسی شہید کی میت نہ اٹھی ہو۔ ایسی مائیں تو کتنی ہیں کہ جن کے دو دو تین تین بچے شہید ہوئے اور وہ دل سے آرزومند ہیں کہ ان کے مزید بچے ہوتے تو وہ بھی قربان کر دیتیں۔ ایسی ہی ایک مثال ماں ام ندال ہیں جس کے تین بیٹے شہید ہوئے تھے۔ انھیں یہاں مثالی ماں مانا جاتا ہے۔ ان سے ملنے کا پروگرام تھا مگر ملاقاتوں کا شیڈول اتنا ٹائٹ رہا کہ جب غزہ سے رخصت ہوکر خاں یونس پہنچ گئے تو یاد آیا کہ ام ندال سے ملنا تو رہ گیا۔

میں نے سی پی ڈی ایس سنٹر فار پولیٹکل ڈویلپمنٹ اسٹڈیز کے خاموش طبع محمد محمود الحرثانی سے وزٹنگ کارڈ لیتے ہوئے پوچھا عجیب سا سوال ہے مگر میں اسے واپس ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتا۔ پوچھتے ہوئے جھجک سی ہے، اس نے میری طرف دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے کہا ''برادر آپ ہمارے مہمان ہو اور وہ بھی برادر ملک پاکستان سے، جہاں سے آنے والا یہ ایسا وفد ہے جو ہمارے لیے لفظوں سے زیادہ عملی طور پر کچھ کر رہا ہے۔ ہمارے ڈاکٹروں کی صلاحیتیں بڑھا رہا ہے۔ ہمارے مشکلوں میں گھرے مریضوں کے علاج کے لیے تربیت دے رہا ہے۔ میں نے لفظوں کو احتیاط سے استعمال کرتے ہوئے بالآخر وہ سوال کر ڈالا۔ جو مجھے مسلسل تنگ کر رہا تھا۔ اسرائیلی فوجی نوجوان ہیں اور کہا جاتا ہے بہت سخت دل اور اپنے ملک سے بلامشروط محبت کرنے والے۔ کسی بھی بات پر کسی بھی فلسطینی کو گولی مار دیتے ہیں۔ بوڑھوں، بچوں، عورتوں غرض جو سامنے آئے لحاظ نہیں کرتے۔ جلوس نکالے یا اس کے کریک ڈاؤن میں رکاوٹ بنے۔ ان سب سختیوں کے باوجود ان پر کبھی یہ الزام کیوں نہیں لگا کہ انھوں نے ریپ (Rape) کیا؟ یہ فعل عام طور پر مفتوحہ علاقوں میں فاتح فوجی ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

محمود الحرثانی کا جواب حیران کرنے والا تھا۔ ''اسرائیلی فوجی ہمارے لوگوں کے قریب نہیں آتے۔ وہ اپنے قریب جانے بھی نہیں دیتے یہاں تک کہ چیک پوسٹوں پر وہ دور سے چیک کرتے ہیں، کیمروں کی مدد سے، دوسرے مددگار آلات سے، وہ جانتے ہیں کہ یہ بے خوف لوگ ہیں۔ کسی بھی جگہ، کوئی بھی جان سے مار سکتا ہے۔ ان کے حملے اپاچی ہیلی کاپٹروں سے، بکتر بند گاڑیوں سے، F-16 سے یا دور مار میزائل سے ہوتے ہیں۔ ان کے فوجی شراب بھی پیتے ہیں اور ڈرگز بھی لیتے ہیں۔ یہ باتیں وہ تب بتاتے ہیں جب پکڑے جاتے ہیں۔

محمود نے بات جاری رکھی۔ ''غزہ ایک فیملی کی طرح ہے سبھی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ خدانخواستہ ایسا کوئی واقعہ ہونے کا امکان ہوتا تو لوگ اسے بے یارومددگار چھوڑ کر گھر نہ آجاتے۔'' جواب بالکل لاجواب کر دینے والا تھا۔ میں تب تک نئے سوال کے لئے اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا۔

''فلسطینی کہتے ہیں الخمر سے بحر تک ہمارا ہمارا ہے۔ اسرائیل انکار کرتا ہے، غزہ، ویسٹ بینک سے زیادہ وہ فلسطینی اتھارٹی کو دینے پر تیار نہیں ہے۔ کیسے مسئلہ حل ہوگا'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا کہ تھوڑی سی آزادی کے بعد القدس میں

رہنے والے صرف اسرائیلی ہوں گے۔ اسرائیلی وارالحکومت میں ابیب کا پرانا نام تل ابیبہ ہے۔ یہ القدس سے 150 کلومیٹر دور ہے۔ سفارتی حلقے ببانگ دہل آواز اٹھاتے ہیں کہ امریکا نے اپنا سفارت خانہ القدس کس چکر میں منتقل کیا ہے۔

القدس میں ابھی بھی جن فلسطینیوں کے گھر باقی ہیں۔ ان کو چالیس چالیس ملین کی آفر دی جارہی ہیں۔ ساتھ شرط بھی ہے کہ کوئی عرب اپنے گھر کی مرمت نہیں کرا سکتا۔ تبدیلی یا اضافے کی تو سوچے بھی مت، جب یہ گھر گر جاتا ہے تو دوبارہ بنانے کی اسرائیلی حکومت یہ اجازت ہی نہیں دیتی۔ وہاں اگر چھ ہزار فیملیز ہیں تو یوں چھ سو رہ جائیں گی اور پھر شاید چھ، سات یوں وہ سب کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ 20 لاکھ تو نکال چکے ہیں مگر بھی سچے ہیں اور ہمارا دعویٰ بھی، ہم نہیں تو ہماری اگلی نسلیں لڑیں گی۔ اپنا حق نہیں چھوڑیں گے۔

رئیس الجامعہ الاسلامیہ غزہ سے ملاقات

ہم یونیورسٹی کیمپس نہ گئے ہوتے تو کبھی غزہ کی زندگی کے اس روشن پہلو کا اندازہ ہی نہ کر پاتے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے۔ Seeing is believing، برس ہا برس سے اسرائیل کے ریاستی ظلم، جبر اور قہر سامانی کا سامنا کرنے والوں کی ہمت کا شاندار شاہکار ہمارے سامنے تھا۔ غزہ کی مین روڈ سے یونیورسٹی کے اندر داخل ہوئے تو ایک نئی اور وسیع دنیا ہماری منتظر تھی۔ ہمارے آنے کی اطلاع ہو چکی تھی۔ رائد احمد صالحہ ڈائریکٹر پبلک ریلیشن نے اپنے کمرے سے باہر آکر استقبال کیا۔ پھر قہوے کے ساتھ ساتھ بریف کرنا شروع کیا۔

ڈاکٹر کمالین کامل شعت، رئیس الجامعہ ہیں۔ ان سے ملاقات سے پہلے اس قدر شائستہ، متحرک اور غور وفکر کرنے والے استاد کا ایک ہلکا سا تاثر موجود تھا۔ ملائیشیا میں ہونے والی وائس چانسلرز کی کانفرنس میں ان کا بھرپور کردار تھا۔ جہاں پاکستان سے رفاہ یونیورسٹی اسلام آباد کے ریکٹر ڈاکٹر انیس احمد صاحب شریک ہوئے تھے۔

ہمارے ترجمان، پروٹوکول آفیسر عبید اللہ کے ساتھ اب پی آر آفس کے دو لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ طویل کوریڈور کے آخر میں ایک خصوصی لفٹ کا تالا کھولا گیا۔ یہ لفٹ صرف وائس چانسلر آفس تک جاتی ہے۔ تیسرے فلور پر واقع بہت بڑے آفس سیکرٹریٹ میں سے ہوتے ہوئے ہم شیخ الجامعہ کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ ایک سائیڈ پر جائے نماز بچھائے نماز ادا کر رہے تھے۔ ملاقات کا جونہی آغاز ہوا، لمحہ بھر میں ترجمان کی چھٹی ہٹ گئی۔ ڈاکٹر کمالین نرم لہجے میں بات کرنے والے ایک نفیس انسان ثابت ہوئے۔ انھوں نے مجھے اٹھایا اور دیوار پہ لگی تین تصاویر دکھانے لے گئے۔ ایک تصویر بیرک کی تھی۔ ''یہ ہماری یونیورسٹی کی ابتدا تھی۔'' دوسری تصویر انھوں نے دکھائی یہ ایک گری ہوئی عمارت کی تھی۔ ''ہم رات کو عمارت بناتے تھے۔ اسرائیلی صبح اسے ڈھا جاتے۔ نہ ہماری ہمت ٹوٹی، نہ انھوں نے اپنا معمول بدلا، ہمت اور مستقل مزاجی بہرحال جیت گئی۔ آج 70 شعبوں میں 450 سے زائد اساتذہ 22 ہزار طلبہ و طالبات کو اعلیٰ تعلیم دے رہے ہیں، یہ تیسری تصویر تھی۔''

22 ہزار! میں نے حیرت سے پوچھا جس میں بے یقینی ہی نہیں نہ ماننے والا احساس غالب تھا۔ تب انھوں نے پورے یقین سے کہا ''جی 22 ہزار۔ اور مزید

حیرت یہ کہ 62 فیصد لڑکیاں ہیں ان میں۔"

وہ پھر اٹھے، اپنی کرسی کے ساتھ سائیڈ ٹیبل پر سے یونیورسٹی کی تعارفی بک لیٹ یا پراسپیکٹس کہیے، اٹھا کر لائے، یہ بالکل ہی مختلف اور منفرد تھا۔ نہایت خوش شکل اور خوش نما ڈیزائن میں ایک خاص شکل میں کٹا اور کارڈوں پر چھپا ہوا۔ سپائرل بائنڈنگ نے اس کی کلاس ہی بدل دی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر کمالین یونیورسٹی کے تحت چلنے والے ایف۔ایم ریڈیو 91.5 اور الکتاب نام کے ٹی وی چینل کے صدر بھی ہیں۔ "الکتاب" وہی مقبول چینل جس کی پوری ٹیم ہی نوجوانوں پر مشتمل تھی اور جن سے ابھی چند گھنٹے پیش تر ہم مل کر آئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اب کے تیسری دفعہ اٹھ کر دفتر کی جنوبی سمت کی دیوار کی طرف بڑھے۔ ایک بے حد منفرد تصویر کا فریم ان کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ ملائیشیا وائس چانسلرز کانفرنس کی تصویر تھی۔ اس کی خوب صورتی فریم میں لگی دو تصویروں کا امتزاج تھا۔ ایک تصویر میں ڈاکٹر صاحب شیلڈ لے رہے ہیں۔ اس میں مہمان و میزبان کے تصویر 'کٹ آؤٹ' کے ساتھ اوپر والی سائیڈ پہ نمایاں تھی اور اس کے نیچے دوسری تصویر کانفرنس کے شرکا کا گروپ فوٹو تھا۔

ایسا لگ رہا تھا ہم برسوں سے ایک دوسرے سے متعارف ہیں۔ ملک کی نامور یونیورسٹیوں میں کام کرنے اور ان کے کلچر سے آگاہ ہونے کا تجربہ یہاں بے حد کام آیا۔ کتنی ہی باتیں قطار اندر قطار چلی آرہی تھیں۔ وہ بتا رہے تھے غزہ سے باہر گئے ہوئے ان اساتذہ کی تفصیل جو اعلیٰ ترین ڈگریوں کے حصول کے لیے یونیورسٹی کے اسکالرشپ پہ گئے ہوئے ہیں۔ نئے نئے ڈیپارٹمنٹس اور مستقل نوعیت کے کام۔ خصوصاً جب انھوں نے بتایا کہ یونیورسٹی کے اپنے زیتون کے باغات ہیں۔ ہمارے طلبہ و طالبات ان کا خیال بھی رکھتے ہیں اور روغنِ زیتون (Olive oil) بھی تیار کرتے ہیں۔ اسی دوران میں نہ چاہتے ہوئے اجازت لینے کے لیے کسمسایا۔ ہمیں دو بجے تک ہر صورت غزہ سٹی سے روانہ ہونا تھا۔ رفح بارڈر 4 بجے بند ہو جاتا ہے۔ قاہرہ سے آئی گاڑی وہاں ہماری منتظر تھی۔ تاکہ ہم کل FIMA مڈل ایسٹ کے سیمینار میں شریک ہوسکیں۔ ڈاکٹر کمالین نے اپنے معاونین کو اشارہ کیا۔ وہ ہمارے لیے خصوصی تحائف لے آئے۔ ان میں روغنِ زیتون کی ایک ایک بوتل بھی شامل تھی۔ یونیورسٹی کی مطبوعات تھیں، بیج تھا اور شیلڈز۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت محبّت سے معانقہ کیا، مصافحہ کیا اور دروازے تک چھوڑنے آئے۔ یہ ملاقات سب سے منفرد تھی۔

"ارادہ" کا وزٹ

وہاں سے نکل کر بٹ صاحب کے اصرار پر ترکی کے تعاون سے بننے والے شعبہ "ارادہ" (Will) کا وزٹ کیا۔ وہاں اسرائیلی بمباری سے آنکھیں کھو دینے والے قریباً 200 نوجوان لڑکے اور لڑکیاں داخل تھے۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر سیکھ رہے تھے۔ معذور ہونے والے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے پورا فلور الگ تھا۔ ترکی اساتذہ اور ماہرین سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ترکی وزیراعظم طیب اردگان کی تصویر اور "ارادہ" کی تحسین والی ایک فلیکس بھی آویزاں تھی۔ انتظار بٹ صاحب نے وہاں سے بے شمار تصاویر، فلسطینی سوونیئر خریدے جو ان معذور ہاتھوں نے بڑی مہارت سے مکمل اور خوب صورت بنائے تھے، تاکہ پاکستان واپسی پہ دوست احباب کو بطور تحائف دیے جاسکیں۔

یونیورسٹی سے واپسی پہ ایک بار پھر یہ احساس غالب تھا کہ قومیں اجتماعی طور پر زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیں تو ان کی ترجیحات بھی اسی طرح طے ہوتی ہیں اور نسلِ نو کی تعلیم و تربیت سے ہی یہ ممکن ہو پاتا ہے۔

حیران کن کلچر

22,000 طلبہ و طالبات سے بھری یونیورسٹی کے کلچر کا معاملہ یہ تھا کہ کسی درخت کے نیچے، کسی دیوار سے ٹیک لگائے کہیں کوئی "جوڑا" نہیں ملا۔ ہم بطور خاص یونیورسٹی کے اس حصے میں گئے۔ جہاں لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ وہ گروپس کی صورت میں یہاں وہاں بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ کوئی ایک لڑکی، لڑکوں والے حصے میں اور کوئی ایک لڑکا لڑکیوں والے حصے کی دیوار کی آڑ میں منتظر فون کرتا نہیں ملا۔ جمال ناجی الخفری چیئرمین بورڈ آف ٹرسٹیز جو ہمیں رخصت کر رہے تھے نے کہا "یہ کلچر بنانا آسان نہیں تھا، ہمیں کئی سال لگے، ہمارے بیٹے اور بیٹیاں اس سرزمین کے بچے ہیں۔ اپنے نفس کے غلام نہیں۔"

حماس کے لوگ اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی شادیوں کا اہتمام کروائیں۔ عام طور پر ایسی تقریبات کا جوڑے انتظار کرتے ہیں اور ذوق و شوق سے شریک ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد بحر صدر پارلیمنٹ کے ہاں

ڈاکٹر بحر، صدر پارلیمنٹ نے اپنے دفتر کے دروازے پر ریسیو کیا۔ خاص عربی انداز میں، جو ہم نے پہلے سربراہان مملکت کی ملاقاتوں میں ٹی پر ہی دیکھا تھا بہت اچھا لگا۔

ملاقات شروع ہوئی تو مجھے لگا اس مقام پر گفتگو کا رنگ ڈھنگ صحافتی انداز سے مختلف ہونا چاہیے۔ ہم پاکستان سے آنے والے پہلے لوگ ہیں، اسی کا اظہار ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر بحر نے بیٹھتے ہی جونہی دوبارہ سے اہلاً وسہلاً و مرحبا کہا تو میں نے ان کی طرف دیکھا اور کہنا شروع کیا۔ "ہم اہل پاکستان کی طرف سے محبّت اور سلامتی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔" ڈاکٹر بحر نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہمارے وزیراعظم اسماعیل ھنیا نے بھی آپ کے وفد کا بہت خیر مقدم کیا ہے۔ آپ کا آنا بہت مبارک ہے۔ ہمارے لیے بہت حوصلے کا باعث طویل محاصرے کے دنوں کے بعد سے یہ پہلا بین الاقوامی وفد ہے جو ہمارے مریضوں کے لیے اچھی خبر کی طرح آیا ہے۔

پھر انھوں نے کہا کہ "ہمیں بہت خوشی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ کھڑے ہیں، آپ کی دنیا میں بہت اہمیت ہے۔ آپ کی رائے کی بہت اہمیت ہے۔ ہم چاہتے ہیں جب یروشلم ہمیں حاصل ہو تو بھی آپ

ہمارے ساتھ کھڑے ہوں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یروشلم ہم اکٹھے جائیں۔''

اتنی دیر میں گفتگو کا ماحول بنتا دیکھ کر۔ میں نے سوال کر دیا ''اسرائیل کے مسلسل مظالم اور حملوں کے باوجود آپ نے اپنی قوم کو کیسے متحد کیا؟

ان کا جواب تھا۔''اس نے ہم پر 2008ء اور 2012ء میں بڑے حملے کیے۔ ایسے فاسفورس بم گرائے جنھوں نے فلسطینی بچوں کو ماؤں کے پیٹ کے اندر ہی مار دیا۔ یہ وائٹ فاسفورس تھی جو انھوں نے ہم پہ استعمال کی۔ ہم نے مقابلے کا جمہوری طریقہ چنا۔ اسرائیل اور اس کے حمایتوں کو یہ بھی پسند نہیں آیا۔ ہمارے عوام کا فیصلہ آنے کے بعد وہ ہم پہ حملے کرتے آرہے ہیں۔ ہمیں طویل محاصرے کے عذاب سے دوچار کیے رکھا۔ یہ ہماری زمین ہے، دنیا کے ہر قانون کے مطابق، اس کی حفاظت بھی ہمیں ہی کرنا ہے۔ اب ہم اس کی حفاظت ہاتھوں سے نہیں ہتھیاروں سے بھی کریں گے۔ ہم نے بہت صبر کر لیا، تبھی ہم نے آخری جنگ جیتی۔ لوگ ہمارے ساتھ ہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ لوگ جان گئے ہیں کہ عزت کے ساتھ جینے کا یہی راستہ ہے۔''

میں نے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب سنا ہے حماس گورنمنٹ نے نئی نسل پہ بہت توجہ دی ہے اور ہزاروں بچوں کو قرآن حفظ کرایا ہے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے اپنے بائیں طرف بیٹھے مہمانوں میں سے تیسرے مہمان سے تعارف کرایا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن سے ملیے یہ ہماری پارلیمنٹ کے رکن ہیں اور قرأت کے 9 لہجے جانتے ہیں۔ انہی کی قیادت میں بچوں کے اڑھائی ماہ کے کیمپ کرائے جاتے ہیں۔ ہر سال دس ہزار بچوں کے حفظ کا ہدف سامنے ہوتا ہے۔ اب تک ہم چالیس ہزار بچوں کو قرآن پاک حفظ کرا چکے ہیں۔ دینی تعلیمات، احادیث اور فقہی سبق الگ سے انھیں ازبر کرائے جاتے ہیں۔

اس موقع پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے جناب اسپیکر کی فرمائش پر قرآن پاک کی تلاوت بھی کی۔ ڈاکٹر احمد بحر نے کہا'' ہمارا ایمان ہے کہ آخری جنگ ہم نے اپنے ایمان اور یقین کی مدد سے لڑنی ہے۔ قرآن کا ساتھ ہوگا تو جیت بھی جائیں گے اور جنت میں بھی جائیں گے۔

خوش مزاج و خوش اطوار محمد عبیداللہ یہاں بھی ہمارے ترجمان تھے اور انھوں نے یہ حق خوب ادا کیا۔ جناب اسپیکر نے بٹ صاحب سے پوچھا'' آپ نے ہمارے ہاں کے ہسپتال وزٹ کیے۔ ڈاکٹروں کا معیار کیسا پایا؟'' ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ محنتی لوگ ہیں، کم وسائل میں بھی اچھا کام کر رہے ہیں، مزید علم اور مہارت کی ضرورت ہے۔ ہم ان شاء اللہ ان کو پوری مدد، رہنمائی اور تعلیم دیں گے۔ رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے ہمیں سفید فلسطینی اسکارف پہنایا۔

الجابری شہید

غزہ میں جس شخص کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ ایک عجیب افسانوی کردار لگتا ہے۔ وہ الاالقصام (حماس کا فوجی ونگ) کے نائب سربراہ تھے اور ان کا نام شیخ احمد الجابری تھا (قصام کے پہلے کمانڈر صلاح مصطفیٰ شاوہ کو آج تک کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ ان کے بیوی، بیٹا اور معاون 22 جولائی 2002ء کے

حملوں میں شہادت پا گئے تھے) غزہ سے رخصتی سے چند گھنٹے قبل ہمیں قبرستان جانے کا موقع مل گیا خیال تھا وہاں ان کی قبر کو دیکھیں گے، فاتحہ پڑھیں گے، حسنِ اتفاق سے حماس کے مرشد عام کی قبر بھی بالکل قریب ہی تھی۔ حماس کے بانی شیخ احمد اسماعیل یاسین کی قبر کے کتبے پر لکھا تھا''مرشد عام الماعہ اخوان الفلسطین وموسس حرکۃ المقاومۃ اسلامیہ، شہادت 22 مارچ 2004ء۔ شیخ اپنی جوانی میں فوجی تربیت کے دوران گرنے سے جسمانی طور پر معذور ہو گئے تھے۔ اسی معذوری میں انھوں نے پڑھائی مکمل کی۔ استاد بنے اور پھر فلسطین میں اخوان کے مرشد عام بنے اور اپنی زندگی میں بھی فلسطینی قوم کے اندر جہاد اور آزادی کا پارا بھر دیا۔ انھیں نماز فجر سے واپسی پر ہوائی حملے میں شہید کیا گیا۔ شیخ احمد الجابری کی قبر انہی کے ساتھ ہے۔ جب ہم ناحد نگاہ پھیلے قبرستان کے دروازے پر حیرت سے سوال بنے کھڑے تھے تو ایک جوان رعنا نظر آیا جو ایک کونے میں کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ ان سے تعارف ہوا، پتا چلا کہ احمد حماد صاحب ہیں وزارت داخلہ کے ڈائریکٹر جنرل اپنے والد کی قبر پر فاتحہ کے لیے آئے ہیں۔ وہ کمال مہربانی سے ہمیں شیخ احمد یٰسین اور احمد الجابری کی قبور تک لے گئے۔ وہاں ہم نے فاتحہ پڑھی اور واپسی کا قصد کیا۔ قبرستان میں ہر قبر کی شہید کی تھی۔ تمام کتبے کھڑے نہیں بلکہ قبر پر لٹائے گئے تھے۔

اسرائیلی فوج گیلاچ کا اغوا

شیخ احمد الجابری کی تصاویر غزہ میں جگہ جگہ آویزاں ہیں۔ انھوں نے اسرائیلی سرحد کے قریب کھڑے ایک اسرائیلی ٹینک پر سرنگ بنا کر حملہ کیا تھا۔ سارے فوجی مار ڈالے مگر ایک فوجی گیلاچ کو زندہ اٹھا لائے۔ اسرائیل نے ہر اس جگہ پر حملہ کیا جہاں اسے اندیشہ بھی ہوا کہ گیلاچ کو وہاں رکھا گیا ہوگا مگر یہ احمد الجابری کا پراجیکٹ تھا۔ اسرائیلی فوجی کو انھوں نے کس طرح زندہ رکھا۔ یہ یقیناً کوئی آسان کام نہ رہا ہوگا۔ 5 سال وہ فوجی لڑکا غزہ میں قید رہا، ایک وقت آیا کہ اسرائیل میں اس کی آزادی کے لیے ہنگامے شروع ہو گئے تو اسرائیل نے مصر کی مدد مانگی اور گیلاچ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مصری سفیر کو گیلاچ تک لے جانے کے لئے 13 کاریں بدلی گئیں۔ جونہی وہ آخری جگہ سے واپس ہوئے وہاں ہوائی حملہ کر کے اسرائیل نے بلڈنگ ہی اڑا دی تاکہ سودا بازی کے لیے حماس کے پاس وجہ ہی ختم ہو جائے۔ مگر یہ جان کر اسرائیلیوں نے اپنے سر پیٹ لئے کہ گیلاچ پھر بھی بچ گیا تھا کیونکہ وہ آخری جگہ پر تھا ہی نہیں۔ مصری سفیر سے اسے تیسری کار میں ملوا دیا گیا تھا۔ بالآخر اسرائیل کو اس ایک قیدی کے بدلے کئی سو قیدی چھوڑنے پڑے۔ ان میں سے وہ بھی تھے جو گزشتہ 30 برسوں

سے اسرائیلی جیلوں میں سڑ رہے تھے۔ M.5 کے نام سے غزہ میں بننے والے میزائل کا کریڈٹ بھی احمد الجابری کو دیا جاتا ہے۔ جس نے طاقت کا توازن ایک دم سے حماس کے حق میں پلٹ دیا۔

کتنی ہی نئی اور مختلف باتیں پہلی بار براہ راست فلسطینی لوگوں سے سننے کو ملیں تو کئی سوالوں نے جنم لیا۔ ان سب کا یکے بعد دیگر جواب ملتا رہا، مثلاً حماس نے نوجوانوں کے دل کیسے جیتے، تحریک مزاحمت کا ساتھ دینا کبھی بھی آسان نہیں ہوتا اور حماس پر قربان ہونے والے سارے قائد اور شہدا نوجوان تھے۔ نوجوان ڈر کر دور کیوں نہیں ہوئے۔ ایک مٹھاس بھری مسکراہٹ سے شیخ الصیام نے جواب کا آغاز کیا ''میں کتنی ہی ماؤں کو جانتا ہوں، جنہوں نے تین میں سے دو بیٹے شہادت کیلئے پیش کر دیئے، وہ ساری مائیں اور ان کے خاندان اس یقین سے سرشار ہیں کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کیلئے یہ کم سے کم قربانی تو دینا ہی ہوگی۔ آپ کے یہاں سید مودودی رحمتہ اللہ نے دین کا فہم عام کیا تو ہمارے ہاں حسن البنا رحمتہ اللہ کی سوچ اور اندازِ خدمت نے دل جیتے، بلدیاتی الیکشن جیتے تو حماس نے معاشرے کے غریب ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی مدد کی، جیلوں میں قید لوگوں کے گھر والوں کو سپورٹ کرنے کا پورا نظام بنایا۔ ہمارے بیٹوں اور بچوں نے اپنی خدمت سے معاشرے کے ہر طبقے کو ساتھ ملایا۔ انھیں اپنے کارواں میں شریک کیا۔ نوجوانوں کی صحیح تعلیم اور تربیت سے انہیں دین اور جہاد کے لئے وقف کیا۔ اپنے کام اور خدمت کو لوگوں سے منوایا، یہاں تک کہ الفتح کے لوگوں نے بھی سراہا اور ووٹ دیے۔

مسجد الاقصیٰ پر یہودیوں نے عام دنوں میں ٹکٹ کی مالیت اس قدر زیادہ رکھی ہوئی ہے کہ عام مسلمان افورڈ نہیں کر سکتا۔ حماس نے پورے فلسطین سے ہر جمعہ کو پچاس بسوں کا انتظام کیا، جو نوجوانوں کو مفت لاتی، لے جاتیں اور نماز جمعہ مسجد اقصیٰ میں پڑھنے کی سعادت اور موقع فراہم کرتیں۔ واپس جا کر جب لڑکے یہ بتاتے کہ ہم نے جمعہ اقصیٰ میں پڑھا ہے تو سننے والا حیرت سے پوچھتا، کیسے؟ تو جواب ملتا حماس والے لے گئے تھے۔ وہ فوراً اپنا نام درج کرا دیتا حماس والوں سے کہو کہ اگلے جمعہ کو مجھے بھی ساتھ لے کر جائیں۔ یوں یہ سلسلہ اور دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اثرات اور کام کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ اسرائیل کو اس پر بھی پابندی لگانی پڑی۔

میں ذاتی طور پر فلسطین کی سیاسی و سماجی زندگی کے کئی گوشوں سے بے خبر تھا۔ بائیس سالہ قبضے کے بعد اسرائیل نے غزہ کی پٹی سے اپنی بستیاں کیوں اٹھالیں۔ آبادکار واپس کیوں بلا لیے؟ اسکا جواب ایک نیا منظر دکھا رہا تھا۔ نئی حقیقت سمجھا رہا تھا۔ سات ہزار آبادکار یہودیوں کو بسانے کے بعد بائیس سال تک اسرائیل کو ان کی حفاظت کرنا پڑی۔ چودہ ہزار فوجی مسلسل اس ڈیوٹی پر فائز رہے ہیں۔ وہاں کی بجلی، پانی، گیس، فون ہر چیز پر بے شک انہی کا قبضہ تھا۔ یہودی اپنی خصلت ہی میں کنجوس ہیں۔ اس بوجھ کو کتنا عرصہ اور سہتے، سو ذلت کے ساتھ شیرون نے آبادیاں خالی کیں۔ خودکش حملوں اور اب M-75 میزائل کا خوف ان کی روزمرہ زندگی میں آسیب بن کر لٹکا ہوا ہے۔

■■■

آپ بھی اپنی عمدہ سوچ، اچھے مشاہدے اور گہرے مطالعے کی حامل تحریر کے ساتھ ''باتیں نئی، تحریریں نئی'' کا حصہ بن سکتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

باتیں نئی
تحریریں نئی

قفس تک آگئی
دیوارِ زنداں

کھلی فضاؤں اور کھلے در و دیوار سے ڈرے لوگوں کا تذکرہ لیکن ان کے پاس بھی مضبوط دلائل ہوں گے اگرچہ بظاہر تو یہی لگتا ہے صرف ماہ و سال بدلے ہیں۔ لوگوں کے خوف اور قلعہ بندی کی عادتیں پرانی ہیں

ابوالفضل محمود (چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، لاہور)

زمانے میں شہروں کے پرانے لوگوں کو قلعہ بند ہو کر رہنا پڑتا تھا کہ معلوم نہیں کب کوئی حملہ آور دھاوا بول دے اور مال تو جائے گا ہی، جان اور آبرو سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ شہر کے گرد فصیل کھینچ کر اس میں گرانڈیل قسم کے دروازے نصب کیے جاتے اور پھر ان دروازوں کی رکھوالی کے لیے حفاظتی حجرے اور ان میں پہرہ داروں کی گارد۔ دروازے سرِشام ہی بند کر دیئے جاتے اور پھر کوئی آزادانہ شہر میں داخل نہ ہوسکتا۔ قبائلی معاشروں کا اب بھی یہی حال ہے کہ مکان احاطوں میں ہیں اور احاطوں کے گرد اونچی اونچی دیواریں۔

تاہم نیا دور Suburbia کا زمانہ ہے۔ کھلی فضاؤں کا دور ہے۔ اونچی فصیلوں اور دیواروں کی گھٹن سے بیزار لوگ شہر سے الگ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریز اپنی مصلحتوں کی وجہ سے شہروں سے الگ کوٹھیاں بنا کر رہتے تھے جہاں نہ صرف ان کے آپس کے میل جول میں سہولت رہتی تھی بلکہ دیسی لوگوں سے 'مناسب فاصلہ' بھی قائم رہتا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی ہماری دیسی اشرافیہ بھی محلے میں مکان کی بجائے مضافات یا دوسری کھلی جگہوں میں کوٹھیاں بنا کر رہنے لگے۔ جن کے گرد دیوار

برائے نام یا سرے سے غائب ہوتی تھی۔ کیونکہ پرانی طرز کے مکانات تقسیم در تقسیم کی وجہ سے تنگ و تاریک ہو چکے تھے۔ جب کہ ان میں ہوا اور دھوپ کا گزر پہلے سے ہی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس وجہ سے ان میں مقید عورتیں اکثر بیمار رہتیں۔ چنانچہ شہروں کے آسودہ حال لوگ تنگ مکانوں سے نکل کر کوٹھیوں میں رہنے کو ترجیح دینے لگے جہاں کھلی ہوا کے علاوہ پھول پھلواڑی کی بھی گنجائش تھی۔ سنا ہے قیام پاکستان سے پہلے لاہور شہر میں نئی اور بہت خوبصورت بستی ماڈل ٹاؤن بسائی گئی تو اس کے مکینوں کو باؤنڈری وال بنانے کی اجازت نہ تھی کہ اس سے ہوا رکتی ہے۔ دیوار کی جگہ پھول اور نباتاتی باڑیں لگانے کی تلقین کی جاتی تھی۔ اب اسی ماڈل ٹاؤن میں ڈھونڈے سے بھی شاید ایسا کوئی مکان ملے جس کی باؤنڈری وال نہ ہو۔

عرصہ دراز کی بات ہے جب کراچی ابھی عروس البلاد سمجھا جاتا تھا، مجھے حکومت کینیا (افریقا) کے نہایت اعلیٰ مرتبہ افسر کو لانڈھی انڈسٹریل ایریا کا دورہ کرانے کی ذمہ داری ملی۔ ان دنوں ہماری کمپنی اس ملک کے چند شہریوں کی شراکت میں ممباسہ میں کارخانہ لگانے کے لیے گفت و شنید کر رہی تھی۔ ہم ایک کے بعد دوسرے کارخانے کے پاس سے گزرے جا رہے تھے کہ میرے مہمان کے ایک اچانک سوال نے چونکا سا دیا۔ پوچھنے لگا ''ان اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے کیا ہے؟'' ''کارخانے'' میں نے جواب دیا۔ تو یہ دیواریں کس لیے ہیں؟ اس نے پوچھا۔ تحفظ کے لیے، میں نے حیران ہو کر جواب دیا، کیا آپ کے ہاں حفاظتی دیواریں نہیں ہوتیں؟

''نہیں! ہمارا ملک اتنا امیر نہیں کہ اس قسم کے اخراجات برداشت کر سکیں، نہ ان کی کوئی ضرورت ہے، ہمارے ہاں ایسی دیواروں کے بغیر بھی سب ٹھیک ہے۔''

میں نے اس کی بات پر جتنا غور کیا اتنا ہی اس کی سچائی کا قائل ہوا۔ ہمارے ملک میں جتنا روپیہ اس مد (اونچی دیواریں اور آہنی گیٹ) میں لگا ہوا ہے، کھربوں سے کم کیا ہوگا۔ دیکھا جائے تو کیا اس سے سیکیورٹی کا معاملہ حل ہو گیا؟ آخر دوسرے ممالک ایسی دیواروں کے بغیر کام چلا ہی رہے ہیں اور ہمارے ہاں اس سب کے باوجود سیکیورٹی کی صورت حال ابتر ہے۔ اس مد میں لگے سرمایہ سے کتنے اور کارخانے، سڑکیں اور رفاہ عامہ کے ادارے قائم کیے جا سکتے تھے۔ لگتا یہ ہے کہ اس معاملہ میں دخل سیکیورٹی سے زیادہ ہماری نفسیات کو ہے۔ کیونکہ یہ دیواریں اور گیٹ اس وقت بھی تھے جب ہمارے امن و امان (یا یوں کہیے کہ بدامنی) کے حالات اب سے کہیں کم خراب تھے۔ ہمارا چوگردہ دیواروں کا کلچر بہت پرانا ہے۔

اگرچہ اس شخص سے بات ہونے سے پہلے کبھی اس نہج پر نہیں سوچا تھا۔ تاہم اب ایک طرف اس کی بات کی معقولیت اور دوسری طرف ہماری سطحی سوچ کھٹکنے لگی ہے۔ ہمارا معاشرہ اس سمت میں بہت دور جا چکا ہے۔ میرے ہمسایوں نے میرے اور اپنے درمیان صرف دیواریں حائل کرنے پر بس نہیں کی بلکہ ان دیواروں کو فلک تک لے گئے ہیں اور پھر ان پر ٹوٹی کانچ کا اضافہ مزید کر دیا ہے۔ یہ دیواریں اور کرچیاں ایک طرح سے ہمارے دلوں میں کھب رہی ہیں۔ جیسے ہندوستان نے اپنے اور ہمارے بیچ ایک برقایا ہوا سرحدی جنگلہ بصرف زر کثیر لگایا ہے۔ جیسے دیوار برلن مشرقی اور مغربی جرمنوں کے درمیان دیوارِ گریہ کی صورت حائل تھی۔ فرق یہ ہے کہ جرمنوں نے موقعہ ملتے ہی اس دیوار کا ایسا صفایا کیا

کہ نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ ہم ایسی دیواروں کو اور زیادہ اونچا کرنے کی دُھن میں رہتے ہیں۔

ہماری بستیوں نے اپنی گلیاں لوہے کے دیوہیکل، بھاری بھرکم گیٹ لگا کر بند کر رکھی ہیں۔ ان گیٹوں کے اندر مکان بھی قبائلی اور کابلی اسٹائل کے ہیں۔ اونچی فصیلوں والے قلعہ نما گھر، جناتی قسم کے گیٹ اور ان پر متعین 'سیکیورٹی گارڈ' لگتا ہے کہ ہماری سائیکی خول میں بند رہنے کی ہو چکی ہے۔ شہر پنجروں کے جھرمٹ لگتے ہیں۔ گویا ہم کھلی فضاؤں سے خوف کھاتے ہیں اور تاریکیوں میں پناہ ڈھونڈنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہماری مثال ایچ جی ویلز کی تصنیف 'ٹائم مشین' میں بیان کردہ اس جانور مخلوق کی سی ہے جو زیر زمین اندھیروں میں رہتی اور روشنی سے خوف کھاتی ہے۔ یہی تاریکی ہماری سوچ، ہمارے اخلاق اور زندگی کے بارے میں ہمارے مطمحِ نظر پر حاوی ہو چکی ہے۔

یہ سارا انتظام سیکیورٹی کے نام پر ہے۔ اس کا عذر (بظاہر معقول) ڈاکے اور چوری کی وارداتوں سے تحفظ ہے۔ لیکن زمینی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہ بندوبست وارداتیں روک سکا ہے؟ نہیں۔ تو کیا ان وارداتوں میں وقت کے ساتھ کچھ کمی آئی ہے؟ یہ بھی نہیں۔ تو کیا ان وارداتوں کے اضافہ میں کوئی ٹھہراؤ آیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔ اتنی تبدیلی البتہ آئی ہے کہ سیکیورٹی گارڈ ہماری زندگی اور رہن سہن میں ایک اہم عنصر بن چکے ہیں..... ایسا عنصر جس کے فائدے ہوں نہ ہوں لیکن نقصان ضرور ظاہر ہونے لگے ہیں۔ پہلے تو گارڈ فقط وارداتیوں کو مدد دیتے تھے اب وہ خود وارداتی بن رہے ہیں بلکہ مالکوں تک کو قتل کرنے کی نوبت آچکی ہے۔ ■■■

خاموش رہنے سے کلمہ شریف کا ذکر۔ درود شریف اور استغفار پڑھنا بہتر ہے

ہم نیک بنیں نیکی پھیلائیں

ہم انسانیت پسند اچھے مسلمان بنیں

کتاب: ہمارا اسلام قبول کرنا

نومسلم مردوں اور خواتین کے انٹرویوز

مولانا کلیم صدیقی صاحب

منشورات منصورہ۔ لاہور

042-35434909

طالبِ دعا: شیخ محمد عاطف پوری۔ اوکاڑہ

باتیں نئی
تحریریں نئی

دو بھائی

سائیکلوں کی مرمت کرنے والے دو بھائیوں کی سچی داستان
ان کی سوچ کی اونچی اُڑان نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا

شکیل احمد

وہ دو بھائی تھے اور دونوں سائیکل کی مرمت کا کام کرتے تھے۔ اس کام کے لیے انھوں نے ایک چھوٹی سی دکان بنائی ہوئی تھی۔ فرصت ہوتی تو دونوں کا بیشتر وقت اڑتے پرندوں کو دیکھتے گزرتا۔ کبھی کبھار اس پر بھی غور کرتے کہ آخر انسان پرندوں کی طرح اڑ کیوں نہیں سکتا؟

غور وفکر اور تبادلۂ خیال کا عمل آگے بڑھا تو انھوں نے اس کے لیے تجربات کرنے شروع کر دیئے اور ایک دن ''اڑان'' کا اعلان کر دیا۔

سردی کی اس صبح میدان میں لوگ بڑی تعداد میں جمع تھے۔ ہر ایک کو اشتیاق تھا کہ دونوں بھائیوں کے اس دعوے کو کہ وہ بھی پرندوں کی طرح فضا میں اڑیں گے، اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

بلاشبہ یہ انسانی زندگی کا ایک یادگار دن تھا جو جدید انسانی تاریخ کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ لکڑی اور کینوس کی مدد سے تیار کردہ دنیا کے اس پہلے ہوائی جہاز کے ذریعہ فضا کا پہلا تجربہ محض ''بارہ سیکنڈ'' کی مختصر پرواز تھی۔ اس مختصر پرواز کے دوران ایک بھائی (اورویل رائٹ) نے چالیس گز کا فاصلہ طے کیا اور یہ پرواز اتنی آہستہ تھی کہ اس کا بھائی (ولبر رائٹ) اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔

اسی روز بعد میں ایک اور تجرباتی اڑان میں دوسرے بھائی نے 89 سیکنڈ میں 284 گز (852فٹ) کا فاصلہ طے کیا۔ میدان میں موجود ہر شخص نے یہ محسوس کیا کہ اب انسانی زندگی پہلے جیسی نہ رہے گی اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

انسانی تاریخ کی پہلی پرواز کا تجربہ کرنے والے ان دونوں بھائیوں کی زندگی میں ہی ہوابازی نے اس قدر ترقی کی کہ جیٹ انجن تیار ہوگیا اور فوجی ہوا بازی اور تجارتی پروازوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹے سے جہاز سے فضاؤں میں اڑان کا یہ سفر اس طرح آگے بڑھا کہ اب اس بات کو بھی کئی عشرے گزر گئے ہیں۔ انسان نے چاند کی سطح پر بھی قدم رکھ لیا ہے۔ سفر کے اس تسلسل میں آج جو خلائی جہاز مریخ کی جانب بھیجے گئے ہیں ان کی رفتار 39 ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ فضاؤں سے آگے بڑھ کر خلا میں سفر کا یہ سلسلہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے اور کسے معلوم ہے کہ آئندہ چند برسوں میں انسان کے لیے اس سفر کے ذریعہ خلا میں مریخ یا اسی طرح کے کسی دیگر سیارہ میں قیام بھی ممکن ہو جائے۔

سائیکلوں کی دکان والے رائٹ برادران معمولی پس منظر کے مالک تھے لیکن انھوں نے غور وفکر، تدبر، مستقل مزاجی اور دور بینی سے کام لیا تو انسانی زندگی کو ایک نیا رخ عطا کر گئے۔ درحقیقت انسانی زندگی میں کامیابی کی یہی کلید ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اس وسیع و عریض دنیا میں انسان کے علاوہ کتنی ہی دوسری مخلوقات ہیں۔ ان میں سے کتنی ہی مخلوقات انسان کے مقابلہ میں قوت، طاقت اور بعض اوقات جسامت میں مالدار ہیں۔ بصارت، قوت، سماعت اور اسی طرح دیگر بہت سے امور میں انسان کے مقابلے میں بہت سے جاندار زیادہ باصلاحیت ہوتے ہیں۔ تاہم انسان کو جس بنا پر اشرف المخلوقات قرار دیا گیا ہے۔ وہ اس کو دی گئی عقل وفہم ہے۔ عقل وفہم کی بنا پر ہی انسان اس قابل ہے کہ وہ دوسرے تمام جانداروں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے استفادہ کر سکے۔

اسی بنا پر انسانوں میں بھی درحقیقت وہی لوگ آگے بڑھتے اور کامیاب ہوتے ہیں جو غور وفکر اور تدبر سے کام لیتے ہیں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ غور وفکر اور تدبر کا عمل اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اسلام کی آفاقی تعلیمات کے تناظر میں ہو تو انسان محض مادی بنیاد پر ہی ترقی کرتا بلکہ ترقی کا یہ عمل ایک ایسا جامع عمل ہوتا ہے جس میں انسانوں کو سکون اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

آج اہل ایمان کو غور وفکر، تحقیق، تدبر اور علم وجستجو کا راستہ اختیار کرنے پر توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ انسانیت کو حقیقی سکون و راحت میسر آسکے۔ یہی وہ تناظر ہے کہ جس میں حدیث رسول ﷺ میں حکمت کو مومن کی متاع گم گشتہ قرار دیتے ہوئے، اسے تلاش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں بھی انسانوں کو مخاطب کر کے بار بار غور وفکر اور تدبر کی جانب توجہ دلائی گئی ہے تو اس کا منشا بھی یہی ہے۔

درحقیقت فہم وفراست، حکمت، دور بینی و دانائی وہ خوبیاں ہیں جن سے کام لے کر انسان دنیا و آخرت دونوں جگہ کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ ■■■

باتیں نئی
تحریریں نئی

بیک بینچرز

نجیب عمر

ایک استاد کا ماجرا اس کی سوچ میں تبدیلی کا باعث ایک بیک بینچر تھا

میں نے پرنسپل کی حیثیت سے جب اس اسکول کا چارج لیا تو میری سب سے زیادہ توجہ اساتذہ پر تھی۔ کسی اسکول کی کارکردگی کا انحصار اساتذہ پر ہوتا ہے کیونکہ وہ علم کی میراث آئندہ نسل میں منتقل کرتے ہیں۔

ڈگری اور تعلیم کے لحاظ سے تو سارے استاد خوب تھے لیکن استاد کی قابلیت قدرے مختلف چیز ہوتی ہے اور ان کی کارکردگی اُسی قابلیت کی مرہون ہوتی ہے۔

اسکول کے تمام معاملات کو یکے بعد دیگرے دیکھنے کے بعد ضرورت کے مطابق تبدیلی لا کر سارے نظام کو میں نے موثر بنا لیا تھا لیکن استادوں کا معاملہ ذرا وقت طلب تھا۔ باری باری ہر استاد کو فوکس میں لے کر یہ دیکھنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا کہ کون میرے معیار کے مطابق بالکل صحیح ہے، کس میں کمی ہے اور کون نا قابل قبول ہے۔

اس دوران میں عبد القادر صاحب نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ انتہائی کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔ ایسے لوگوں سے تعامل میں کچھ دشواری پیش آتی ہے لیکن یہ میرے فرائض میں شامل تھا لہٰذا میں اپنی جستجو میں لگا رہا۔

وہ نویں اور دسویں کلاس کو حساب پڑھاتے تھے۔ انہیں اس کا طویل تجربہ تھا۔ ان کی صلاحیت میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ لیکن میں نے استاد کی جس قابلیت کا ذکر کیا ہے وہ ان میں میری توقع سے بھی زیادہ تھی۔ بلکہ مجھے اپنی ساری زندگی کی معلمی اور مدرسی کا تجربہ کم محسوس ہونے لگا۔ ایک پرنسپل کی حیثیت سے میں اس کا اظہار نہیں کرسکتا لیکن میں ان کی تعریف کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔

میرا طریقہ کار یہ تھا کہ میں کلاس کے دوران پچھلے بینچوں پر بیٹھ جاتا اور استاد کی کارکردگی کا بغور مطالعہ کرتا رہتا۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ چند استاد

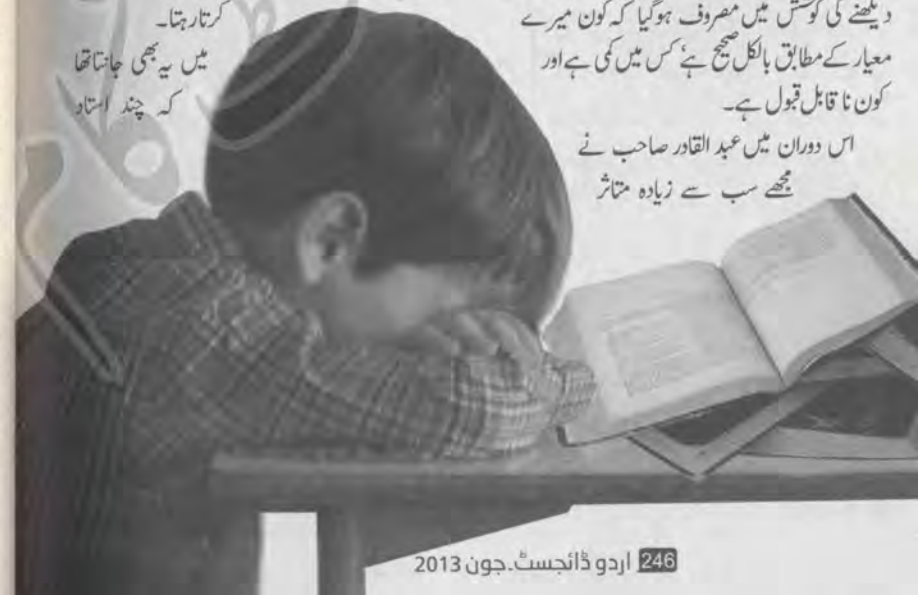

میرے اس طریقۂ کار کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن اپنی نا پسندیدگی کا اظہار نہیں کرسکتے تھے۔

عبد القادر صاحب کے علاوہ اسکول کے تمام استادوں کو ان طلبہ کی طرف زیادہ ملتفت پاتا جو کلاس میں صلاحیت کے لحاظ سے سب سے آگے ہوتے۔ بہت تھوڑے سے متوسط طلباء کی طرف نظر کرتے جب کہ کمزور اور پس ماندہ (تعلیمی لحاظ) کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں دیتا۔

جب کہ عبدالقادر صاحب نہ صرف کمزور طلباء پر توجہ دیتے بلکہ انہیں اس وقت تک چین نا آتا جب تک وہ انہیں پوری کلاس کے برابر نہ لے آتے۔ وہ اگلا سبق اس وقت تک شروع نا کرتے جب تک کلاس کا ایک ایک طالب علم پچھلے سبق پر حاوی نہ ہوجاتا۔ چونکہ ان کے پاس ایک پیریڈ کا محدود وقت ہوتا لہٰذا انہوں نے ایک اور طریقہ وضع کیا کہ ایک کمزور طالب علم اور ایک ذہین طالب علم کی جوڑی بنادی اور اس طرح کلاس کے ذہین طلبہ اپنے کمزور ساتھیوں کی کمزوری دور کروانے میں لگے رہتے۔ اس کا دوہرا فائدہ ہوتا۔ اوّل درجے کے طلبہ میں اعتماد پیدا ہوتا کہ وہ پڑھا سکتے ہیں کیوں کہ کسی دانشور نے کہا ہے کہ پڑھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ پڑھایا جائے اور پڑھانے کے لیے اس موضوع پر عبور حاصل کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے۔

عبد القادر صاحب کے اس طریقۂ کار کو میں نے دوسرے اساتذہ کے لیے مثال بنانے کی کوشش کی لیکن جس خلوص اور جذبے سے عبد القادر صاحب کام کرتے تھے دوسروں کے پاس اس جذبے اور خلوص کی کمی تھی لہٰذا نتائج مختلف ہوتے۔

حساب ایک ایسا مضمون ہے جس میں طلبہ زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرسکتے ہیں۔ بورڈ کے امتحانات میں ہمارے اسکول کے تقریباً نصف طلبہ حساب میں سو فیصد نمبر حاصل کرتے تھے اور باقی بھی 90 فیصد کے قریب قریب نمبر حاصل کر لیتے۔ یہ سب کچھ عبد القادر صاحب کے دم سے تھا۔ ان کی محنت کا ثمر بلکہ محنت سے بڑھ کر اس خلوص اور لگن کی بنا پر جو ان کا خاصہ تھا۔

وہ دسویں کلاس کو حسب معمول حساب پڑھا رہے تھے، بلکہ طلباء کو بورڈ کے امتحان کی تیاری کروا رہے تھے۔ میں داخل ہوا اور پانچ منٹ کا وقت طلبہ سے گفتگو کے لیے ان سے مستعار لیا۔ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی اور خود پچھلے بینچ پر جا بیٹھے۔

میں طلبہ سے مخاطب تھا۔ ”زندگی گزارنے کے لیے حساب کا جاننا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ لیکن سبجیکٹ (Subject) کے طور پر حساب پڑھ کر آپ اپنا شمار دوسری قسم کے لوگوں میں کرواتے ہیں۔ میرے نزدیک دنیا میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو حساب نہیں پڑھتے اور دوسرے وہ جو حساب پڑھتے ہیں۔ اس کا اثر آپ کی شخصیت، آپ کے طریقہ کار حتیٰ کہ آپ کے مزاج پر بھی پڑتا ہے۔ حساب کا مضمون تمام تر اصول اور کلیات کے گرد گھومتا ہے خواہ وہ جیومیٹری ہو، الجبرا ہو، کیلکولس ہو یا اس کی کوئی شاخ۔ یعنی حساب داں لازمی طور پر اصول پسند ہوتا ہے۔

ہمارے اس مضمون سے اور بھی کئی گہرے رشتے ہیں۔ حساب کو موجودہ شکل تک لانے میں مسلمانوں کا بڑا حصہ ہے۔ دنیا کو صفر کا تصور اسی برصغیر نے دیا جس پر آج اس کی عمارت کھڑی ہے۔

آپ خوش نصیب ہیں کہ حساب کے طالب علم ہیں اور اس سے بھی بڑی خوشی یہ کہ عبد القادر صاحب

آپ کے معلّم ہیں۔ ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا آپ کا کام ہے۔

ایک روز چھٹی ہوگئی تھی۔ تمام استاد جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے عبدالقادر صاحب کو روک لیا۔ وہ متجسّس نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔ انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی تعریفوں سے خوش نہیں ہوتا' من آنم کہ من دانم''۔

''میں بھی بے جا تعریف کا قائل نہیں''۔ میں نے جواب دیا۔

میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بہتر نتائج کے لیے ہمیں اپنی مساعی میں اور کیا شامل کرنا چاہیے؟

میری سنجیدگی کو بھانپتے ہوئے' معمول سے ہٹ کے ذرا کھل کر بات کی۔ وہ گویا ہوئے۔ ''آج طلبہ میں یکسوئی کا شدید فقدان ہے۔ وہ کلاس میں موجود ہو کر بھی کلاس میں نہیں ہوتے۔ ان کے دماغ میں بیک وقت کئی قسم کی کھچڑی پک رہی ہوتی ہے اور وہ ذہنی انتشار کا شکار ہوتے ہیں لہٰذا وہ کلاس کی کارروائی صد فیصد قبول نہیں کرتے۔ اگرچہ استعداد کی کمی بھی ایک عنصر ہوسکتا ہے لیکن اگر ہم طلبہ میں مکمّل یکسوئی پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو بہتر نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ میں ایک مثال سے اپنی بات واضح کرتا ہوں۔ جیومیٹری کی کلاس میں اقلیدس کا ایک تھیورم دائرے سے متعلق پڑھا رہا تھا۔ بلیک بورڈ میں دائرہ بنا ہوا تھا۔ تین مرتبہ دہرانے کے بعد بھی آدھی کلاس اس تھیورم کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

میں تھیورم چھوڑ کر بچوں سے مخاطب ہوا کہ اگر اس وقت ساری کائنات تمہارے لیے سمٹ کر اس دائرے میں آجائے۔ تمہیں دائرے کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آئے حتیٰ کہ کلاس اور میں بھی غائب ہوجاؤں۔ یعنی اس درجے کے ارتکاز کی ضرورت ہے۔

جب بچوں نے میرے مشورے پر عمل کیا تو نتائج بہت بہتر تھے۔ اس روز عبدالقادر صاحب کو گفتگو پر آمادہ دیکھ کر میں نے پوچھ ہی لیا کہ آپ کے اس جذبے اور لگن کا محرک کیا ہے؟

وہ خاموشی سے دور خلاؤں میں گھورنے لگے اور ایک وقفے کے بعد گویا ہوئے۔

''میں بھی عام استادوں کی طرح ایک استاد تھا۔ میں اپنا کام ایمانداری سے کرتا لیکن مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ طلبہ کتنا قبول کرتے ہیں اور کتنا نہیں۔ خصوصاً بیک بینچرز سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ ان میں ایک نوجوان خورشید بڑا ہی خوبصورت، روشن روشن چہرے والا لیکن پڑھائی میں اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ امتحان میں وہ بری طرح فیل ہوا اور رزلٹ والے دن ہی اس نے خودکشی کر لی۔ جوان بچّے کی موت سے گھر میں کہرام بپا تھا۔ اسکول کی نسبت سے میں بھی جنازے میں شریک تھا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ ظاہر ہے میں خورشید کو واپس نہیں لاسکتا تھا لیکن میں نے تہیّہ کر لیا کہ آئندہ کسی خورشید کو غروب نہیں ہونے دوں گا۔''

اس کے بعد میری خصوصی توجہ ان پچھلی نشستوں پر ہوتی ہے۔ میرے لیے انتہائی ہمت افزا بات ہے کہ تھوڑی سی توجہ اور کلاس کے ذہین لڑکوں کے ساتھ جوڑی بنانے کے بعد نتائج خاطر خواہ ظاہر ہوئے۔

میں نے کہا ایک خورشید نے آپ کو راہ دکھادی۔

بولے: نہیں بلکہ اس نے مجھے میرے فرائض یاد دلائے۔ استاد روحانی باپ ہوتا ہے اور ایک باپ اپنے بچوں سے کیوں کر غافل ہوسکتا ہے۔

■■■

انسانی شخصیت پر

پیلے رنگ کے اثرات

سٹڈی روم میں پیلا رنگ کیوں ضروری ہے اور بچوں کے کمرے میں کیوں جلدی غصہ دلاتا ہے

احمد نعیم چشتی۔ پاکپتن

☆زرد رنگ خزاں کے پتوں کا رنگ ہے جو بڑھاپے، بزدلی، گرم جوشی کے ساتھ ساتھ خوشی، دھوپ، موسم گرما اور دھوکے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

☆انگریزی زبان میں 'Yellow' روایتی طور پر بزدلی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے اور American Slang میں بزدل آدمی کو Yellow بھی کہا جاتا ہے۔

☆اٹلی میں Crime Stories کو 'Yellow' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ 1930 میں جب کرائم ناول کی پہلی سیریز شائع ہوئی تو ان کے کور پیلے رنگ کے ہوتے تھے۔

☆تھائی لینڈ کے تھائی سولر کیلنڈر میں 'Yellow' کو سوموار کے دن کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ سوموار کا دن تھائی لینڈ کے بادشاہ کی پیدائش کا دن سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے سوموار کو پیلے رنگ کا لباس کوئی بھی شخص پہن سکتا ہے۔

☆'Yellow Journalism' (زرد صحافت) کی اصطلاح ایسی صحافت کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو جذبات ابھارنے، حقائق کے بگاڑنے یا حقائق کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتی ہے۔

☆امریکا کے دو اخبارات Joseph Pulitzer کا نیویارک ورلڈ، اور W.R.Hearts کا نیویارک جرنل، ایسی

رپورٹنگ کرتے تھے۔ (خاص طور پر Spanish American جنگ کے دوران۔ یہ اصطلاح اس مضمون سے لی گئی جس کا نام 'The Yellow Kid' تھا یہ مضمون ان دونوں اخباروں میں شائع ہوتا تھا۔

☆فٹ بال اور ہاکی کے کھیل میں ریفری کھلاڑی کو وارننگ دینے کے لیے پیلا کارڈ دکھاتا ہے۔

☆امریکی فٹ بال میں ریفری پینلٹی دینے کے لیے پیلا جھنڈا گراؤنڈ میں پھینکتا ہے۔

☆Auto Racing میں جہاں پیلا جھنڈا دکھایا جاتا ہے وہاں سے کاریں ایک دوسری کو اوورٹیک نہیں کرسکتیں۔

☆کچھ ممالک میں ٹیکسی کا رنگ پیلا ہوتا ہے، یہ پریکٹس شکاگو سے شروع ہوئی تھی جہاں ٹیکسی تیار کرنے والے John D.Hertz نے ٹیکسی کو پیلا رنگ دینا شروع کیا تھا۔ اس نے یونیورسٹی آف شکاگو کی تحقیق سنی کہ پیلا رنگ زیادہ فاصلے سے نظر آجاتا ہے۔ کچھ ممالک میں اسکول کی بسوں کو پیلے رنگ میں تیار کیا جاتا ہے تاکہ سڑک پر واضح نظر آئیں اور حادثے سے محفوظ رہیں اور کہا جاتا ہے کہ اسکول کے بچوں کا موڈ بھی اچھا رہتا ہے۔

☆پیلا ربن خواتین استعمال کرتی تھیں جو اس بات کی علامت ہوتا تھا کہ ان کے شوہر جنگ سے زندہ بچ کر واپس آجائیں گے۔

☆مصر میں زرد رنگ سوگ منانے کو ظاہر کرتا ہے، لیکن جاپان میں زرد رنگ جرأت کو ظاہر کرتا ہے۔

☆کہا جاتا ہے کہ پیلا رنگ غصے اور Frustration کے جذبات بھی ابھارتا ہے۔ اگر کمرے میں پیلا رنگ دیواروں پر کیا گیا ہے تو وہاں لوگ جلد غصے میں آئیں گے اور وہاں بچے نسبتاً زیادہ روئیں گے۔

رنگ اور ان کے معنی

لال رنگ کو خطرے کی علامت سمجھا جاتا ہے

نیلا رنگ گہرائی اور وسعت کو ظاہر کرتا ہے

کالا رنگ احتجاج اور سوگ کو ظاہر کرتا ہے

جامنی رنگ روحانیت کا رنگ ہے

سبز رنگ امن اور سکون کا رنگ ہے

سفید رنگ شفاف اور پاکیزگی کی علامت سمجھا جاتا ہے

(مریم نور۔ لاہور)

☆زرد رنگ انسان میں توانائی ابھارتا ہے اور بھوک کو بھی ابھارتا ہے۔

☆یونانی ثقافت میں زرد رنگ اداسی کو ظاہر کرتا ہے اور فرانسیسی ثقافت میں "حسد" کو ظاہر کرتا ہے۔

☆سٹڈی روم کے لیے زرد رنگ بہتر سمجھا جاتا ہے کیونکہ زرد رنگ دماغ کو تیز کردیتا ہے۔

☆Yellow Pages کی اصطلاح ان صفحات کے لیے بولی جاتی ہے جو ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اشیا اور خدمات کو دکھانے کے لیے مختص ہوتے ہیں۔

☆انڈیا میں زرد رنگ کسانوں کی علامت ہے اور بہار کا تہوار منانے کے لیے زرد رنگ میں لوگ ملبوس ہوتے ہیں۔

☆زرد رنگ جلد نظر آنے والا رنگ ہے اور یہ رنگ لوگوں کی توجہ بھی جلدی حاصل کرلیتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ رنگ ٹریفک سگنلز اور اشتہاروں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ رات کو سوتے وقت پیلے رنگ کی چادر اوڑھنے سے مچھر نزدیک نہیں آتے۔ ■■■

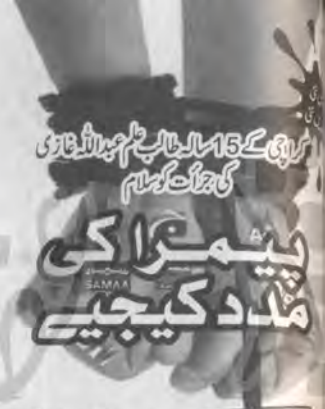

طیب حنیف ایڈووکیٹ

آج آئی ٹی کا زمانہ ہے۔ ہم برائی کو روکنے کا کسی رنگ زبان سے اختیار رکھتے ہیں اور ہم ایمان کے بہتر درجے پر فائز ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم پاکستان جیسے اسلامی ملک میں رہتے ہیں اور یہاں پی ٹی وی، جیو، ہم، وقت، ڈان، اے ٹی وی، سما، اے آر وائی، سٹار پلس اور اس کے علاوہ دیگر مختلف چینل کام کر رہے ہیں۔ اگر ان میں غیر اخلاقی اور اسلامی نظریہ پاکستان کے خلاف کوئی چیز دکھائی جا رہی ہے تو وہ پاکستانی قانون پیمرا آرڈیننس کے تحت جرم ہے اور اس کی سزا متعین ہے۔

جی ہاں! ہم www.pemra.gov.pk ویب سائٹ پر جا کر یا complaints@pemra.com پر ای میل کے ذریعے شکایت Complaint کر سکتے ہیں اور غیر اخلاقی پروگرامز کو بند کرنے کے حوالے سے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی ویب سائٹ غیر اخلاقی اور اسلامی نظریہ کے خلاف مواد پر مشتمل ہے تو آپ اس کو بھی بلاک کرانے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حکومت پاکستان نے آئی ٹی سے متعلقہ حوالے سے کسی بھی قسم کی شکایت درج کرانے کے لیے ٹال فری نمبر 0800-73672 بھی دے دیا ہے جس پر آپ مفت کال کر کے یا اپنے دوستوں کے ذریعے کرا کے، نہ صرف خود کو بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کو بے غیرتی اور بے راہ روی سے بچا سکتے ہیں۔

ایسا نہ ہو کہ ہمارے بچے جن کو محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کا کردار ادا کرنا تھا، وہ میر جعفر اور میر صادق کا کردار ادا کرنے پر فخر محسوس کرنے لگیں۔ بھارت اور یورپ کی تہذیب کے ایسے دلدادہ بیوروکریٹ پیدا نہ ہونے لگیں جو مسلمانوں کے قاتل ہندو یاتریوں کے جوتے پالش کر کے غیرت اور حمیت کا جنازہ نکال دیں۔ پھر ایسی بے حیا اور بے غیرت تہذیب کے گن گانے والے گورنر پیدا ہونے بھی بعید از قیاس نہیں، آسیہ مسیح جو ہمارے پیارے نبی ﷺ کو گالیاں بکنے سے باز نہ آئی، کے حق میں پریس کانفرنس کرنے لگیں اور اسلامی قانون کو گندگی اور کالا قانون کہنے پر بھی شرم محسوس نہ کریں۔

سورۃ اخلاص کو دیکھ کر نہ پڑھ سکنے والوں میں جب وزیر داخلہ پاکستان جیسے لوگ ہوں تو ایسی قوم کا پھر خدا ہی حافظ ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قصور ان کا اتنا نہیں جتنا ہمارے نظام تعلیم کا ہے اور ان اداروں کا جہاں اسلامیات پڑھائی ہی نہیں جاتی۔ اگر اسلامیات پڑھائی جاتی ہے تو پھر اسلام نہیں پڑھایا جاتا۔

میں کراچی کے 15 سالہ طالب علم عبداللہ غازی کی جرأت کو سلام پیش کرتا ہوں جس نے دھمکیوں کے باوجود بے حیائی اور فحاشی کے خلاف پیمرا کو انٹرنیٹ پر سیکڑوں فحش ویب سائٹس بند کرنے کی نشاندہی کی ہے اور پیمرا کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ قاضی حسین احمد (مرحوم) سابق امیر جماعت اسلامی کو بھی خراج تحسین پیش کرتا ہوں جنھوں نے سپریم کورٹ میں فحاشی کے خلاف رٹ دائر کی تھی۔ ■■■

دلھن بیتی

آج کسٹرڈ بنا لینا

ایک نئی نویلی دلھن کے پی ایم اے کاکول میں گزرے ابتدائی دنوں کا ماجرا۔ان کے لئے خاص جن کی شادی کسی فوجی سے ہونے والی ہو، ان کے لئے بھی جنھوں نے کبھی کسی فوجی سے شادی کی تھی یا آجکل کسی فوجی کی بیگم ہونے پر نازاں ہوں، یہ وقت سب پر آتا ہے۔

غزالہ محمود

شادی کے پانچویں روز ہم صاحب بہادر کے ساتھ ایبٹ آباد پی ایم اے کاکول پہنچ گئے۔ جہاں صاحب بطور پلٹون کمانڈر تعینات تھے اور غزنوی 4 اُن کے زیر تربیت تھی۔

ہمارا گھر پی ایم اے کے اندر ایم آئی روم کے ساتھ تھا۔ ایک چھوٹی سی پرانی طرز کی ہٹ (Hut) تھی۔ ہم نے گھونگھٹ اٹھایا اور ذرا حالات کا جائزہ لیا۔ حالات خاصے حوصلہ افزا تھے۔

پہلا ہفتہ تو سیر و تفریح میں گزر گیا۔ کھانا ہم میس سے کھاتے تھے۔ اگلے ہفتے باضابطہ طور پر قید شریعت میں آ جانے کے آثار ظاہر ہوئے۔ صاحب نے میس کے کھانے میں نقص نکالنے شروع کر دیئے۔

ہم نے فوراً کھانے کے ذائقے اور خوشبو کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کر دیئے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ذائقے کی حس سے کافی حد تک نا آشنا ہونے کے باوجود یہ کھانا ہمیں اچھا نہیں لگتا تھا اور ہم محض زہر مار کرنے کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔

بالآخر صاحب نے ہمیں کھانا پکانے کا حکم دیا۔ شام کو خراماں خراماں سبزیاں، گوشت اور مرغیاں وغیرہ خرید لائے۔ گوشت کے علاوہ مسالے، دالیں، آٹا، بیسن، یعنی سارا راشن اِکٹھا کیا گیا۔ کچن سیٹ کیا گیا اور ہم نے پورے جوش و خروش سے کھانا پکانے کی مہم کا آغاز کیا۔

ہمارے چیف معاون ہمارے بیٹ مین صاحب تھے جو گھر کے احمقانہ ماحول میں

Added Attraction

مصداق بالکل انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ تھے۔ ن کے چہرے پر جیومیٹری کے سارے زاویے بڑی خ دلی سے استعمال ہوئے تھے۔ بولتے تھے تو لگتا تھا ہار ہے ہیں اور ہنسنے پر ہنہنانے کا شبہ ہوتا تھا۔

چلیے اب شکل پر کیا تبصرہ کریں۔ اصل مسئلہ ان کی ن تھی۔ شکل پر موسلا دھار حماقت برستی تھی اور براہٹ کے عالم میں چہرے پر ہوائیاں اڑنے کی ے آندھیاں چلنے لگتیں۔

حسن کلام کا یہ عالم تھا کہ مخاطب گوش بر آواز ہو کر ئی انہماک سے بھی سنتا تو ان کی بات سمجھنے سے مر رہتا۔

حلق سے ایک فریاد نما آواز بلند ہوتی تو مخاطب سر پر سے صاف گزر جاتی۔ ادھر ہماری یہ کیفیت کہ ی ضبط کرنے سے قطعی معذور تھے۔ ہماری ہنسی ایک شار کی طرح لبوں سے پھوٹتی۔ ہماری اس مشہور زمانہ سے ہماری امّی اس قدر عاجز تھیں کہ اگر گھر میں حکہ خیز حُلیے کا کوئی مہمان وارد ہوتا تو ہماری والدہ کوئی لینے کو ہرگز تیار نہ ہوتیں اور ہمیں آنکھوں ہی نھوں میں باعزت طور پر ڈرائنگ روم سے نکل جانے کم صادر فرما دیا جاتا۔

اب چونکہ ہم گھر کے مالک اور مختار تھے لہٰذا اب نسی پر کون پابندی لگا سکتا تھا؟

ادھر بیٹ مین صاحب برآمدے میں آ کر فرماتے یا منگوانا ہے۔

اُدھر ہمارے لبوں سے ہنسی کا فوارہ چھوٹتا اور ہم مے سے بھاگ کر ڈرائنگ روم میں پناہ لیتے اور پیٹ کر خوب ہنستے۔ بخدا ہم خود سمجھنے سے قاصر تھے کہ ف کا اندازِ کلام اور حلیہ اس قدر مضحکہ خیز کیوں ہے؟

اگر کبھی ایمر جنسی میں کچھ منگوانا ہوتا اور ہمیں اچانک اس بلائے بے درماں کا سامنا کرنا پڑتا تو ہم آبشار کی طرح امنڈ نے والی ہنسی کو کھانسی اور چھینکوں کی شکل میں خارج کرتے۔

آخر تنگ آ کر اس صورت حال کا ہم نے یہ حل نکالا کہ سودے کی چٹ بابا جی کو تھما دیتے۔

بابا نے ہمیں بچپن سے پالا تھا اور وہ اعزازی مشیر کے طور پر ہمارے گھر میں تعینات تھے۔ ”بابا جی نے بیٹ مین موصوف کو ”گھوڑا“ کا خطاب مرحمت فرما دیا تھا اور اکثر دونوں سودے کے حساب پر برسرِ پیکار رہتے۔

بابا جی کی چولیں بھی خاصی ہلی ہوئی تھیں اور گھوڑا صاحب تو خیر عقل کی نعمت سے یکسر محروم تھے۔ دونوں حساب کتاب کے مسئلے پر نبرد آزما رہتے۔ مسئلہ یہ تھا کہ بابا جی خود کو ماہر سیاسیات، ماہر معاشیات اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے تھے اور مدِ مقابل کو ہر میدان میں زیر کرنے کے جنون میں مبتلا رہتے۔ ادھر گھوڑا صاحب معاشیات کے اصولوں سے قطعی نابلد تھے۔ انہیں غالباً دو کا پہاڑا بھی نہیں آتا تھا۔ ہر رقم کے آگے ایک آدھا فالتو صفر لگانے یا اڑانے کو وہ ہرگز مائنڈ نہیں کرتے تھے۔ انھیں نوٹ سو کا دیا جاتا اور حساب وہ دس روپے کا دیتے۔

اگر ذرا پوچھ گچھ کی جاتی تو ایسی ایسی بامحاورہ قسمیں اٹھاتے کہ انسان لرز کر رہ جاتا۔ لہٰذا انھیں روپے دیتے وقت دو چار گواہوں کا ہونا اشد ضروری ہوتا۔

گھوڑا صاحب نے بابا جی کی سول ڈکٹیٹر شپ کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے مخصوص فوجی انداز سے میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔

خیر صاحب، ان معاونین کے ساتھ ہم نے سولو فلائٹ کا آغاز کیا۔

صاحب صبح دفتر جاتے ہوئے کہتے۔" آج کسٹرڈ بنا لینا، بہت دنوں سے سویٹ ڈش نہیں کھلائی تم نے۔" بوٹوں کے تسمے باندھتے ہوئے انہوں نے فرمائش کی۔

دیکھیے گاجر کا حلوہ ہم نے کل بنایا تو تھا۔ ہم نے احتجاج کیا۔

اچھا وہ گاجر کا حلوہ تھا۔ وہ چونکے...... اچھا خیر چھوڑو! آج براہ مہربانی کسٹرڈ ضرور بنا لینا۔

"آپ بھی کوئی کام کی ڈش بتایا کیجیے۔ کسٹرڈ ہمیں اچھا نہیں لگتا اور نہ ہم نے کبھی بنایا ہے۔" ہم نے بیزار ہو کر کہا۔

کسٹرڈ تو سب سے آسان سویٹ ڈش ہے۔ بس دودھ میں چینی اور کسٹرڈ پاؤڈر گھولنا ہے۔ مقدار کا تناسب ڈبے پر لکھا ہو گا۔ صاحب نے جلدی جلدی ترکیب بیان کی اور دفتر روانہ ہو گئے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا بڑے اہتمام سے تیار کیا۔ کسٹرڈ بنا کر ڈونگے پر چاندی کے ورق بھی لگا دیئے۔

کھانا کھا کر صاحب نے کسٹرڈ پیالے میں نکالا اور ایک چمچ چکھ کر گھبرا کر چھوڑ دیا کچھ عجیب ذائقہ ہے۔

کیا پسند نہیں آیا آپ کو؟ اتنی محنت سے کسٹرڈ پاؤڈر اور چینی دودھ میں گھولی تھی پھر چاندی کے ورق بھی میں نے اتنی چاہت سے لگائے۔ آپ پھر بھی خوش نہیں ہیں۔

"تو کیا چولہے پر پکایا نہیں تھا؟" انہوں نے مشکوک نظروں سے ہماری جانب دیکھا۔

پکانے کو آپ نے کب کہا تھا؟

ہم برا مان گئے۔

انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر ڈش ایک طرف سرکا دی۔

"گوشت بالکل کچا ہے۔ کچر کچر کر رہا ہے۔"

لقمہ چکھ کر وہ روہانسے ہو رہے تھے۔

ترکیب میں تو یہی لکھا ہے کہ دس منٹ گلا کر بھون لیں ہم نے ڈھیٹ بن کر کہا۔

"بھئی چکھ تو لیا کرو وہ بے بسی سے بولے۔" یہ انہوں نے کب لکھا تھا کہ چکھنا ضروری ہے۔ ان کم بخت مصنفوں کو اتنی عقل تو ہونی چاہیے کہ یہ بات وضاحت سے لکھ دیا کریں۔ ہم نے برتن سمیٹتے ہوئے کتاب کے مصنف کو بے نقط سنائیں اور میاں کے لیے ایک انڈہ فرائی کر لائے۔

ایک دن انہوں نے کھانے کے وقت ڈونگے کا ڈھکن سرکا کر بڑے اشتیاق سے پوچھا!

یہ کیا ہے؟

"حلیم" ہم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

لنچ میں حلیم؟ انہوں نے بغور جائزہ لیا۔

لیکن مجھے تو اس میں گوشت بھی نظر نہیں آ رہا۔

آپ تو ہمارے پکائے ہوئے ہر کھانے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں گویا ہم نے زہر ملا دیا ہو گا۔ آپ کا بس چلے تو ہمارا پکا ہوا کھانا بلی کتوں کو کھلا دیں۔ ہم نے پوری رفتار سے زبان چلائی۔

برا مت مانو بی بی، میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا کہ اتنی جلدی حلیم بنانے کا نسخہ کہاں سے سیکھ لیا آپ نے؟

حلیم بنانا کون سا مشکل کام ہے؟ دال پکا رہے تھے ذرا زیادہ گل گئی۔ ہم نے چار پانچ مزید دالیں گلا کر اس میں حل کر دیں۔ کل کے چاول بچ گئے تھے، ڈال دیئے۔ پرسوں کے آلو گوشت کی دو بوٹیاں بچی پڑی تھیں، وہ بھی گرائنڈر میں پیس کر ڈال دیں۔ اب

بتائیے کہ حلیم کے اجزاء پورے ہوئے یا نہیں؟ ہم نے بڑے فخر سے تفصیلات بیان کیں۔

او خدایا! اٹھاؤ اس ملغوبے کو، جس نے بھی کھایا زندہ نہیں بچے گا۔ مجھے انڈہ فرائی کر کے لا دو وہ روہانسے ہو کر اُٹھ گئے۔

"یہ ملک شیک سے لہسن پیاز کی بو آ رہی ہے۔" صاحب نے فرمائش کر کے ملک شیک بنوایا تھا۔ ایک گھونٹ پی کر گلاس رکھ دیا۔

"اب کیا ہم ملک شیک میں لہسن پیاز ڈالنے لگے؟ آپ نے ہمیں پاگل سمجھ لیا ہے کیا؟" ہم برا مان گئے بلکہ حسب توفیق مشتعل ہو گئے۔ "دماغ تو خیر میرا بھی خراب نہیں ہے۔ تم خود پی کر دیکھ لو۔"

انہوں نے گلاس ہماری طرف سرکایا۔ انداز کچھ ایسا تھا کہ مصلحت آڑے آ گئی ورنہ گلاس اٹھا کر منہ پر مار دیتے کیونکہ آنکھوں میں صاف صاف خون اتر آیا تھا۔

اچھا اب یاد آیا۔ دراصل چوپر خراب تھا۔ ہم نے لہسن پیاز بلینڈر میں پیس لیا تھا ہم نے شرما کر اعتراف کیا۔

"ہر وقت افسانوں کے پلاٹ سوچتی رہتی ہو۔ عملی زندگی میں بھی کچھ دلچسپی لیا کرو۔ یہ رگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے کے سوا بھی کچھ آتا ہے تمہیں؟"

وہ زہر اگل کر اُٹھ گئے اب اس سے بڑھ کر ہماری عزت افزائی اور کیا ہو سکتی تھی۔ تو صاحب گھر داری کا باقاعدہ آغاز ہوتے ہی ہم پر یہ سنگین حقیقت منکشف ہوئی کہ سارا آنگن سراسر ٹیڑھا ہے اور ہمیں اس آنگن میں ناچنے کے لیے بغیر کسی تیاری کے روانہ کر دیا گیا ہے۔

اب حماقتوں اور بدحواسیوں کا لامتناہی سلسلہ تھا اور ہم تھے۔ کبھی گوشت کچا رہ جاتا، کبھی مرچیں زیادہ جھونک دیتے اور کبھی سالن میں نمک زہر ہو جاتا۔ مسالوں کے توازن اور تناسب کا ہمیں شعور ہی کب تھا؟

روز کھانا کھاتے وقت صاحب کے چہرے کے زاویے بگڑنے لگتے۔ ہم معصوم بنے کھانا کھاتے رہتے مگر شاباش ان کے صبر پر کہ لقمے زہر مار کر کے اُٹھ جاتے۔ کبھی کبھار ہلکی سی سرزنش کر دیتے تو ہماری آنکھوں میں برساتیں امنڈ آتیں۔

ان ہی دنوں ہماری امی بھی ہماری گھر داری کا معائنہ کرنے آئیں اور بے دریغ صلواتیں سناتی ہوئی چلی گئیں۔

"بس اب غزلیں بگھارو، افسانے بھونو اور شعروں کا تڑکا لگا کر گزارا کرو۔ مجھے پہلے ہی اندازا تھا۔ گھر کا لڑکا ہے، شرافت کے مارے چپ ہے کوئی اور ہوتا تو دوسرے روز چلتا کر دیتا۔"

اب ہمارے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ کسی بھی ہمسائی کی خدمات حاصل کریں کیونکہ اب صاحب کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہونے کو تھا۔ ہنی مون کے دن تیزی سے بیت رہے تھے۔ سنگین حقائق کے لب بام آنے کا وقت آ گیا تھا۔ ہماری ہمسائی ایجوکیشن کور کے کیپٹن اعظم کی اہلیہ تھیں۔ انتہائی سگھڑ، شفیق اور مہربان قسم کی خاتون تھیں۔

ایک دو ملاقاتوں میں اُنھوں نے ہمارے خانگی حالات کا جائزہ لیا اور پھر وہ ہماری معصومیت اور بھولپن پر اس شدت سے نثار ہوئیں کہ ان کی شفقت، محبت اور دلار سے ہم نے انہیں آپا کا خطاب دے دیا اور ان کے سایہ عاطفت میں زانوئے ادب تہ کیے بغیر ہی خانہ داری کی ٹریننگ حاصل کرنے لگے۔

ہماری گھر داری کی ابتدائی کلاسز کا آغاز ہوا تو ہمارا

ککر فوبیا ایک وبال ثابت ہوا۔ ایک مرتبہ ہمارے کچن میں ککر پھٹا تھا اور خانساماں غریب کا چہرہ ابلتے سالن سے جھلس گیا تھا۔ بس اس روز سے ہم نے کچن کو گویا اوجڑی کیمپ سمجھ لیا تھا جہاں کسی بھی لمحے دھماکہ ہوسکتا تھا۔ خیر آپا نے ہمارے سارے شُبے دور کیے اور ہمیں سارے مراحل کی تربیت دی ورنہ شروع میں ہماری یہ حالت تھی کہ ادھر ککر کی سیٹی بجنی شروع ہوئی اور ادھر ہم کچن سے فرار ہوگئے اور جب پریشر ریلیز ہوجاتا تو ہم سر پر کفن باندھ کر کچن میں قدم رنجہ فرماتے۔ آپا نے بڑے آرام اور تحمل سے سمجھایا۔ وہ بہت کفایت شعار اور سلیقہ مند قسم کی خاتون تھیں۔ ہمیں بھی اس قسم کی ہدایات دیتی رہتیں ”بھئی اگر رات کو سالن بچ جائے تو صبح اس کو پیڑوں میں گوندھ کر کچوریاں بنا لیا کرو۔ اگر گوشت کا شوربہ بچ جائے تو اس میں چاول ڈال کر دم دے دو، فی الفور پلاؤ تیار۔“

غرض یہ کہ آپ ایک ایسا امرت دھارا تھیں کہ ہر مرض کا تیر بہدف علاج بتا دیا کرتی تھیں۔ کوئی بھی مسئلہ درپیش ہوتا، آپا اس کا ایسا مناسب حل تجویز کر دیتیں کہ ہم اَش اَش کر اٹھتے۔ ان کی مہربانیوں کے طفیل ہم دو تین ماہ میں اس قابل ضرور ہوگئے تھے کہ گوشت گلا کر اس میں کوئی سبزی ڈال کر بھون بھان کر سالن تیار کر لیتے۔

امی تو ہماری کارگزاریوں سے خوب آگاہ تھیں لیکن اگر ہمارے سسرال والوں میں سے کوئی آجاتا تو ہمارے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ ہم آنکھوں میں آنسو لئے فریاد کناں ہوتے آپا اب میں کیا کروں۔ میری ساس بڑی نازک مزاج ہیں اور کھانے پینے کے سب شوقین ہیں۔ میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا صرف صاحب ہی نوش فرما سکتے ہیں۔ بھئی تم فکر مت کرو، کھانا میں تیار کر دوں گی۔ تم بیٹ مین کو بھیج کر دیگچے منگوا لینا آپا بڑی شفقت سے کہتیں۔

یُوں ہمارے گھروں کے درمیان دیگچے رواں دواں رہتے اور ہمارا بھرم رہ جاتا۔ آج بھی جب اُن فرشتہ صفت آپا کا خیال آتا ہے تو آنکھوں میں نمی آجاتی ہے۔

آج نفسانفسی کے دور میں ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ آج کے دور میں تو پڑوسیوں کو ایک دوسرے کی عیب جوئی اور نکتہ چینی سے فرصت ہی نہیں ملتی اور ایک گھر کی کمزوریاں نمک مرچ لگا کر دوسرے گھروں تک پہنچائی جاتی ہیں۔

ہمارے زمانے میں خاص طور پر فوج کے ماحول میں پڑوسیوں کا اتنا اتفاق ہوا کرتا تھا کہ ایک گھر کا مہمان مختلف گھروں میں چائے یا لنچ پر مدعو ہوتا۔ یہ مہمان نوازی فوج کی وہ حسین روایت ہے جو آج مہنگائی کے دور میں بھی موجود ہے۔ آپ ایک فوجی کے گھر میں وقت بے وقت بھی چلے جائیں حسب موسم آپ کو ٹھنڈا مشروب یا چائے کی گرم پیالی مع پکوڑے یا بسکٹ ضرور پیش کی جائے گی۔

فوجی گھرانوں میں بالکل برادری یا خاندان جیسا مربوط ماحول نظر آتا ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں یہ لوگ بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے ہیں۔

محبت اور اخوت کا یہ خوبصورت رشتہ ہمیں کسی اور سیٹ اپ میں نظر نہیں آتا۔

خیر صاحب! آپا نے حق ہمسائیگی کچھ اس انداز سے ادا کیا کہ آج بھی ہمارے دل کی کتاب پر ان کا نام پہلے صفحے پر رقم ہے۔ ■■■

موساد کے لیے محفوظ گھر

”را“ کے سربراہ پر الزام ہے کہ انھوں نے خفیہ فنڈ استعمال کرتے ہوئے جعلی فرموں کے ذریعے ”موساد“ کے لیے محفوظ گھر خریدے اور فنڈز کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے ذاتی پراپرٹی کے انبار لگائے

پروفیسر محمد فاروق قریشی

بھارتی دہشت گرد سربجیت سنگھ جو کوٹ لکھپت جیل میں سزائے موت کا قیدی تھا اور سزائے موت کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ جھگڑے میں شدید زخمی ہوگیا تھا، زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔ کیا یہ لڑائی محض اتفاقاً ہوئی یا کسی طے شدہ سازش کا نتیجہ تھی؟ بھارتی میڈیا پر الزامی پروپیگنڈہ زور و شور سے جاری ہے جس میں آئی ایس آئی اور لشکر طیبہ کو سربجیت سنگھ کی موت کا ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ بھارت میں یہ ایک فیشن بن چکا ہے کہ ہر حادثے اور واقعے کا الزام پاکستان کی حکومت یا ایجنسیوں پر لگا دو اور کوئی قابل ذکر پارٹی یا رہنما الزام تراشی کی اس جنونی مہم میں دوسروں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ یہ ایک ایسا سستا سودا ہے جس کو بھارت کی حکومت اور اپوزیشن کا ہر رہنما گلا پھاڑ کر بیچتا ہے اور داد و تحسین کی صورت میں قیمت وصول کرتا ہے۔ سربجیت سنگھ پر حملے کے جواب میں مقبوضہ کشمیر کی جیل میں پاکستانی قیدی ثناء اللہ پر اس قدر مہلک حملہ کیا گیا کہ اس کی موت واقع ہوگئی۔

لیکن یہ صرف تصویر کا ایک رخ ہے۔ اس کا دوسرا رخ بھارتی رہنما نہ خود دیکھنا چاہتے ہیں نہ اپنے عوام کو دکھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ بھارتی مارکیٹ میں اس کی وہ قیمت ہرگز نہیں مل سکتی جس کے وہ خواہش مند ہیں۔ افضل گرو کی پھانسی کے فیصلے میں بھارتی سپریم کورٹ نے اعتراف کیا کہ اس کے خلاف کوئی براہ راست شہادت پیش نہیں کی گئی لیکن بھارت کے اجتماعی ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے اسے موت کی سزا دی جا رہی ہے۔ کیا اس کو انصاف کہا جا سکتا ہے؟ بھارت کے کئی اہل الرائے دانشوروں نے اس فیصلے کی کھل کر مذمت کی ہے۔ لیکن بھارتی حکومت خوش ہے کہ آنے والے انتخابات میں انتہا پسند ہندوؤں کے ووٹ

حاصل کرنے کے لیے ان کی ٹوپی میں ایک سُرخاب کے پر کا اضافہ ہو چکا۔ سربجیت سنگھ کی موت پر بھارت کے ایک دفاعی تجزیہ کار روہت شرما کی یہ سنسنی خیز رپورٹ بھارتی دانشوروں اور میڈیا پنڈتوں کے لیے قابل توجہ ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "بھارت کی خفیہ ایجنسیوں نے عوام کی توجہ چین اور بھارت کے درمیان سرحدی تنازعہ سے ہٹانے کے لیے لاہور میں سربجیت سنگھ پر اپنے کسی ایجنٹ کے ذریعے حملے کروایا ہے اور وہ اپنے اس مقصد میں کافی حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔"

بھارت کے ہفت روزہ جریدے "انڈیا ٹوڈے" کی ایک حالیہ اشاعت میں بھارت کی خفیہ ایجنسی "را" کے خفیہ فنڈز کے استعمال میں کرپشن کی ایک کہانی شائع ہوئی ہے۔ یہ کہانی "را" اور اسرائیلی خفیہ ایجنسی "موساد" کے درمیان تعاون و اشتراک پر مبنی ہے۔

جس میں "را" کے سابق سربراہ آنند کمار ورما پر الزام لگایا گیا ہے کہ 1987ء سے 1990ء کے دوران جب وہ "را" کے سربراہ تھے، انھوں نے جعلی فرموں کے ذریعے کروڑوں کے خفیہ فنڈز سے "موساد" کے لیے نئی دہلی میں محفوظ گھر خریدے اور خفیہ فنڈز کا غلط استعمال کرتے ہوئے اپنے لیے غیر قانونی جائیداد کا انبار لگایا۔ یہ الزام "را" کے ایک سابق افسر آر۔ ایس۔ یادیو نے 1996ء میں دہلی ہائی کورٹ میں آنند کمار ورما پر لگایا۔ انھوں نے دہلی اور بنگلور میں خریدی گئی ان آٹھ جائیدادوں کی فہرست اپنی درخواست کے ساتھ منسلک کی جن کا ورما مالک تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب ورما کی آمدنی تین لاکھ سے بھی کم تھی انھوں نے کروڑوں کی جائیداد کیسے بنالی۔ تاہم یادیو کی یہ درخواست کہ ورما کی جائیداد کی تحقیق کی جائے، عدالت نے 1996ء میں مسترد کر دی۔ لیکن یادیو نے ہمت نہیں ہاری۔

انھوں نے معلومات حاصل کرنے کا حق استعمال کرتے ہوئے 2005ء میں ورما کے خلاف ثبوت اکٹھے کر لیے اور 2009ء میں تازہ مقدمہ دائر کر دیا۔

اس رپورٹ کے مصنف سندیپ پونی تھن نے "را" کے اس خفیہ آپریشن سے پردہ اٹھایا ہے جس کی منظوری اس وقت کے وزیراعظم راجیو گاندھی نے دی تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح "را" نے دو کمپنیوں کو خریداری کے لیے فرنٹ مین کے طور پر استعمال کیا اور "موساد" کے افسر اعلیٰ کے لیے گھر خریدے۔ "را" کے رازدانوں کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ "موساد" کے ایجنٹ کی پردہ پوشی کے لیے کیا گیا تاکہ اسرائیل کی خفیہ ایجنسی "موساد" نئی دہلی میں اپنی کارروائیاں خفیہ طور پر جاری رکھ سکے۔ کیونکہ اس وقت یہودی ریاست کے ساتھ ہندوستان کے سفارتی تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے لیکن دونوں کے درمیان سراغ رسانی کے میدان میں تعاون و اشتراک کا رشتہ موجود تھا اور ان کے آپس کے معاملات کسی تیسرے ملک میں طے کیے جاتے تھے۔ 1980ء کے عشرے کے آخری برسوں میں "را" نے موساد کے ساتھ قریبی تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے 1988ء میں دو تجارتی کمپنیوں 'پائی اوئن انوسٹمنٹ' اور 'ہیکٹر بزنگ اینڈ فنانس کمپنی' کا قیام عمل میں لایا گیا جو بظاہر معدنیات، آٹو موبائلز، کپڑے، دھاتوں اور فیچر فلموں کے کاروبار میں مصروف تھیں لیکن درحقیقت "را" کے سینئر افسران دی بالا چندرن اور بی رامن ان کے ڈائریکٹر کے طور پر کام کرتے رہے۔ مارچ 1989ء میں "را" کی پیشکار جعلی کمپنیوں نے نیو دہلی کی ہیلے روڈ پر ایک رہائشی عمارت میں دو فلیٹ خریدے۔ ان دونوں فلیٹوں میں "موساد" کے مقامی سربراہ 1989ء سے 1992ء تک رہائش پذیر رہے۔ ذرائع کے مطابق موساد کے ایجنٹ کے

پاس ارجنٹائن کا پاسپورٹ تھا اور وہ "را" کے ساتھ خفیہ معلومات کا تبادلہ کرتا تھا اور خفیہ کارروائیوں کے لیے اپنی ماہرانہ تجاویز پیش کرتا تھا۔ ایک اہم معاملے کو، جس میں جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ نے ایک اسرائیلی سیاح کو اغوا کر لیا تھا نمٹانے میں اس نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ جے کے ایل ایف کے جنگجوؤں نے جون 1991ء میں سری نگر میں ایک مکان نما کشتی پر حملہ کیا جس کو چھے اسرائیلی سیاحوں نے کرائے پر لیا ہوا تھا۔ مقابلے میں ایک حملہ آور مارا گیا۔ ایک سیاح جس کو اغوا کر لیا گیا تھا، ایک ہفتہ بعد رہا کر دیا گیا۔ جے کے ایل ایف کے ساتھ مذاکرات کا سارا عمل ایک اسرائیلی سفارت کار موشے یگار اور موساد کے ایک نامعلوم ایجنٹ نے مکمل کیا۔ ہندوستان اور اسرائیل کے درمیان مکمل سفارتی تعلقات 1992ء میں قائم کیے گئے۔

آنند کمار ورما نے ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ جعلی کمپنیوں کے ساتھ اس کا تعلق محض پیشہ ورانہ فرائض کی ادائی تک تھا۔ جی رامن کہتے ہیں 'بعض اوقات سراغ رساں اداروں کو اپنی کارروائیوں کے لیے پیشکار کمپنیاں وجود میں لانی پڑتی ہیں۔ ہم نے جو کچھ کیا حکومت کی منظوری سے کیا اور وزیراعظم راجیو گاندھی اور ان کی کابینہ سیکرٹری کو مکمل طور پر باخبر رکھا۔" ورما کا کہنا یہ ہے کہ ان کے خلاف الزامات یادیو کی انتقامی کارروائی ہے کیونکہ یادیو اور اس کے 80 ساتھیوں کو 1980ء میں "را" کے ملازمین کی "یونین" بنانے کی پاداش میں ملازمت سے معطل کر دیا گیا تھا۔ یادیو اور اس کے ساتھیوں نے نہ صرف ہڑتال کی بلکہ لودھی روڈ ہیڈ کوارٹر میں سینئر افسران کا گھیراؤ بھی کیا۔ حکومت نے خفیہ اداروں کے ملازمین کا یونین بنانے کا حق ختم کر کے اس تحریک کو ختم کر دیا۔ یادیو کو 1989ء میں ورما کی سربراہی کے دور میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

ورما کے مطابق یادیو نے اپنی برطرفی کا الزام اس پر لگایا تھا۔ ورما کا کہنا ہے "یادیو 1991ء میں اس کے بیٹے دیپک کے آفس میں آیا اور دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کی بحالی کے لیے وزیراعظم کو خط نہ لکھا تو وہ میرے خاندان کے خلاف جنگ لڑے گا۔"

اس کے برعکس یادیو تردید کرتا ہے کہ یہ اس کا ذاتی مقدمہ ہے۔ "میرا اعتراض صرف خفیہ فنڈز کے غلط استعمال کا ہے۔ چونکہ کوئی ادارہ خفیہ فنڈز کے غلط استعمال کی جانچ پڑتال نہیں کرتا اس لیے میں اس کو عوام کے علم میں لا رہا ہوں۔" ورما ثبوت پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی جائیدادیں درحقیقت اس کی بیوی اور امریکا میں رہائش پذیر بیٹے کی ملکیت ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی بیوی ممتاز دولت مند والدین کی بیٹی ہے اور 1973ء میں اس کو اپنے والد سے مالی عطیات موصول ہوئے تھے۔ یہ جائیدادیں ہمارے افراد کنبہ کی ملکیت ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ صرف نویڈا کے ایک گھر اور ارچنا کمپلیکس میں دو دکانوں کے حصص کے مالک ہیں۔ نیز یہ کہ وہ اپنی ریٹائرمنٹ تک ہر سال اپنی جائیدادوں کی تفصیل حکومت کو پیش کرتے رہے ہیں۔

"را" کے دونوں سراغ رسانوں کے درمیان خوفناک مقابلہ جاری ہے۔ عدالت نے سی بی آئی کو ورما کے اثاثہ جات کی تحقیق کا حکم دے دیا تھا۔ جس کے جواب میں سی بی آئی نے عدالت کے حکم کے خلاف اپیل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اور کون سے نئے راز منظر عام پر آئیں گے۔ فی الحال یوں لگتا ہے کہ ورما کے خلاف یادیو کی سترہ سالہ جدوجہد کا انجام ابھی قریب نہیں۔ "را" کے دونوں سراغ رسانوں کے درمیان خوفناک مقابلہ جاری ہے۔ ■■■

خبر بنانے والی کبھی خود بھی خبر بنتی ہے

ملک کے موثر و مؤقر اخبارات کی لیڈی رپورٹرز اور ایڈیٹرز پہلی بار خود اپنے بارے میں بات کرتی ہیں

حنا انور

عطیہ زیدی (روزنامہ خبریں)

آج سے 23 سال پہلے صحافت میں قدم رکھا تھا۔ پرنٹ میڈیا میں اس لیے آئی کہ جب میں نے آغاز کیا تھا، تب الیکٹرانک میڈیا میں ایک ہی چینل تھا اور وہ تھا پی ٹی وی (PTV)۔ چونکہ وہ ایک ہی تھا، سو اس میں جانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ ظاہر ہے

> میرے کیریئر کا نہ بھولنے والا واقعہ عاصمہ جہانگیر نے مجھ پر کیس کر دیا

وہاں جانا ناممکن تھا۔ 18,19 سال میں نے خبریں میں کام کیا۔

میں نے Friday Times میں کام کیا۔ روزنامہ صحافت اور جناح میں بھی کام کیا، میں نے شعبہ میگزین میں بھی کام کیا۔ اس دوران مجھے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان میں سرفہرست ٹرانسپورٹ کا مسئلہ تھا۔ بعض اوقات کسی کا انٹرویو لینے کے لیے مجھے بہت دور جانا پڑتا تھا یا موٹر سائیکلوں پر سفر ہوتا۔ کبھی کبھار دفتر کی گاڑی مل جاتی تھی۔

ایک خاتون جرنلسٹ کا امیج یہ ہونا چاہیے کہ وہ Comprehensive Story دے۔ اگر وہ کوئی عام تحریر دے رہی ہے تو وہ جس کے خلاف اسٹوری دے رہی ہے، اس کا بھی نقطہ نظر دے۔ اہم بات یہ ہے کہ متوازن حقائق کے ساتھ خبر پیش کرے۔ اس کے چھپنے سے یہ ہوتا ہے کہ جس کے خلاف آپ خبر دے رہے ہیں، وہ بھی آپ سے اظہار ناراضی نہیں کرتا۔

اس شعبے میں میری آئیڈیل شخصیت ضیا شاہد اور عباس اطہر ہیں۔ مجھے ایک Investigative Reporter کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ میں نے Investigative Reporting بہت زیادہ کی ہے۔ میں نے بہت اچھی اچھی خبریں بھی بریک کی ہیں۔

میں نے دو کام اچھے کیے۔ ایک تو جنرل رانی کا

آخری انٹرویو کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا جب وہ بستر مرگ پر تھی۔ جنرل رانی، جنرل یحییٰ خان کے آخری بدنام ایام کے حوالے سے ملک کی تاریخ میں ایک اہم کردار تھی۔ اس کی زندگی کا آخری اور بڑا بھرپور انٹرویو میں نے کیا۔

دوسرا کام یہ تھا کہ ایٹمی پروگرام کے متعلق میں نے ایک اسٹوری چاغی کے حوالے سے لکھی تھی۔ ایک این جی او (NGO) کے خلاف اس اسٹوری کے چھپنے کے بعد پاکستان آرمی کو بہت زیادہ اسپورٹ ملی۔

میرے کیریئر کا نہ بھولنے والا واقعہ یہ ہے کہ عاصمہ جہانگیر نے اوکاڑہ میں ایک این جی او (NGO) کے ذریعے کچھ ایسا کام کیا جو ملکی مفاد میں نہیں تھا۔ میں نے جس وقت خبر دی تو میری خبر دینے کی وجہ سے انھوں نے مجھ پر کیس کر دیا۔

ایک عام عورت اور جرنلسٹ میں یہ فرق ہے کہ جرنلسٹ باشعور ہوتی ہے۔ وہ حقائق اور سچائی کو بڑی گہرائی سے دیکھتی ہے۔ اب کی جرنلسٹ کا مجھے نہیں پتا، لیکن آج سے 23 سال پہلے یا ان 23 برس کے درمیان مجھے تو یہی محسوس ہوا کہ عام عورت کی کہانیاں چھاپتے چھاپتے اور دنیا کو بتاتے بتاتے ہم خود ایک کہانی بن جاتے ہیں۔

نئی آنے والی لڑکیوں کو میں نصیحت کرنا چاہوں گی کہ وہ کسی مرد پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے اوپر اعتماد کریں اور کامیابی کے لیے شارٹ کٹ نہ ڈھونڈیں۔ محنت کرتی رہیں، اللہ کامیابی دیتا ہے۔

مجھے تو اور کوئی کام آتا ہی نہیں، اس لیے تادم مرگ اسے چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ مشکلات سے میں نہیں گھبراتی بلکہ ان سے میرے حوصلے مزید بلند ہوتے ہیں۔

بطور جرنلسٹ میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ Save Islam اور Save Pakistan اور Save Pak Army کیونکہ آرمی اس ملک کا Defence ہے اور اسے Defend کرنا ملک و قوم سے وفا کا تقاضا ہے۔

عنبرین فاطمہ (نوائے وقت سنڈے میگزین)
انچارج: خواتین و تعلیم ایڈیشن

میں نے 2005ء میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ میں نے LLM کر رکھا ہے۔ ماس کمیونیکیشن میں مجھے داخلہ نہیں مل سکا۔ پنجاب لاء کالج میں میرا نام آیا۔ میں نے اس میں ڈگری تو لے لی لیکن میری دلچسپی صحافت ہی میں رہی۔ پھر مجھے روزنامہ دن میں کام کرنے کا موقع ملا۔ میری پہلی جاب روزنامہ دن کے نیوز روم میں بطور سب ایڈیٹر ہوئی۔ روزنامہ وقت میں آئی تو وہاں بطور لیڈی رپورٹر کام کیا۔ پھر پچھلے پانچ سال سے میں نوائے وقت میں ہوں۔ میں Women Page اور Education کی انچارج ہوں۔ اس کے علاوہ فیشن کا صفحہ بھی دیکھتی ہوں۔ سنڈے میگزین میں بھی مختلف انٹرویو وغیرہ کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ اگر کوئی Special Edition آجائے تو وہ بھی میں کرتی ہوں۔

ابو کے ایک کزن ہیں، ان کو بچپن میں دیکھتی تھی کہ پی۔ٹی۔وی کی طرف سے ہر دوسرے تیسرے سال بہترین صحافی کا ایوارڈ ملا کرتا تھا۔ میرے دل میں بھی یہ خیال آتا تھا کہ مجھے بھی ایسا ایوارڈ لینا ہے۔

مجھے بھی ایسا جرنلسٹ بننا ہے۔ مجھے بھی کوئی ایسا کام کرنا ہے جس سے لوگ مجھے جانیں۔ میری Inspiration تو ان کا وہ ایوارڈ ہی رہی ہے۔ سوچا یہی تھا کہ صحافت کا مجھے جتنا شوق ہے، اس شوق کو آگے لے کر چلنا ہے جو میرے بعد بھی لوگوں کو یاد رہے۔

مجھے نوائے وقت میں کام کرتے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ پہلے بھی دو اداروں میں کام کیا لیکن نوائے وقت میں کام کر کے مجھے جو اعتماد ملا، اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔ میں اسے اپنے لیے ایک اعزاز تصور کرتی ہوں کہ اتنے زیادہ سینیئرز کی

اچھی فی میل جرنلسٹ کو قومی و بین الاقوامی تمام ایشوز کا پتا ہونا چاہیے

موجودگی میں بھی مجھے اتنا زیادہ موقع ملنا میرے لیے ایک ایوارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جب میں نے روزنامہ دن میں کام کا آغاز کیا تو مجھے کام کا زیادہ علم نہیں تھا بلکہ میں نے جرنلزم بالکل نہیں پڑھی تھی۔ میری فیلڈ ہی الگ تھی لیکن جب آپ کو کسی چیز کا شوق ہو تو ایسے کام بھی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو Challenging ہوں۔ رپورٹنگ میں میری کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن جب میں نے رپورٹرز کو دیکھا تو یہ شوق بھی پیدا ہو گیا۔ جب وقت میں گئی تو وہاں طاہر ملک صاحب نے مجھے اسپورٹ کیا کہ مجھے رپورٹنگ میں آنا چاہیے۔ انھوں نے مجھے Ideas دیئے۔ میں نے ان Ideas پر کام کیا پھر یوں سمجھیے کہ مجھے رپورٹنگ کی دُھن لگ گئی۔ ابھی بھی میں کام تو میگزین میں کر رہی ہوں لیکن میرا کام رپورٹنگ ہی ہے۔ مجھے کبھی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہاں سینیئر، جونیئر کی وجہ سے ذرا Clash ہو جاتا ہے۔ جب میں وہاں کام کر رہی تھی تو مجھ سے سینیئر لوگ میرے اوپر حاوی رہتے تھے، اس زعم میں کہ یہ جونیئر ہے اور ہم سینیئر ہیں۔ اس چیز کا تو تینوں اداروں میں سامنا کرنا پڑا۔

اچھی فی میل جرنلسٹ کا امیج میرے حساب سے ایسا ہونا چاہیے کہ جب آپ کسی کا نام لیں جیسے جنگ میں فاخرہ تحریم ہیں، پروین خان ہے تو آپ کے ذہن میں پہلی چیز یہ آنی چاہیے کہ اس جرنلسٹ کو قومی و بین الاقوامی تمام ایشوز کا پتا ہے۔ ان کو پتا ہوتا ہے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے؟ صرف لیڈی رپورٹر بن جانا کوئی بڑا کام نہیں بلکہ میرے خیال میں جرنلسٹ صرف جرنلسٹ ہوتا ہے۔ جب آپ فیلڈ میں کام کرنے نکلے ہیں تو میرے خیال میں آپ کا Exposure زیادہ اور آپ کو ایشوز کا پتا ہونا چاہیے۔ صرف اس لیے ڈر جانا کہ آپ خاتون ہیں، یہ تو آپ کی کمزوری ہے۔ آپ جتنا ڈریں، گھبرائیں گے، اتنا ہی لوگ اس چیز سے فائدہ اٹھائیں گے۔

سلمیٰ رضا (ایگزیکٹو ایڈیٹر اخبار جہاں)

میں نے اب سے تیس پینتیس سال پہلے اخبار جہاں سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔

1970ء میں میں نے ایم اے اُردو کیا۔ پہلے تو لیکچرار بننے کا ارادہ تھا لیکن اتفاق سے میری نوکری

اخبار جہاں میں ہو گئی۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا، سراج الدین ظفر مرحوم کی ایک کتاب ''غزل و غزال'' کے نام سے چھپی تھی۔ 20,25 روپے اس کی قیمت تھی۔ میرے لیے قدرے مہنگی تھی لیکن میں نے خریدی، اسے پڑھا۔ اسی دوران طالب علموں کے مابین ایک مقابلہ کرایا جا رہا تھا۔ میں نے جیسے تیسے جوڑ توڑ کر کے کچھ لکھ بھیجا۔ چند دنوں میں ایڈیٹر کی جانب سے جوابی خط موصول ہوا اور تین سو روپے بطور انعام مجھے ملے کہ تحریر اچھی تھی۔

میں نے جب صحافت کو بطور پیشہ اپنایا تو میں بالکل نوجوان تھی۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کا ماحول بھی اتنا ایڈوانس نہیں تھا کہ کسی ادارے میں آنے سے پہلے ہی اعتماد موجود ہوتا۔ لیکن اللہ کے شکر سے مجھے یہاں کسی قسم کی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ لوگ بھی مکمل تعاون کرتے تھے۔ اس طرح مجھے کبھی عدم تحفظ کا احساس نہیں ہوا۔ ہر طرح سے عزت و احترام ہی ملا۔ نہ صرف اخبار جہاں میں بلکہ آج چینل میں بھی جتنا عرصہ رہی ہوں، لوگوں نے بہت عزت دی اور اس کے لیے میں اللہ کی شکر گزار ہوں۔

میں سمجھتی ہوں کہ ایک صحافی اچھا صحافی ہوتا ہے۔ مرد و زن کی تفریق صحافی کے لیے نہیں بنی۔ اس میں صرف کام پر فوکس کرنا چاہیے۔ اگر آپ کام نہیں کریں گے تو لوگ بھی آپ کو پسند نہیں کریں گے، خواہ آپ مرد ہوں یا عورت۔

ایڈیٹر نے کہا کہ کوئی تخلیقی کام کیجیے۔ میں نے ''زیرلب'' کے نام سے سولہ سترہ سال کالم لکھا۔ لیکن جب پالیسی بدلی تو وہ بند ہو گیا۔ نفسیاتی مسائل کے حوالے سے بھی میری تصویر کے ساتھ مضمون چھپتا تھا اور یہ بھی پندرہ سولہ سال میں نے کیا۔ اسی طرح سے جنگ لندن کے لیے میں یہاں سے کام کر کے بھجواتی تھی اور مجھے کبھی دشواری محسوس نہیں ہوئی کیونکہ میں ہمیشہ کچھ کرتے رہنا چاہتی ہوں۔

کامیابی تو ہر انسان کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ کسی نے دولت کمائی تو سمجھا کہ کامیاب ہو گیا۔ کسی نے نام کمایا تو خود کو کامیاب گردانے لگا۔ یہ تو انسان کے اندر ہوتی ہے۔ اگر آپ مطمئن ہیں تو کامیاب ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں اپنے کام سے مطمئن ہوں۔ صحت دی ہے اللہ نے، عزت دی ہے تو میں یہی سمجھتی ہوں کہ میں کامیاب ہوں۔

صحافت ہو یا کوئی اور نوکری، گھر سے نکلنے والی عورت کو مسائل سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔ صبح آفس آ کر سارا دن کام پھر گھر کا کام۔ لیکن ظاہر ہے کہ صحافی اور عام عورت میں ایک واضح فرق ہے۔

اب تو بہت سی نئی راہیں کھل گئی ہیں۔ ہمارے زمانے میں صرف اخبار کی دنیا تھی اور اس میں خواتین کے لیے چند صفحات مخصوص تھے۔ لیکن اب تو کئی چینلز موجود ہیں۔ اخبارات کی ایک لائن لگی ہوئی ہے اور اس میں آنے سے اعتماد بڑھتا ہے، شہرت ہے، پیسہ بھی ہے۔

نئی آنے والی لڑکیوں کو یہ کہوں گی کہ اعتماد سے آگے بڑھیے۔ اپنے آپ کو اپنے تئیں بڑا نہ سمجھیے کہ میں بہت بڑی چیز ہوں۔ عاجزی و انکسار کا دامن نہ چھوٹے، میں نے دیکھا ہے بعض صحافی خواتین و حضرات زیادہ کچھ نہیں ہوتے لیکن خود کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں ایسے کام ضرور کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں۔

رفیعہ ناہید اکرام
(سٹاف رپورٹر نوائے وقت)

1998ء میں باقاعدہ نوائے وقت جوائن کیا اس سے پہلے فری لانس جرنلسٹ کے طور پر نوائے وقت گروپ کے سنڈے میگزین، اسپورٹس ایڈیشن، فیملی میگزین، پھول میگزین اور ریڈیو پاکستان کیلئے اسپورٹس آرٹیکلز، فیچرز اور انٹرویوز کیا کرتی تھی۔ 1997ء تک تو یہ سب شوق کی خاطر ہو رہا تھا مگر پھر اچانک زندگی میں ایک ٹریجڈی ہوگئی۔ اس صدمے سے نکلنے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا عزم لئے نوائے وقت کے میگزین سیکشن میں باقاعدہ ملازمت

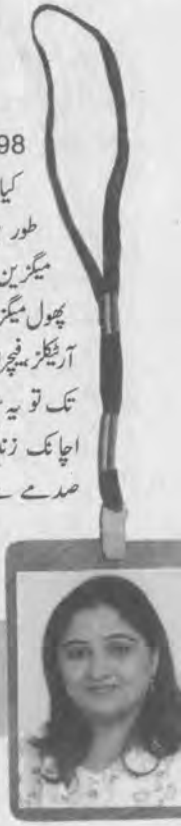

صدمے سے نکلنے کے لیے جرنلزم میں آئی

شروع کردی۔ یہاں رہ کر مختلف اوقات میں ایجوکیشن ایڈیشن، اسپورٹس ایڈیشن، خواتین ایڈیشن، ہیلتھ ایڈیشن کی انچارج کے طور پر خدمات انجام دیں۔ سنڈے میگزین کیلئے فیملی انٹرویوز بھی کئے اور ایوان وقت اور حمید نظامی ہال میں سیمینارز اور مذاکروں کا انعقاد بھی کیا۔

پندرہ برس قبل جب میں جرنلزم میں آئی تھی تو اس وقت الیکٹرانک چینلز کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس وقت تمام صحافی اخبارات یعنی پرنٹ میڈیا سے ہی منسلک تھے۔ یوں بھی نوائے وقت ایک معتبر ادارہ ہے جس کی اپنی درخشاں روایات ہیں اور اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ جدید پروفیشن سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ روایت اور کلچر سے بھی جڑے رہیں اور دفتر کے مردانہ ماحول میں کوئی شخص بھی آپ کا استحصال صرف اس وجہ سے نہ کرسکے کہ آپ ایک خاتون ہیں تو پھر نوائے وقت آپ کیلئے ایک آئیڈیل ورک پلیس ہے، جہاں کام کے دوران مسائل ہوسکتے ہیں مگر ایک خاتون ہونے کی حیثیت سے آپ جتنی یہاں محفوظ ہیں شاید کہیں اور نہ ہوں۔

میں آئیڈیل وغیرہ پر تو یقین نہیں رکھتی البتہ مجھے پاکستان کی سینئر صحافی نسیم زہرہ پسند ہیں جو صرف اینکر نہیں جرنلسٹ بھی ہیں اور انتہائی وقار اور متانت سے اپنا مقام بنائے ہوئے ہیں۔

شیخ سعدیؒ نے کہا تھا ''سیدھے راستے پر چلو اگرچہ دور ہو'' یعنی شارٹ کٹ ڈھونڈنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ شارٹ کٹ تجربے کا متبادل نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ خود کو بیسٹ کے حوالے سے محدود رکھنے کی بجائے تمام بیسٹ میں کام کیلئے جدوجہد کریں اور ہر سطح پر اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں تاکہ خواتین کے میدان عمل میں آنے سے جس بہتری کی توقع کی جارہی ہے وہ حقیقت میں نظر آئے۔

کامیابیاں اور ناکامیاں زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں تاہم الحمدللہ مجھے کسی قابل ذکر ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نہ ہی کبھی اس شعبے کو چھوڑنے کا خیال آیا تاہم ایک آدھ مرتبہ یہ ضرور محسوس ہوا کہ ''کب میرا نشیمن اہل چمن، گلشن میں گوارا کرتے ہیں''۔ اب مجھے چونکہ چیلنجز کا مقابلہ کرنے میں لطف آتا ہے تو اس صورت حال کو بھی ''یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کیلئے'' سمجھا اور مستقل مزاجی سے کام کرتی ہوں۔ ■■■

سچا واقعہ

آرٹسٹ نے 45 ہزار ڈالر واپس کردیے

دیانت داری کا سبق آموز واقعہ

رضوان علی شاہ

جوش فیرن امریکی شہر سالٹ لیک سٹی سے نکلنے والے ایک مقامی اخبار، ڈیزرٹ نیوز میں بحیثیت آرٹسٹ کام کرتا ہے۔ اس سال ماہ اپریل کی بات ہے، اس نے شہر کے مضافات میں ایک گھر خریدا۔ جب کمروں کی مطلوبہ مرمت وصفائی ہوچکی، تو فیرن گیراج میں پہنچ گیا جو کسی بڑے کمرے سے کم نہ تھا۔ یہ ماہ جولائی کا واقعہ ہے۔

گیراج کی صفائی کرتے ہوئے 35 سالہ فیرن کو چھت سے نکلا قالین کا کونا نظر آیا۔ یہ منظر دیکھ کر قدرتاً اسے بڑی حیرانی ہوئی۔ فیرن نے جب اچھل کر قالین کھینچا تو وہ نیچے آگرا اور ایک تختہ کھل گیا۔ یہ بالا خانے کا دروازہ تھا۔ قریب ہی سیڑھی پڑی تھی، فیرن نے اسے دروازے پر لگایا اور اوپر چڑھ گیا۔

بالا خانے میں خاصا اندھیرا تھا، لہٰذا فیرن کی آنکھوں نے تاریکی سے ہم آہنگ ہونے میں خاصا وقت لگایا۔ جب فیرن کو اندر ماحول نظر آنے لگا تو اس نے دیکھا کہ وہاں خاصا کاٹھ کباڑ پڑا ہے۔ ان میں نمایاں دھاتی ڈبے تھے۔ غور سے دیکھنے پر فیرن کو احساس ہوا کہ دوسری جنگ عظیم میں ان ڈبوں میں گولہ بارود رکھا جاتا تھا۔ دراصل اس کے دادا اپنے فارم میں اوزار ایسے ہی ڈبوں میں رکھتے تھے۔

فیرن نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک ڈبہ کھولا اور پھر حیرت کے مارے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ڈبے میں ڈالروں کے کئی رول نارنجی دھاگوں سے بندھے پڑے تھے۔ اس نے خوش ہوکر سوچا ''واہ! بیٹھے بٹھائے کم از کم 800 ڈالر ہاتھ آگئے۔ آج تو مفت کی لاٹری نکل آئی۔''

لیکن بالا خانے میں موجود ہر دھاتی ڈبہ ڈالروں سے بھرا پڑا تھا۔ فیرن کو وہاں سے ایسے 7 ڈبے ملے۔

پھر اسے ایک کونے میں کوڑے والے دو سیاہ پلاسٹک کے تھیلے نظر آئے۔ اس نے بے اختیار انھیں کھولا تو وہ بھی ڈالروں سے اوپر تک بھرے ہوئے تھے۔

ان ڈبوں اور تھیلوں میں کل 45 ہزار ڈالر موجود تھے۔ پاکستانی سکہ رائج الوقت میں یہ رقم 43 لاکھ 20 ہزار روپے بنتی ہے۔ فیرن کو یہ زرِ کثیر اپنے گھر کے بالا خانے سے ملا جو عام افراد کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔

فیرن کے دماغ میں پہلا خیال یہی آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک زبردست تحفہ عطا کر ڈالا۔ اب اس دولت کے ذریعے وہ اپنی ایسی تمنائیں پوری کر سکتا تھا جو ہنوز تشنہ تکمیل تھیں۔ مثلاً وہ ایک لڑکی گود لے کر پالنا چاہتا تھا۔ پھر اس رقم سے اس کے 7 سالہ اور 4 سالہ بیٹوں کو بھی کئی سہولتیں میسر آتیں اور ان کی زندگی آسان ہو جاتی اور کچھ نہیں تو وہ اپنے نئے مکان کی خوبصورت تزئین و آرائش کر سکتا تھا۔

لیکن فیرن جب خواب وخیال کی دنیا سے باہر آیا، تو ضمیر پوری قوت سے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ تب اس نے سوچا کہ رقم کے معاملے میں درست قدم یہ ہے کہ اسے سابق مالکان مکان کے حوالے کر دیا جائے۔ فیرن جانتا تھا کہ وہ گزشتہ 60 برس سے اس گھر میں مقیم تھے۔ چنانچہ اس نے انھیں فون کر کے بلوالیا۔

اگلے دن وہ فیرن سے ملنے آئے تو اس نے انھیں سارا ماجرا سنایا۔ 45 ہزار ڈالر بالا خانے سے نکلنے کا سن کر قدرتاً انھیں دھچکا لگا۔ اس سے بھی بڑا دھچکا انھیں یہ جان کر پہنچا کہ فیرن انھیں رقم واپس کر رہا ہے۔ گھر کا مالک ہونے کے ناتے قانوناً وہی اس رقم کا مالک تھا، لیکن جب بات اخلاقیات کی ہو تو قانون کبھی کبھی پسِ پشت بھی چلا جاتا ہے۔

سابق مالکان نے بتایا کہ یقیناً یہ ان کے والد ہوں گے جو طویل عرصہ بالا خانے میں اپنی بچت چھپاتے رہے لیکن کیوں؟ وہ کوئی ٹھوس وجہ بتانے سے قاصر رہے۔ فیرن نے خود ہی اندازہ لگایا کہ اُن کے والد یہ سوچ کر رقم پس انداز کرتے رہے ہوں گے کہ ان کے بچوں کے کام آئے گی۔

فیرن نے اپنے تصور میں یہ بھی دیکھا کہ مکان مالکان کے والد سیکڑوں دفعہ گیراج میں آتے، وہ پھر دیوار میں لٹکی نالی سے نارنجی دھاگہ کاٹتے، ڈالر تہہ کرتے، دھاگہ لپیٹتے، بالا خانے پہنچتے اور رقم ڈبے یا تھیلے میں محفوظ کر دیتے۔ یہ سارا عمل بجائے خود بڑا محنت طلب تھا جو وہ صرف اپنے بچوں کی خاطر انجام دیتے رہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب فیرن اور اس کے اہل خانہ اپنے نئے گھر آئے تو گیراج میں اس وقت بھی نارنجی دھاگے کے لچھے لٹک رہے تھے۔ جب فیرن کے دونوں بچوں کی آگے پیچھے سالگرہ آئی تو اس نے انہی دھاگوں کی مدد سے تحفوں کے پیکٹ باندھے تھے۔

جب فیرن نے رقم اصل مالکوں کو لوٹائی تو اس کے اپنے بچے بھی موجود تھے۔ اس نے انھیں دانستہ سارا واقعہ سنایا۔ دراصل باپ کو یقین تھا کہ بیٹے اس عظیم ترین تحفے کو ہمیشہ یاد رکھیں گے جو انھیں ملا...... دیانت داری کا بہترین مظاہرہ کرنے والا تحفہ۔ فیرن اور اس کی بیوی سمجھتے ہیں کہ تقریباً نصف کروڑ روپے کی رقم لوٹا کر انھوں نے صحیح اقدام کیا۔ ان کے نزدیک اہم ترین امر یہ ہے کہ بچے اس سبق کو کبھی نہیں بھلائیں گے کہ پیسہ نہیں سچائی بڑی دولت ہے۔ ■■■

چونکا دینے والے واقعات، چشم کشا حقائق

اقتدار کے ایوانوں میں کیا ہوتا رہا

سینیٹر ایس ایم ظفر کی کہانی ان کی اپنی زبانی

عمیر محمود

ایس ایم ظفر کی یہ کتاب مارچ 2003ء سے مارچ 2012ء تک کی کہانی ہے جب وہ بطور سینیٹر اپنے فرائض انجام ے رہے تھے۔

پاکستان کے لیے یہ عرصہ نہایت اہمیت کا حامل ۔ مصنّف نے کئی کہانیاں اپنے سامنے تشکیل پاتے یں اور انھیں بلاکم وکاست بیان کیا ہے۔ اسی عرصے ں پاکستان میں ایک ''باوردی'' صدر حکمران رہے اور یں بھرپور ''سیاسی'' معاونت حاصل رہی۔ یہاں تک انھیں وردی میں صدر رہنے کا آئینی حق بھی دیا یا۔ کچھ سیاسی قائدین انھیں دس دس بار وردی میں ب کرانے کے اعلانات کرتے رہے لیکن ''انھوں'' ے اپنی پینگیں کسی اور ہی پارٹی کے ساتھ بڑھالیں۔

سینیٹر ایس ایم ظفر کی کہانی، ان کی اپنی زبانی میں سیاسی در و بام کے چشم کشا انکشافات ہیں اور اگرچہ یہ کتاب سال کے اوائل میں ہی مارکیٹ میں آگئی تھی، لیکن ابھی تک اس کتاب کے حقائق سے پردہ اٹھانے والے مندرجات اس امر کے متقاضی ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔

کیا ق لیگ شروع سے ہی کوئی ڈیل کر چکی تھی

ایس ایم ظفر لکھتے ہیں دو ہزار آٹھ کے انتخاب کے بعد صدارتی انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا۔ مسلم لیگ ق کی جانب سے مشاہد حسین سید امیدوار تھے۔ فیصلہ یہ کیا

گیا کہ وسیم سجاد، مشاہد حسین کی جانب سے کاغذات نامزدگی کی پڑتال والے دن پیش ہوں گے اور آصف علی زرداری کی صدارتی امیدوار کے لیے اہلیت پر اعتراضات اٹھائیں گے۔

اس روز مشاہد حسین، چودھری شجاعت حسین اور وسیم سجاد اکٹھے چودھری صاحب کی رہائش گاہ سے آئے۔ جب آصف زرداری کے کاغذات نامزدگی پیش

ہوئے، تو وسیم سجاد فائلیں ہاتھ میں لیے ڈائس پر پہنچے اور کہا ''ہمیں آصف زرداری کی نمائندگی پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں۔''

بعد میں مصنف نے وسیم سجاد سے پوچھا، یہ تبدیلی کیسے ہوئی، تو انہوں نے مرجھائی ہوئی آواز میں جواب دیا

''آج صبح کار پر سوار ہونے کے بعد راستے میں۔''

بعد میں مصنف نے چودھری شجاعت کو بھی کریدنے کی کوشش کی، لیکن وہاں سے بھی انہیں پیغام دیا گیا، ''مٹی پاؤ۔''

آخر کار پر سوار ہونے کے بعد ایسا کیا ہوا کہ مسلم لیگ ق نے آصف علی زرداری کی اہلیت پر اعتراض اٹھانے کا فیصلہ واپس لے لیا؟ اس کا جواب آنا ہنوز باقی ہے۔

بقا کی صورت

18 فروری کے انتخابات کے بعد قومی اور پنجاب اسمبلی میں نشستوں کے اعتبار سے مسلم لیگ ق تیسرے نمبر پر آئی۔ اس دوران پیپلز پارٹی کی جانب سے اسے قاتل لیگ کا خطاب بھی دیا گیا۔ صورت حال پر غور کرنے کے لیے 23 مارچ کو پارٹی اجلاس بلایا گیا۔ اور مصنف یہ سن کر حیران رہ گیا جب کچھ خواتین وحضرات نے اسی وقت پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ مصنف کہتا ہے ان خواتین وحضرات کے خیال میں اب ''بقا'' کی یہی صورت موجود تھی۔

آصف زرداری کی اہلیت پر اعتراض اٹھانے کا فیصلہ کیسے واپس ہوا؟

تاہم مختلف قائدین کی جانب سے اس سوچ کے خلاف دلائل دیے گئے، اور مشاہد حسین نے کہا ''پیپلز پارٹی کو حکومت کرنی کبھی نہیں آئی۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم مشرف کے علاوہ ان کا ملبہ بھی اٹھائیں۔''

''فکر نہ کریں'' آصف زرداری کا ایس ایم ایس

24 مارچ 2008ء کو یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ اس وقت تک پی سی او پر حلف نہ اٹھانے والے ججز معزول تھے۔ 25 مارچ کو صدر ہاؤس میں مصنف کی ملاقات پرویز مشرف کے معتمد طارق عزیز سے ہوئی۔ انہوں نے مری ڈیکلریشن کے مطابق جج صاحبان کی بحالی پر طارق عزیز کی رائے جاننا چاہی۔

طارق عزیز نے کہا، انھوں نے پیپلز پارٹی کے کو چیئرمین آصف علی زرداری کو ایس ایم ایس کیا تھا۔ ان کا جواب آیا، ''فکر نہ کریں'' Do not worry بعد میں انہیں آصف زرداری کا فون بھی آیا کہ ''ججز کا معاملہ جب بھی اٹھا، وہ ایک مشترکہ کمیٹی کے حوالے کر دیا جائے گا، جہاں ہر جج کے گذشتہ ریکارڈ پر غور کیا جائے گا۔ آخر انہی جج صاحبان کی موجودگی میں مجھے 9 سال جیل میں گزارنا پڑے تھے۔''

''نواز شریف کو جن اور خود کو بونا نہیں بنا سکتا''

بعد میں ججز بحالی کی تحریک میں شدت آتی گئی۔ اس وقت کے صدر پرویز مشرف کے خلاف مواخذے

کارروائی شروع کرنے کا مطالبہ بھی زور پکڑ رہا تھا۔ میں ایس ایم ظفر مارچ 2008ء میں حامد ناصر کی آصف زرداری سے ملاقات کا احوال لکھتے ان واقعات کے راوی حامد ناصر چٹھہ ہیں۔ مارچ آصف زرداری نے انھیں کہا کہ وہ مشرف کو خراب کریں گے اور نہ ابھی جج بحال ہوں گے۔ غالباً پس منظر میں ''معاہدے حدیث و قرآن نہیں تے'' جیسے بیانات آئے۔ بہرحال، احتجاج میں ت آتی جا رہی تھی اور جب مئی میں حامد ناصر کی آصف زرداری سے ملاقات ہوئی تو ں نے کہا ''صدر پرویز مشرف کی سے میں نواز شریف کو جن، اور خود ونا تو نہیں بنا سکتا!''

فوج اپنے سربراہ کا مواخذہ نہیں چاہتی تھی

10 اگست 2008ء کو مصنف کو ی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے ب کیا، اور کہا ''ہم صدر کے Ex فارمولا پر بات کرنا چاہتے ا''

مصنف اور آرمی چیف کی دیگر گفتگو باہمی اعتماد پیش نظر تھی، اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا گیا، تاہم گو کا لب لباب یہ تھا کہ فوج اپنے سربراہ کا مواخذہ ں چاہتی۔

جب پنجاب حکومت نے لانگ مارچ کے خلاف فوج طلب کی

15 مارچ 2009ء کو ججز بحالی کے لیے لانگ ج کیا گیا۔ اس کی روداد بہت دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ پنجاب حکومت لانگ مارچ کو لاہور میں ہی روکنا چاہتی تھی۔ اور آئین کے آرٹیکل 245 کے تحت افواج پاکستان کو سول ایڈمنسٹریشن کی اعانت کے لیے طلب کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

فوج کی جانب سے درمیانی راستہ تلاش کرنے کے لیے باہمی مشاورت کی گئی۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی خود لاہور پہنچ گئے۔ حکومت پنجاب کو اطلاع دی گئی کہ ایک فوجی بٹالین کو ضروری احکامات دے دیے گئے ہیں، لیکن ہم نہیں چاہتے کہ اس وقت کوئی فوجی ٹرک یا جیپ یا کوئی فوجی جوان سڑکوں پر نظر آئے۔

جب نواز شریف نے گھر سے نکل آنے کی دھمکی دی تو پنجاب حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے

جی پی او چوک پر حالات بگڑتے دکھائی دیے تو پھر پنجاب حکومت نے فوری طور پر فوج طلب کی۔ انہیں جواب دیا گیا کہ پولیس اور رینجرز کے ذریعے حالات قابو میں کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن جب نواز شریف نے گھر سے نکل آنے کی دھمکی دی تو پنجاب حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور جلوس کو روکنے کے لیے ہر حال میں فوج کا دستہ بھیجنے کے لیے کہا گیا۔ تاہم تب تک مرکزی حکومت افہام وتفہیم سے معاملہ حل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

حکومت نے جج بحال کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا، لیکن مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اگر سیاسی قیادت لانگ مارچ کے قائدین کو اس فیصلے سے آگاہ کرے تو وہ یقین نہیں کریں گے۔ ایسے میں جنرل اشفاق پرویز کیانی سے

درخواست کی گئی۔ انہوں نے معاملہ کسی قابل بھروسا غیر جانبدار سیاستدان کے سپرد کرنے کے لیے کہا، لیکن کسی اور نام پر اتفاق نہ ہو سکا۔ تب جا کر آرمی چیف نے اعتزاز احسن کو فون کیا اور کہا جج کی بحالی اسی رات عمل میں آجائے گی۔

تا کہ 'دوسروں' کو موقع ملے

جب آئین معطل کر کے ایل ایف او مسلط کیا گیا، تو اس میں ججز کی مدت ملازمت میں تین سال کی توسیع بھی دی گئی تھی۔ بعد میں حکومتی پارٹی اور متحدہ مجلس عمل میں مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں یہ توسیع واپس لے لی گئی۔ تاہم شاید ''کسی کے کہنے پر'' ایک درخواست کے ذریعے اسے سپریم کورٹ میں ہی چیلنج کر دیا گیا اور سپریم کورٹ نے یہ درخواست سماعت کے لیے منظور بھی کر لی۔ ایسے میں سابق صدر جنرل پرویز مشرف نے مسئلے کو دفن کرنے کا طریقہ یہ سوچا کہ چیف جسٹس کا منصب خالی ہونے سے قبل ہی نئے چیف جسٹس کی تعیناتی کا نوٹی فکیشن جاری کر دیا۔

ایس ایم ظفر لکھتے ہیں کہ انہیں سابق ڈی جی آئی ایس آئی جنرل احسان الحق نے بتایا کہ جب عدالت نے ججز کی مدت ملازمت میں توسیع کی درخواست سماعت کے لیے منظور کی انہی دنوں جونیئر جج صاحبان (افتخار محمد چودھری، فقیر محمد کھوکھر اور عبدالحمید ڈوگر) جنرل احسان سے رابطے میں تھے اور ہر ایک خواہش مند تھا کہ ناظم صدیقی اب یہ منصب خالی کر دیں تا کہ 'دوسروں' کو موقع ملے۔

پورے دو دن لاشیں نکالنے میں لگے جب وہ نکلیں تو ناقابل شناخت تھیں

نواب اکبر بگٹی کی شہادت کا دوسرا پس منظر

سینیٹر طارق عظیم سیکرٹری اطلاعات رہے ہیں، انہوں نے ایس ایم ظفر کو نواب اکبر بگٹی کی شہادت کا پس منظر بتایا۔

جب حکومت کو پتا چل گیا کہ نواب اکبر بگٹی نے کہاں پناہ لے رکھی ہے تو انہوں نے ان کے اس غار کے اردگرد حصار بنا لیا اور پناہ گاہ کے اندر آنے اور جانے والوں پر نظر رکھی۔ کچھ دنوں کے بعد نواب صاحب کے ایک دو قابل اعتماد بلوچ ساتھیوں کو حراست میں لے لیا اور ان کے ذریعے معاملہ طے کرنے کی خواہش کا پیغام پہنچایا۔ بشرطیکہ نواب صاحب غار سے باہر آجائیں۔

نواب صاحب نے باہر آنے اور ڈائیلاگ میں شامل ہونے کی رضامندی اس امر سے مشروط کی کہ پہلے حکومت ان کے دونوں پوتوں کو جو ان کے ساتھ غار میں ہیں، حفاظت سے جہاں وہ جانا چاہیں جانے دیں۔ اور جب نواب صاحب کو ان کے بااعتماد ساتھی پوتوں کے بحفاظت باہر جانے کی رپورٹ دیں گے تو پھر حکومت کی مذاکراتی ٹیم کو غار کے اندر مدعو کیا جائے گا۔ مذاکرات کا ایجنڈا طے ہونے پر نواب صاحب پناہ گاہ کو چھوڑ دیں گے۔

حکومت نے اس لائحہ عمل کو مان لیا اور اس طرح ایک مبینہ افواہ کے مطابق ان کے پوتے پناہ گاہ سے

نکل کر افغانستان چلے گئے۔ اس کے بعد ایک بریگیڈیئر، ایک میجر اور چند کمانڈر غار میں داخل ہوئے۔ ابھی انہیں گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک سے زیادہ دھماکے ہوئے، غار مٹی، بارود، اور دھوئیں سے بھر گئی۔ پورے دو دن لاشیں نکالنے میں لگے، اور جب وہ نکالی گئیں تو ناقابل شناخت اور ناقابل دید تھیں۔

باضمیر اراکین اسمبلی کون تھے

ایس ایم ظفر 2002ء کے انتخابات کے بعد کی محلاتی سازشوں کو بیان کرتے ہیں، کہ کس طرح آئین کو قسطوں میں بحال کیا گیا، پارٹی وفاداری بدلنے پر قدغن لگانا تھی لیکن اس وقت تک نہ لگائی گئی جب تک پیپلز پارٹی کے چند منتخب اراکین اپنی پارٹی چھوڑ کر ''پیٹریاٹ'' نہ بن گئے۔ میر ظفراللہ جمالی صرف ایک ووٹ کی برتری سے وزیراعظم بنے۔ لیکن اس سے بھی دلچسپ ذکر ہے ''باضمیر'' اراکین کا۔ مصنف کے مطابق امیدواران ٹکٹ برائے قومی اسمبلی اور سینیٹ کے سیاسی رجحان کا تجزیہ کرنے کا کام آئی ایس آئی کو سونپا گیا۔ ضمیر جعفری ڈپٹی ڈائریکٹر آئی ایس آئی ہوتے تھے اور وہ جسے مناسب سمجھتے تھے وہی ٹکٹ پاتا تھا۔ لہٰذا کامیاب افراد کو ''باضمیر'' ہونے کا سرٹیفیکیٹ مل جاتا تھا۔

جب ''اوپر'' سے حکم آیا

ایس ایم ظفر بتاتے ہیں کہ انہیں 5 فروری 2003ء کو پاکستان ٹیلی وژن سے ٹیلی فون آیا۔ مصنف سے مطالبہ کیا گیا کہ ایل ایف او پر ایک پینل بحث کا اہتمام کیا گیا ہے اور یہ کہ انہوں نے اس قانون کی حمایت کرنی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ایسا کرنے کا حکم ''اوپر'' سے آیا ہے۔ جب ایس ایم ظفر نے انکار کیا تو پوچھا گیا، ''پھر میں اوپر والوں کو کیا جواب دوں؟''

اس ٹیلی فونک گفتگو کے بعد چودھری پرویز الٰہی کا فون آ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ ظفر صاحب آپ ٹیلی وژن پروگرام میں شامل ہو جائیں۔ آپ کے انکار کو غلط معانی پہنائے جا رہے ہیں۔

جب چودھری شجاعت کی دعوت ہائی جیک ہوگئی

چوہدری شجاعت کی دعوت ISI کے چیف نے ہائی جیک کر لی

11 مارچ 2003ء کو سینیٹ انتخابات کے بعد مسلم لیگ ق کے کامیاب سینیٹرز کے اعزاز میں چودھری شجاعت حسین کی جانب سے رات کے کھانے کی دعوت تھی۔ شام کو اطلاع آئی کہ یہ دعوت چودھری شجاعت حسین کی رہائش گاہ پر نہیں ہو رہی بلکہ کہیں ''اور'' ہو گی۔ اب یہ دعوت مارگلہ روڈ اسلام آباد میں ایک گھر میں ہو رہی تھی۔ سینیٹر ایس ایم ظفر نے نعیم چٹھہ سے پوچھا کہ کیا معمہ ہے، آخری وقت پر دعوت کی جگہ بدل دی گئی۔ نعیم چٹھہ نے ہنس کر کہا ''صرف جگہ ہی نہیں، میزبان بھی بدل گئے ہیں۔ یہ دعوت ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی جنرل احسان کی جانب سے ہے۔''

سینیٹر ایس ایم ظفر کی کہانی ان کی اپنی زبانی سیاسی پیچ وخم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہ کتاب سال

کے اوائل میں ہی چھپ کر مارکیٹ میں آچکی تھی، اور ہم نے خرید بھی لی تھی، لیکن اس کی غیر معمولی ضخامت کی وجہ سے مہینوں اسے پڑھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ لیکن جب ایک بار پڑھنا شروع کیا، تو تقریباً روزانہ کچھ صفحات پڑھنے کی عادت سی بن گئی۔

ایس ایم ظفر کو مختلف معاملات کے حل میں جہاں کسی دوسرے کو اپنے نقطہ نظر کا قائل کرنا پڑا، اس کے دلائل بہت پرلطف ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر وہ سابق صدر پرویز مشرف اور اس وقت کی حزب اختلاف میں وردی کی کشمکش کو بیان کر رہے ہیں۔

حکومت اور حزب اختلاف میں مذاکرات جاری ہیں، پرویز مشرف پریشان ہیں اور مصنف سے پوچھتے ہیں ''اگر عوام مجھ پر اعتماد کرتے ہیں تو یہ لیڈران کیوں اعتماد نہیں کرتے؟''

پرویز مشرف پریشان تھے کہ لیڈران پر اعتماد کیوں نہیں کرتے

ایس ایم ظفر جواب دیتے ہیں ''مذاکراتی میز پر لوگ اسی وقت آتے ہیں جب انہیں ایک دوسرے پر اعتماد ہوتا ہے، البتہ فیصلے مفاہمت کے نتیجے میں ہوتے ہیں نہ کہ اعتماد کی تائید پر۔''

The issue of trust is not negotiable. Trust is built, not negotiated.

ایک موقع پر مذاکرات تقریباً ناکام ہو جاتے ہیں تو مصنف بہت پتے کی بات کہتا ہے ''مذاکرات کا دروازہ بند کر دینے سے احتجاج اور تنازعات ختم نہیں ہو جایا کرتے۔ تنازع ختم کرنے کے صرف دو ہی راستے ہیں، کہ متحارب قوتوں میں سے ایک مکمل سرنڈر کر دے، یا پھر ڈائیلاگ کی میز پر کوئی درمیانی راہ تلاش کی جائے۔''

ایک اور دلچسپ حقیقت بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے ''جب نیم جمہوری نظام میں فیصلہ فرد واحد کے ہاتھ میں ہو تو اکثر وہی کامیاب ہوتے ہیں جن کو آخر میں بات کرنے کا موقع ملے۔ انگریزی محاورہ میں اسے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ دیکھیں فرد واحد کے کانوں تک سب سے آخر کون پہنچ پاتا ہے۔''

Who gets the ears last.

کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر فٹ نوٹس ہیں، جو قاری کے تسلسل میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ لیکن ابتدائی صفحات کے بعد عادت ہو جاتی ہے اور فٹ نوٹس بھی لطف دینے لگتے ہیں۔ مختلف مقامات پر تاریخ سے حوالے صورت حال کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ مسلم لیگوں کی ٹوٹ پھوٹ، آمروں کا جمہوریت پر شب خون، جب بھی ایسے واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے، مصنف تاریخ سے مدد لیتا ہے اور مستقبل کا منظر نامہ سوچتا ہے۔ کتاب بہت سے اہم واقعات کا احاطہ کرتی ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ مصنف نے اردو کو ذریعہ اظہار بنایا، اس وجہ سے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد مستفید ہو گی۔ کتاب کو ساگر پبلشرز نے چھاپا ہے اور اس کی قیمت 1600 روپے ہے۔ ■■■

صحت

زیادہ پانی پینے سے وزن کم اور چہرہ تروتازہ رہے گا

وزن کم کریں صحت نہیں

نوشین ناز
ماہر غذائیات و نیوٹریشنسٹ

اپنے چہرے اور جسم کی خوب صورتی کے لیے مردوں کی نسبت خواتین زیادہ فکر مند رہتی ہیں۔ اس ماہ آپ کے حسن و صحت کو تادیر برقرار رکھنے اور وزن کو قابو میں رکھنے کا ایک آسان نسخہ بتاتے ہیں۔ تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اگر جسم میں پانی کا ذخیرہ کم ہو جائے تو جسم پر چربی چڑھ جاتی ہے جب کہ زیادہ سے زیادہ پانی پینا چربی کو کم کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پانی کی کمی کی وجہ سے گردے صحیح طور پر کام نہیں کرتے اور جگر پر بھی بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ جگر کا بنیادی کام جسم میں موجود چربی کو توانائی میں تبدیل کرنا ہے لیکن جب یہ گردوں کا کام کرتا ہے تو اس کا اپنا فعل متاثر ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر جگر بہت کم مقدار میں چربی کو توانائی میں تبدیل کر پاتا ہے جب کہ باقی ماندہ چربی جسم میں ہی موجود رہتی ہے اس طرح وزن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایک بہت ہی اہم تحقیق یہ بتاتی ہے کہ دبلے لوگوں کی نسبت جن لوگوں کا جسم فربہی کی طرف مائل ہو ان کو زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانی جسم میں موجود اضافی چربی کو گھلانے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ پانی پٹھوں کو بھی فعال رکھتا ہے اور قدرتی طور پر سکڑنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ پانی کی کمی کا براہ راست اثر جلد پر پڑتا ہے اور جلد لٹک جاتی ہے۔ ایسی خواتین جو اپنی جلد کے معاملے میں بے حد حساس ہوتی ہیں اور جلد کو خوبصورت اور پرکشش بنانے کے لیے نت نئے نسخے آزماتی ہیں ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ صرف پانی جیسی سستی شے ان کی جلد کو جوان اور خوبصورت بنانے میں مدد دے سکتی ہے۔ زیادہ پانی پینے والی خواتین کی جلد شگفتہ اور چمکدار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پانی جسم کے فاضل مادوں کے اخراج کو بھی ممکن بناتا ہے۔ اسی لیے فربہ بدن لوگوں کو زیادہ پانی پینے کے لیے کہا جاتا ہے۔

جب جسم کو اپنی ضرورت کے مطابق پانی نہ ملے تو یہ جسم میں ذخیرہ شدہ پانی سے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے۔ جسم کا اہم حصہ Colon ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آنتیں سکڑ جاتی ہیں لیکن اگر آپ اپنے جسم کو پانی کی مطلوبہ مقدار فراہم کرتے رہیں تو آنتیں اپنا کام نارمل طریقے سے سرانجام دیتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ایک آدمی کو دن میں پانی کی کتنی مقدار درکار ہوتی ہے۔

☆☆☆

قرآن پاک کا فرمان ہے کہ کسی کے گھر جاؤ تو تین بار (زیادہ سے زیادہ) دستک دو۔ اگر جواب نہ آئے تو اس

وقت پلٹ آؤ اور دل پر بوجھ مت لاؤ۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بھی ایک لحاظ سے دستک ہی ہوتی ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے تو زندگی کے آداب Manners بتائے تاکہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، اسی حوالے سے مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔

چند روز قبل رات دس بجے ایک آنٹی کی کال آئی، میں اپنی چھوٹی سی بیٹی کو بڑی مشکل سے قابو کر کے سلانے کی کوشش میں تھی۔ جب اپنی ماما کو باتیں کرتے دیکھتی ہے تو اپنی نیند خراب کر کے کھیلنے لگتی ہے لیکن میں نے پھر بھی کال اٹنڈ کر لی اور ان آنٹی کا مسئلہ فون پر ہی حل کر دیا۔ حالانکہ میں فون پر Consultancy نہیں کرتی ہوں لیکن پھر بھی میں نے ان کو تسلی بخش جواب دیا تھا۔

آدھے گھنٹے کی کال کے بعد میری بیٹی کا سونے کا موڈ ختم ہو چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ مجھے مزید صبر آزما گھنٹہ اس پر لگانا ہے۔ لیکن میں نے دل کو تسلی دی تھی ''چلو کوئی بات نہیں'' آنٹی اتنی دعائیں دے کر گئی ہیں۔

جیسے ہی میں نے فون رکھا تو ایک کال اور آ گئی۔

''آپ نوشین بات کر رہی ہو؟ وہی جو اردو ڈائجسٹ میں کالم وغیرہ لکھتی ہیں؟''

''جی! میں نے خاصے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ اردو ڈائجسٹ میں صرف کالم لکھنے والی کی پہچان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سیکڑوں مریضوں کی دل پسند ماہر غذائیات بنایا۔ اللہ کے کرم سے میرے کلینک کے Chain Patients اتنے زیادہ ہیں کہ اس پر جتنا شکر کروں کم ہے۔ وہ اور ان کے اہل خانہ بہت احترام سے ملتے ہیں۔ دُور دور سے آنے والے یہ Chain Patients مجھے Fees کے علاوہ اپنی دعاؤں سے نوازتے ہیں۔

مگر ان خاتون کے لہجے میں بہت بدتمیزی تھی۔

''مجھے آپ سے بات کرنی تھی اپنے لیے''، وہ بولیں۔

''میں معذرت چاہتی ہوں۔ یہ میرا فیملی ٹائم ہے اس وقت بات نہیں کر سکتی۔'' میں نے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

''لیکن میرے پاس تو یہی ٹائم ہوتا ہے!''

وہ خاصی بدتمیزی سے بولی تھیں۔

میں معذرت چاہوں گی۔ اس وقت بات نہیں کر سکتی۔

میں نے بے بسی سے اپنی بیٹی کو دیکھا تھا وہ ایک بار پھر آنکھیں کھول کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری مشقت ضائع ہو چکی تھی۔

''نوشین! ایک ڈاکٹر کے لیے یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ کہاں ناں میرے پاس یہی وقت ہوتا ہے۔ میری بات سنو، میں بہت پرانی ریڈر ہوں۔ اس قدر چیختا ہوا لہجہ اور اس قدر بدتمیزی تھی اس خاتون کے لہجے میں کہ مجھے دلی طور پر بہت دکھ ہوا۔ اردو ڈائجسٹ کے ایڈیٹر صاحب نے مجھ سے کالم لکھوانے کا وعدہ اور وقت اس بات پر لیا تھا کہ ہمارے بہت سلجھے ہوئے قارئین ہیں۔ ان کو خوشی ہو گی، یہ خاتون تو میری خوشی ختم کرنے کا باعث بنی۔

''آپ صبح کسی وقت فون کریں، یا پھر کالم کے لیے خط لکھ دیں، ابھی میں بات کرنے سے معذرت چاہوں گی۔'' میں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

Nosheen i can't afford this attitude. جب میں نے فون کیا ہے تو تمہیں میری بات سننی ہوگی۔ ٹکے ٹکے کے کالم لکھنے والے ہوتم لوگ!

میں بے حد معذرت چاہوں گی۔ میں نے پھٹتے ہوئے اعصاب کے ساتھ فون واپس رکھ دیا تھا۔

ایک آنٹی کی بات سنی تو اس نے دعائیں دیں، دوسری اپنے مزاج اور تربیت کے مطابق بدتمیزی پر اتر آئی۔ میں دیر تک سوچتی رہی۔ یہ اندازِ گفتگو رکھنے والی کی اپنی زندگی کیسے آسان ہوگی۔

''کیا ڈاکٹر انسان نہیں ہوتے؟ کیا وہ فیملی اور فیملی لائف نہیں رکھتے؟'' تھوڑے دن پہلے کی بات ہے کہ میرے بہت عزیز بھائی جو ایک سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں، بہت دکھی تھے۔ کہنے لگے: ''آپ کو پتا ہے میری ایمرجنسی میں 48 گھنٹے کی ڈیوٹی چل رہی تھی۔ مسلسل کھڑے رہنے کی وجہ سے تھکن سے بُرا حال تھا۔ میں نے ایک مریض کو چیک کیا اور پانی کی بوتل سے پانی کا ایک گھونٹ بھرا۔ مریض کے ساتھ آئی اماں گالیوں پر اتر آئی کہ ''اتنے میرا پتر مرن والا ہویا، تینوں کھان پین دی پئی ہوئی اے!''

ڈاکٹر صاحب نے بھی میرے والی اذیت کو محسوس کیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے انھیں ایک زخمی بچے کی فیملی دعائیں دیتی گئی تھی اور اب یہ اماں گالیوں پر اتر آئی تھی۔

کیا مسلسل کام کرتے کرتے پانی کا ایک گلاس پینے سے ہم اتنے برے ہو جاتے ہیں کہ مریض کے لواحقین گالیوں پر آجائیں؟

کیا ڈاکٹر آپ کی بے وقت بات نہ سنے تو کیا وہ برے رویے کا حق دار ہوتا ہے؟ ڈاکٹر فیصل نے بڑا قیمتی سوال اٹھایا تھا۔

ہمارے پیارے نبی ﷺ نے تو زندگی کے سارے بنیادی آداب بتائے۔ کوئی احسان کرے تو شکریہ بولو، اگر کوئی تین دستک پر دروازہ نہ کھولے تو اسے مزید مجبور نہ کرو، ان آداب کو ماننے سے زندگی میں خوبصورتی آتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اجر بھی ملتا ہے۔ بدتمیزی کے اظہار پر تو کسی اجر کی کوئی امید نہیں دلائی گئی۔

اب آیئے اس ماہ کے سوالات کی طرف یہ وہ سوالات ہیں جو بذریعہ ڈاک اردو ڈائجسٹ کے دفتر آتے ہیں اور مجھے وہاں سے ملتے ہیں۔ اب میں فون اور ایس ایم ایس پر سوال بالکل نہیں لے پاؤں گی۔ آپ ضروری تفصیلات لکھ بھیجا کریں، باری آنے پر جواب مل جایا کرے گا۔ کلینک پر اپوائنٹمنٹ کے لیے ایس ایم ایس کر سکتی ہیں۔

پہلا سوال مبشرہ کا آزاد کشمیر سے ہے۔

سوال: میرا وزن 95 کلو ہے اور میری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں۔ میرا قد پانچ فٹ ہے، میں صبح ناشتے میں انڈہ پراٹھا، چائے، دوپہر میں روٹی سالن یا چاول اور اسی طرح رات میں روٹی سالن یا چاول استعمال کرتی ہوں۔ میری اولاد نہیں ہے، ڈاکٹر کہتی ہے کہ وزن کم کرو۔ براہ مہربانی میری رہنمائی کریں۔

جواب: مبشرہ آپ صبح اٹھ کر نہار منہ دو جوئے دیسی لہسن دیسی پھانک لیا کریں۔ ناشتے میں جو کا دلیہ لیں، ایک پھل اور آدھا کپ چائے۔ دوپہر میں دو پھل لیں، دوپہر کا کھانا مٹن یا چکن کی یخنی کے ساتھ چھوٹی چپاتی فورگرین آٹے کی لیں اور بعد میں گرین ٹی لیں۔ شام میں اسکم ملک کا ایک گلاس لیں، رات میں تربوز کی ایک پلیٹ یا پھر دو شامی سلاد کی بڑی پلیٹ کے ساتھ لیں۔

سونے سے پہلے دو چمچ اسپغول کا چھلکا اسکم دودھ میں ڈال کر استعمال کریں۔ وٹامن بی اور Folic Acid تقریباً 20Mg ضرور لیں۔ واک کریں ایک گھنٹہ، نماز مکمل اور کھڑے ہو کر ادا کریں۔ کوئی بھی رزلٹ حاصل کرنے کے لیے مسلسل محنت کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کو ہر ماہ اپنا پلان بدلوانا ہوتا ہے۔ یہ یاد رکھیں ایک پلان ایک ماہ کے لیے ہی موثر ہوتا ہے اس کے بعد وہ جسم میں کمزوری کا باعث بن سکتا ہے۔ بہتر یہی ہوتا ہے دوسرے پلان سے پہلے کلینک پر آ کر دکھا ضرور لیا جائے۔

سوال: میری شادی ہے عید کے بعد، میرا وزن 67 کلوگرام ہے، میرا لوئر بہت بھاری ہے۔ میری عمر 26 سال اور قد 5 فٹ ہے۔ برائے مہربانی مجھے ایسا اچھا

سا پلان دیں کہ میں اپنے اہم دن پر بہت اچھی بھی لگوں اور جسمانی توانائی بھی بحال رہے۔ میرے بال بھی بہت گرتے ہیں کچھ اس کا بھی بتائیے گا۔ (ماہ نور، شیخوپورہ)

جواب: ماہ نور آپ نے اپنے کھانے پینے کی روٹین نہیں بتائی ایسے میں نہ تو میں آپ کا فزیکل ایکٹویٹی لیول جانتی ہوں اور نہ ہی آپ کی کھانے کی عادات۔ میرے لیے ادھورے سوالوں کا جواب دینا، ایک مشکل مرحلہ بن جاتا ہے۔ بہرحال آپ کے پاس ٹائم کم ہے آپ کو وزن کم کرنے کے لیے ابھی سے محنت کرنا ہوگی۔

آپ کی عمر کے لحاظ سے آپ کا وزن زیادہ سے زیادہ پچاس سے 55 کلوگرام ہونا چاہیے۔ آپ ایک گھنٹہ صبح واک کے بعد کم ازکم آدھا گھنٹہ ورزش بھی کریں جیسے کہ Abs and Biabs کی ورزشیں۔ غذا میں آپ صبح دودھ کے ساتھ کوئی ایک پھل لینا شروع کریں، دوپہر کے کھانے میں ایک بڑی پلیٹ اسٹیم سبزیوں کی ہو جائے، زیادہ بھوک لگے تو ایک براؤن سلائس اور گرین ٹی لیں۔

شام اور صبح کے درمیانی وقفوں میں پھل لیں۔ رات کے ڈنر میں آپ مونگ کی پتلی دال بڑا پیالہ سلاد اور فورگرین آٹے کی روٹی اور ایک سیب لیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد گرین ٹی لیں۔ سونے سے پہلے دو اسپغول کے چمچ کے ساتھ اسکم ملک لیں۔ وٹامن ای اور بی کے ملٹی وٹامن لیں، بالوں میں پروٹین ٹریٹ منٹ گھر میں خود کر لیں۔ تیل انڈہ دہی لگانے سے یہ عمل پورا ہو جاتا ہے، نماز باقاعدگی سے پڑھیں، رکوع اور سجدہ لمبا ادا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی صحت کے ساتھ مطلوبہ وزن کی خواہش پوری کرے اور آپ ایک شاندار زندگی کا آغاز کر سکیں۔

خوشخبریاں

صدیق جڑانوالہ سے: مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوشخبری دی ہے۔ آپ صحت مندانہ غذا پر ہیں۔ ہلکی پھلکی غذا لیتی رہیں اور ورزش کریں۔

ارسلان کمال ساہیوال سے:

مبارک ہو آپ 95 سے 86 پر آ گئے ہیں۔ اپنا پلان بدلوالیں۔ ایک ماہ ہو چکا ہے۔

مبشرہ، راولپنڈی سے:

70 کلوگرام تک بس ٹھیک ہے۔ آپ 106 سے چلی تھیں، میرا خیال ہے بس اب آپ آہستہ آہستہ ہی کم کرتی رہیں۔ واک، نماز باقاعدگی سے ادا کریں۔ آپ تین ماہ والے پلان کے لیے رابطہ کر لیں۔

سدرہ، اسلام آباد سے:

بہت مبارک ہو آپ کو 19 سال میں جا کر پہلے پیریڈز ہوئے ہیں۔ ان شاء اللہ اب آپ کا سرکل ٹھیک رہے گا۔ آپ پہلے پلان میں سے صرف ڈنر بدلوالیں۔

احمد صدیقی، اسلام آباد سے:

سر آپ کو بہت مبارک ہو، آپ 107 سے 95 کلوگرام پر آئے ہیں۔ آپ کی عمر بہت زیادہ ہے آپ بس آہستہ آہستہ محنت جاری رکھیں۔ جلدی نہ کیجیے گا وہ نقصان دہ ہوگی۔ ان شاء اللہ مطلوبہ کامیابی ضرور ملے گی آپ پلان تبدیل کروالیں۔

آپ سب سے گزارش ہے کہ مجھے کالم کے لیے خط میگزین کے پتے پر لکھیں۔ باری آنے پر جواب مل جائے گا۔ فون پر میں پلان نہیں بتا سکتی، اس کے لیے معذرت ہے۔ کلینک پر ملاقات بھی بغیر اپوائنٹمنٹ ممکن نہیں ہوتی۔ لوگوں نے کئی کئی ہفتے پہلے وقت لیا ہوتا ہے۔ امید ہے آپ میری بات پر توجہ دیں گے۔ شکریہ

اجازت چاہوں گی، اپنی دعاؤں میں مجھے اور میرے اہل خانہ کو یاد رکھیں۔

■■■

قصہ کوئز1

سید ابوالاعلیٰ مودودی مفسر قرآن، عالم دین، جماعت اسلامی کے مؤسس۔ اورنگ آباد، دکن میں پیدا ہوئے، باضابطہ تعلیم صرف میٹرک تک تھی، لیکن خدا داد ذہانت اور اپنی ذاتی محنت اورلگن سے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں اتنی استعداد حاصل کر لی کہ اب ان کی اپنی تصانیف کے تراجم ان زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔صحافتی زندگی کا آغاز سترہ برس کی عمر میں اخبار ''مدینہ'' سے کیا۔ پھر تاج (جبل پور) اور 1921ء تا 1923ء جمعیت العلمائے ہند کے اخبار ''مسلم'' کے مدیر رہے۔1928ء میں ''الجمعیت'' کی ادارت ترک کی اور حیدرآباد دکن چلے گئے۔1932ء میں ''ماہنامہ ترجمان القرآن'' جاری کیا جو آج تک جاری ہے۔ان کی تصنیف الجہاد فی الاسلام اور رسالہ ''دینیات'' نے مولانا صاحب کو بہت جلد پورے ہندوستان میں متعارف کرا دیا۔

(الف) ان کی تاریخ وفات بتائیں اور قبر کہاں واقع ہے؟

(ب) ان کی کوئی سی دو تصانیف کے نام بتائیں؟

قصہ کوئز2

شاعر، افسانہ نگار، مدیر 20 نومبر 1916ء کو موضع ڈنگہ ضلع خوشاب میں پیدا ہوئے۔ خاندانی نام احمد شاہ اور والد کا نام پیر غلام نبی تھا لیکن ''چن پیر'' کے نام سے معروف تھے۔قرآن مجید کی تعلیم اپنے گاؤں کی مسجد میں حاصل کی۔ میٹرک 1931ء میں شیخوپورہ سے اور بی اے 1935ء میں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے کیا۔ 1939ء میں ملتان کے ایکسائز آفس میں سب انسپکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔1942ء میں مستعفی ہو کر دارالاشاعت پنجاب لاہور سے وابستہ ہو گئے اور یوں ہفت روزہ ''پھول'' اور 'تہذیب نسواں' کی ادارت سنبھالی۔ 1944ء میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''بو'' ادب لطیف میں شائع کرنے پر مقدمہ چلا مگر بری ہو گئے۔ آپ کی شاعری کے نو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

(الف) کن صاحب کا ذکر ہے۔ نام بتائیں؟

(ب) ان کی کوئی سی دو شاعری کتب کا نام بھی بتائیں؟

قصہ کوئز3

پاکستان کی پہلی پرائیویٹ یونیورسٹی حکومت پاکستان نے 16 مارچ 1983ء کو منظوری دی۔ باقاعدہ افتتاح 1985ء میں ہوا، اس یونیورسٹی کا مقصد نئے سائنسی علوم کا فروغ اور ترقی پذیر ممالک کو پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے انسانی وسائل کی ترقی ہے۔ یونیورسٹی کی پہلی فیکلٹی طب ہے، چنانچہ طبی خدمات کی تنظیم یوں کی گئی ہے کہ ایک میڈیکل کالج قائم کیا گیا ہے اور ایک نرسنگ اسکول۔ کالج کا بنیادی مقصد ڈاکٹروں اور سرجنوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ فی الحال ایم بی اور بی ایس کے لیے پانچ سالہ نصاب کے مطابق تعلیم و تربیت کا منصوبہ جاری ہے۔ یونیورسٹی کیمپس میں ایک ہسپتال بھی قائم کیا گیا ہے جس کا الحاق ایک معاہدے کے تحت یونیورسٹی سے ہو چکا ہے، مگر اس کا نظم و نسق جداگانہ مجلس کے سپرد ہے۔

(الف) کون سی یونیورسٹی کا تذکرہ ہے یہ کون سے شہر میں واقع ہے؟

(ب) یہ یونیورسٹی کب اور کس کے دور حکومت میں قائم ہوئی؟

انعامات کے لیے تعاون

منشورات

خوبصورت اور معیاری کتب، کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ، ملتان روڈ لاہور

042-35434909

042-35425356

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

آپ نے یہ کیا کیا؟

اپریل 2013ء کا اردو ڈائجسٹ میرے سامنے رکھا ہوا ہے اور آپ کا لک کھا ہوا E دار یہ پڑھ کر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔

آپ نے بہت اچھا کیا کہ الفاظ کو کچھ موٹا کر دیا مجھ جیسے بوڑھے ناکارہ لوگ بھی اب آسانی Say تحریر کو پڑھ لیتے ہیں۔(ڈاکٹر مسعود حسین لاہور)

(مسعود صاحب! ہم نے تو آپ کے لیے آسانی کر دی مگر آپ کے خط نے ہمیں مشکل میں ڈال دیا۔ اردو زبان تو پہلے ہی حالت نزاع میں ہے۔ رومن میں لکھے گئے اردو، ایس ایم ایس، اشعار اور تحریریں زبان اور بیان کی خوب صورتی کھائے جا رہی ہیں۔ آپ تو سیانے آدمی ہیں۔ اپنے خطوط میں آپ اردو کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں اس پہ ہم کیا کہیں؟)

چھٹی جماعت کے طالب علم کی خواہش

میں چھٹی جماعت کا طالب علم ہوں۔ میں ایک میڈم کے پاس ٹیوشن پڑھنے جاتا ہوں۔ وہ مجھے اردو کی کہانیاں اور رسالے پڑھنے کو دیتی ہیں۔ انھوں نے مجھے دسمبر 2012ء کا اردو ڈائجسٹ پڑھنے کو دیا صفحہ 125 پر سپاہی مقبول حسین کی کہانی پڑھی۔ دل پر بہت اثر ہوا۔ پاکستان کے لیے اس طرح کے لوگ بہت قیمتی ہیں۔ ان کی قدر کی جانی چاہیے۔

میں سپاہی مقبول حسین سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کی بہت مہربانی ہو گی اگر آپ مجھے ان کا پتا بھیج دیں۔ ابھی میری عمر 13 سال ہے اگر میں ان سے ملنے نہ جا سکا تو کم از کم انھیں خط ضرور لکھ دوں گا بہت مہربانی ہو گی۔

(شیراز احمد خان۔ اسلام آباد)

(بیٹے شیراز! آپ کے جذبات کی ہم قدر کرتے ہیں۔ آپ اپنا

خط ISPR اسلام آباد کی معرفت بھجوادیں۔ وہ ان تک پہنچادیں گے)

حیا کی علامت کو مٹا کر کیا ہوگا؟

آج کل ترقی کا زمانہ ہے اور ترقی نے نہ صرف ہمارے لباس اور طرز رہائش بدل کر رکھ دی ہے بلکہ ہمارے خیالات تک بدل دیئے ہیں۔ ترقی اور فیشن کے نام پر اب ہم اچھے کو برا اور برے کو اچھا کہنے لگ گئے ہیں۔ بے چارے دوپٹے کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ ایک طبقہ اسے آؤٹ آف فیشن قرار دے کر اس سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ دوپٹے کے بنا عزت حاصل کرنے نکلنے والی لڑکیاں یہ بات فراموش کر بیٹھی ہیں کہ دوپٹا انہی کی عزت اور حیا کی علامت ہے۔ اس علامت کو مٹا کر کیا ملے گا؟

ہم کیوں اپنی اسلامی تعلیمات کو بھلا کر عزت کو دوپٹے کے بنا حاصل کرنے چلی ہیں۔ آخر کیوں پردہ کو فراموش کیے بیٹھی ہیں اور بازاروں میں ننگے سر پھرنا اپنا شعار بنالیا ہے۔ (شائلہ عبدالستار۔ بھکھی شیخوپورہ)

پوچھنے کی جسارت

مبشر الحق عباسی صاحب اچھی دریافت ہیں، آم اور تربوز نگر کے نام سے طنز و مزاح کے ذریعے معاشرتی رویوں کو خوب صورت انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ بہترین تحریر لگی۔ کچھ لوگ شاید اس طنز و مزاح سے ہی اپنے آپ میں بہتری لے آئیں۔ حیرت ہے اس جدید دور کی جدید سہولیات کے ہوتے ہوئے واخان کے باشندے ہر دنیاوی سہولت سے محروم ہیں۔ ان کے ہاں۔ آج کے دور میں اکائی بھیڑ تسلیم کی جاتی ہے اور کاروبار بھی بھیڑ کی قیمت سے کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے لیے نئی بات ہے۔ پوپ بینیڈکٹ کے بارے جو حقائق آپ نے لکھے ہیں وہ چشم کشا ہیں۔ لفظوں کی حرمت واقعی اگر نیت نیک اور ارادہ سچا ہو تو وہ اثر رکھتا ہے۔

(محمد ادیس دانش خانزادہ راجپوت۔ سکردو)

کچھ ہم پر بھی لکھ دیں

آداب عرض ہے۔ میں عرض گزار مُرلی چند، گوپی چند گھوگھیہ سکنہ شکارپور جناب کی خدمت عالیہ میں مودبانہ گزارش کرتا ہوں کہ آپ اپنے رسالے میں ہم لوگوں کے رہن سہن، پسند ناپسند پر بھی ضرور کچھ دیں۔ میں اردو ڈائجسٹ منگوا کر پڑھنا چاہتا ہوں۔

آپ سے ہو سکے تو ہماری رہنمائی کریں۔ ہمیں گائیڈ لائن دیں کہ ہم کیسے اپنی زندگی کو بہتر کریں۔

ہم ہر شمارے میں کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کو بہتر کرنے والی باتیں اور تحریریں ضرور شامل کریں۔

(مُرلی چند، گوپی چند گھوگھیہ۔ شکارپور)

اُردو ڈائجسٹ کی تیاری کے دوران پروف خوانی کی میری ذمہ داری ہے۔ ہمارے ہاں زبان و بیان کے لئے بہت بحث و مباحثے اور تحقیقی جستجو کا پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جیسے ایک لفظ ہے مزا، اس کو مزہ بھی لکھا جاتا ہے۔ ڈکشنریاں دونوں الفاظ کو ٹھیک مانتی ہیں۔ اس ماہ ایک لفظ آپ پڑھیں گے اش اش کرتا۔ یہ پہلے عش عش کرنا لکھا جاتا تھا مگر یہ اش اش کو زیادہ بہتر مانا جاتا ہے۔ کا، کے کی، کی غلطی رہ جائے تو اس پر معذرت قبول کیجیے۔ کوشش ہماری یہی ہے کہ جس قدر انسانی سباط میں ہے غلطی نہ ہو۔ بعض احباب تو زندگی میں حرف کی غلطیاں نکالنے کے شن پر معمور ہیں۔ براہ کرم غلطی ہو تو کسی ڈکشنری کا حوالہ ضرور دیں تاکہ ہم بھی اصلاح کر سکیں۔ (کلیم اللہ فاروقی پروف خواں)

دلچسپی کے موضوعات

اپریل 2013ء میں مینیجنگ ایڈیٹر صاحب نے قارئین سے ان کے پسندیدہ موضوع کے بارے تجویز طلب کی تھی اور لکھا کہ موجودہ موضوعات کے علاوہ آپ کی دلچسپی کے کون سے موضوعات کو اردو ڈائجسٹ کے صفحات کی زینت بننا چاہیے۔ یہ پڑھ کر انتہائی خوشی ہوئی کہ آپ قاری کو اپنے ساتھ ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ آپ ہر ماہ دلچسپ سفر نامہ، جرم و سزا پر مبنی تفتیشی اسٹوری، پاک نبی ﷺ کی پیاری پیاری سحر انگیز باتوں، مہم جوئی اور پاکستانی ادب پر مبنی مضامین ضرور شامل کر لیا کریں۔

(غلام نبی عارف، ریٹائرڈ بینک آفیسر۔ لیہ)

ناخوشگوار واقعات فراموش نہ کریں

نیلم احمد بشیر کے افسانے ''قیمتی گھڑی'' کی تحسین نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ فاضل مصنفہ اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورتی سے اچھوتے خیالات کو اجاگر کرتی ہیں۔ زیر نظر افسانہ بھی ان کے ''ندرتِ خیال'' کا مظہر ہے اور ان مظالم کو آشکار کرتا ہے جو تقسیم ہند سے فوراً پہلے (یا بعد میں) مسلمانان ہند پر ڈھائے گئے۔ اب ہمارے کچھ ''روشن خیال'' دانشور (جن کی تعداد مشرف کے دور آمریت میں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے) اسے نفرت کا پرچار کہتے ہیں۔ کیا تاریخ اور سچائی کو من و عن بیان کرنا نفرت کا پرچار ہے۔

انگریزی زبان کی ایک کہاوت ہے کہ بے شک آپ ناخوشگوار واقعات کو معاف کر دیں۔ لیکن ان کو فراموش نہ کریں۔ (انجینئر انور)

انٹرویوز کا اعلان

اگر آپ کا کسی بڑی شخصیت سے انٹرویو لینے کا ارادہ ہو تو ایک مہینا پہلے اعلان کے ذریعے قارئین کو مطلع فرمائیں کہ آئندہ شمارے میں فلاں صاحب کا انٹرویو شائع ہوگا، قارئین اپنے سوالات جلد از جلد ارسال فرمائیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ قارئین کی دلچسپی بھی بڑھے گی اور مختلف سوالات کے جوابات اور حقائق سامنے آئیں گے۔ سر! آپ کو ہم کس وقت فون کر سکتے ہیں۔ تحریر کے حوالے سے اور میگزین کے حوالے سے مشورہ اور معلومات حاصل کرنے کے لیے کیونکہ میں خود ایک رسالہ ''فلاح امت کوئٹہ'' کا مدیر ہوں۔ اگر آپ رہنمائی فرمائیں گے تو ہماری حوصلہ افزائی ہوگی؟

(محمد افضل کاسی۔ کوئٹہ)

(جناب امجد اسلام امجد، مستنصر حسین تارڑ، انور مسعود، سہیل وڑائچ ہماری آئندہ فہرست میں ہیں اور دوپہر 2 بجے سے 5 بجے تک آپ فون کر سکتے ہیں)

تختۂ مشق

میں معلّم ہوں، سائنس ٹیچر۔ دو سال سے اُردو ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ میری شادی کو دو ماہ ہوئے ہیں لیکن اس دوران جب بھی رسالہ ہاتھ میں آیا۔ بس اسی میں کچھ ایسے ڈوب گیا کہ ساحل کی کچھ خبر نہ رہی۔

ہماری بیگم کو ہمارا یوں مطالعہ میں غرق ہونا نہ بھایا۔ جیسے ہی تازہ شمارہ آیا ہم حسب سابق غوطہ خوری کی تیاری کرنے لگے۔ بیگم آخر بول ہی اُٹھیں ''اُردو ڈائجسٹ کو تو آپ نے میرے اوپر سوتن بنا ڈالا۔'' ہم سے بھی نہ رہا گیا اور ہم نے کمال دلیری سے کہہ ڈالا ''بیگم آپ کو آئے دو ماہ ہوئے جبکہ اُردو ڈائجسٹ دو سال سے آرہا ہے۔ سو آپ ہی فیصلہ کریں سوتن آپ ہیں یا اُردو ڈائجسٹ۔''

میں خود بھی کچھ لکھنے کا سوچ رہا ہوں۔ تختۂ مشق

آپ کے رسالہ کو ہی بنائیں گے۔

(خرم شہزاد ایس ایس ٹی۔ ضلع چکوال)

(''ہمیں تختہ مشق بنانے کا آپ کا ارادہ ہم تک دھمکی کی صورت پہنچا ہے۔ ٹھیک ہے بھائی! آپ بھی شوق فرمالیں۔'')

لائنوں میں اضافہ

کافی عرصہ سے آپ کو خط لکھنے کا سوچ رہا تھا۔ مگر وقت کی قلت کی وجہ سے اپنی سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ آپ نے رسالہ میں کتابت جلی کر کے لائنوں میں ذرا سا وقفہ دے اور الفاظ کی جسامت کو بڑھا کر رسالہ مزید خوبصورت کر دیا ہے جس سے میرے جیسے بڑی عمر والے بھی عینک کے ساتھ باسانی پڑھ سکتے ہیں۔

(چوہدری خدمت حسین وقار ایڈووکیٹ۔ گوجرانوالہ)

کم سنی میں کثرت سے اموات

ہمارے پہاڑی علاقے میں بچے کم سنی میں ہی ہائپوتھائیرائڈ (Hypothyroid) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میرے اپنے گاؤں میں بے شمار بچے اس مرض میں مبتلا ہیں لیکن نہ تو کسی کو کسی طریقہ علاج کا پتا ہے اور نہ کسی ہسپتال کے بارے میں معلومات ہیں۔ بلکہ لوگ تو سرے سے اس کو بیماری سمجھتے ہی نہیں اور یہ بچے نیم پاگل حالات میں ہی جوانی اور بڑھاپے کی منازل طے کر لیتے ہیں۔ ایسے بچوں سے صرف دعائیں ہی کروائی جاتی ہیں اور وہ معاشرے کا ایک ناکارہ وجود بن کر رہ جاتے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ اس موضوع پر کسی مستند ڈاکٹر سے معلومات حاصل کر کے اپنے رسالے میں شائع کریں اور طریقہ علاج، اس کی نشانیاں اور کہاں اس مرض کے ڈاکٹر پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر راولپنڈی اور پشاور میں شائع کریں۔ (شگفتہ رحمان۔ راولپنڈی) (ہمارے معزز قارئین میں سے کوئی اس موضوع پر یہ بات کرنا چاہے یا رہنمائی دینا چاہیں تو یہ صفحات حاضر ہیں۔)

ایک طرف بیوی

اُردو ڈائجسٹ کے نئے شمارے کے تین بنیادی مزے ہوتے ہیں:

1۔ نیا شمارہ پلاسٹک کے لفافہ میں دیکھنا۔ 2۔ نئے شمارے کو چمکتے لفافے سے باہر نکالنا اور اس کے وجود کے لمس کو محسوس کرنا۔ 3۔ تازہ شمارے کی خوش بو اور منفرد تحریروں کا مطالعہ شروع کرنا۔

ہوسکتا ہے دیگر قارئین کو میری بات سے اتفاق نہ ہو لیکن میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ میں تحریر کو محسوس کر کے چکھتے ہوئے پڑھتا ہوں۔ تازہ چھپائی اور ''مطبوعہ خوشبو'' کا اپنا ہی مزا (سواد) ہے۔ جناب! مئی کا شمارہ اپنے جلو میں تمام تر دل چسپیاں سمیٹے سنجیدہ، نیم مزاحیہ، طبی، فکری تحریروں پر مشتمل رہا۔ سرورق سے جاپانی سفیر مسٹر توشی کازو ایسوموراکے خیالات سے آگاہی ہوئی۔ موصوف کی بات دل کو لگی کہ ''پاکستان میرا دوسرا گھر ہے۔'' اس ایک جملہ میں لفظ ''گھر'' اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ موجود ہے کہ ''گھر'' کو گھر سمجھنا چاہیے وہ جو اپنے جاوید منظر نے کہا تھا:

گھر کو جب گھر ہی نہ سمجھیں گے میرے گھر والے
پھر تو کچھ روز میں آجائیں گے باہر والے

مجھے مسٹر ایسوموراکی باتیں اچھی لگیں۔ جناب الطاف حسن قریشی کی ''مستحکم حکومت کے لیے دور رس حکمت عملی'' نے واقعی ملکی سیاسی آب و ہوا کو شفاف رکھنے میں غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور ''فیصلہ کن لمحات'' کا بہترین تجزیہ پیش کیا ہے۔ رسالے کا ایک اور دلچسپ سلسلہ ''ماہ رواں کی شخصیات'' کا ہے، جس میں انتہائی تحقیق کے بعد دنیا بھر کی شخصیات کی تاریخ

پیدائش و وفات کا پتا چلتا ہے۔ مدیر صاحب چونکہ ''بہتر سے کم'' پڑھانے پر راضی نہیں ہوتے اس لیے جناب نوید غازی کو چار محدود صفحات میں جید شعرا، اُردو کا تعارف کلام پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس میں ''غازی'' صاحب ''غازی'' ثابت ہو جاتے ہیں۔ اس ماہ پروین شاکر، احمد ندیم قاسمی (عمو)، فیض احمد فیض (فیض صاحب)، مجید امجد، مرزا غالب (مرزا نوشہ)، علامہ اقبال (شاعر مشرق) اور امجد اسلام امجد (دو امجدوں کے درمیان اسلام) جیسے ماہر شعرا کرام کا کلام پیش کیا گیا، مزا آ گیا!

طب و صحت کے حوالے سے نئے شمارے میں دو مضامین موجود ہیں، ورزش کے سات سچ، ڈاکٹر نصیر علی کے قلم سے اور دوسرا مقبول سلسلہ 'ڈائیٹ پلان' جسے محترمہ نوشین ناز صاحبہ تحریر کرتی ہیں۔ ڈائیٹ اور ڈائیٹ کے حوالے سے اس سلسلہ میں نہایت مفید باتیں بیان کی جاتی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر فربہ اندام اجسام ''نازک اندام'' ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اس دور میں ہر علم 'عمل' بھی مانگتا ہے اور انٹرنیٹ کی دنیا نے معلومات کے خزانے لٹا دیے ہیں، اس لیے نوشین ناز عملی طور پر بھی اپنے بیان کو ثابت کرتی ہیں۔ اس ماہ ان کا کالم گزشتہ ماہ کی غیر حاضری کے بعد موجود ہے ''ڈائیٹ پلان ہر ایک کے لیے مختلف ہوتا ہے'' بالکل جیسے ایک 'عمل' تمام 'مفعولین' کے لیے نہیں ہوا کرتا، ایک ہی وظیفہ 'جز' اور 'کل' میں تفریق رکھتا ہے اور اسی طرح ڈائیٹ پلان بھی اپنے اندر انفرادیت رکھتا ہے۔ میری بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر صاحبہ کے مشوروں پر عمل کر کے اپنے معالج کا ایک حیران کن جملہ بھی کمایا ''ناہید تم نے تو کمال کر دیا، کون سے غیر ملکی ڈائیٹ پلان پر عمل کر رہی ہو؟'' وزن 59 کلوگرام تک کیسے لے آئیں؟ کسی کمزوری کے بغیر، تازگی و شادابی برقرار۔ ناہید مجیب نے اردو ڈائجسٹ کا مئی شمارہ پکڑا دیا، اسی وقت 'جم' میں اس کے صفحات 257 سے 260 کی عکسی نقول تیار کی گئیں، جو صاف نہ آسکیں تو گلبرگ ٹاؤن سے تازہ پرچہ منگوایا گیا، جو پندرہ مئی کو بمشکل ایک ہی مل سکا، کیونکہ نصف مہینا میں پرچہ ختم ہو جاتا ہے۔ کیل مہاسوں کے حوالہ سے بھی عمدہ تحریر پڑھنے کو ملی۔ مینیجنگ ایڈیٹر جناب طیب اعجاز قریشی کی تحریر اور چار عدد انتخابات پڑھ کر لطف اٹھایا۔ ''مومو'' کا تعارف تشنہ ہی رہا۔ ''غزہ میں پہلا قدم'' اپنے روایتی حسن و ادا کے ساتھ براجمان تھا۔

تصحیح

سنیئر جاپانی سفارت کار جناب ایسوموراکا پورا نام توشی کازو ایسوموراہے۔ تصحیح کے لیے جناب مُشتاق معینی کا شکریہ۔

جناب احمد ندیم قاسمی پر خصوصی گوشہ

آئندہ شمارے میں انشاء اللہ العزیز ملک کے معروف شاعر اور، افسانہ نگار جناب احمد ندیم قاسمی کی 7ویں برسی کے موقع پر ایک خصوصی گوشے کی اشاعت کا پروگرام ہے۔ اُن کی شخصیت سے فیض پانے والے۔ ان سے تربیت حاصل کرنے والے اصحاب و احباب اپنی تحریریں اس طرح ارسال کریں کہ ہمیں 10 جون تک ضرور مل جائیں۔

درِ دل پہ دستک

اختر عباس

urdudigest.pk

akhterabas@ymail.com

اسرائیل کی ہیبرو یونیورسٹی کا حیران کن کام

"اتنی روشن، خوشگوار اور خوب صورت صبح کم ہی دیکھنا نصیب ہوتی ہے۔" بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس سے صبح کی سیر کے لئے نکلتے ہوئے میں پروفیسر علی اصغر سلیم سے کہہ رہا تھا، جب اچانک گیٹ پر ممتاز مفتی کے صاحبزادے عکسی مفتی سے سلام دعا ہوگئی۔ وہ اُن دنوں تھر سے گیت اکٹھے کر چکنے کے بعد روہی سے لوک داستانیں اور لوک گیت جمع کرنے کے مشن پر تھے۔ ڈیرہ یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں تھا اور روز دور دراز کے سفر کے بعد دن کا اختتام یہیں پر ہوتا۔

یہ چند سال پہلے کی بات ہے۔ میں زکریا یونیورسٹی میں خواجہ مظہر نواز صدیقی، عمر رحمان اور محمد فاروق ملک کی دعوت پر شعبہ جرنلزم اور شعبہ پولیٹیکل سائنس کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں ایک خصوصی لیکچر دینے کے لئے ملتان آیا ہوا تھا۔ لیکچر میں دونوں شعبوں کے طلبہ وطالبات اور اساتذہ شریک تھے۔ ڈاکٹر علقمہ (خواجہ خیرالدین کے صاحبزادے اور خواجہ ناظم الدین سابق وزیراعظم پاکستان کے بھتیجے) ان دنوں امور طلبہ کے انچارج بھی تھے اور صدر شعبہ بھی۔ (آج کل جامعہ کے وائس چانسلر ہیں) انھوں نے تعارفی کلمات کہے۔ گفتگو کے دوران اور بعد میں بہت سے دلچسپ سوالات اٹھائے گئے مگر یہ ایک دن پرانی بات تھی۔ اس صبح جب ہم سیر کیلئے نکلے تو دو تین سینئر اساتذہ کی رفاقت بھی میسر آ گئی۔

"لاہور میں زیادہ رات گئے تک جاگنے اور کام کرتے رہنے کے باعث ہماری تو صبح کی تازگی، خوبصورتی اور خوشگواری بھی اکثر قضا ہو جاتی ہے۔ آپ لوگوں کے مزے ہیں، سوچتے ہیں، سمجھتے ہیں، غور کرتے ہیں، پڑھاتے ہیں اور پھر ڈھیر سارا گھروں پر آ کر پڑھتے ہیں۔" میں نے خوش دلی سے خوش گمانی کی بنیاد پر ان کی تحسین کی۔

پروفیسر سلیم صاحب نے مسکرا کے کہا: "آپ کو اساتذہ اور پھر یونیورسٹی اساتذہ کے بارے میں یہ غلط فہمی کیوں ہے کہ ان میں سے اکثر سوچتے بھی ہوں گے اور گھروں پر آ کر پڑھتے بھی ہونگے۔ ہماری زندگیاں بچپن اور جوانی کی سنی ہوئی باتوں، اخباروں کے بے روح کالموں میں درج جھوٹی سچی معلومات اور معاشرے میں بنی ہوئی Myths کے ساتھ بڑھاپے کے گھاٹ اتر رہی ہیں۔ کاش آپ کا گمان ہمارے بارے میں اتنا تصوراتی نہ ہوتا۔" تب ہم پروفیسرز کالونی کے ساتھ ہی واقع وائس چانسلر کے گھر کے پاس سے گزر رہے تھے، میں نے بوجھل ہوتی گفتگو سے بچنے کے لئے موضوع بدل کر ہم قدم اور ہم راہی ایک بزرگ استاد سے پوچھ ڈالا: "سر! کل کا سیمینار کیسا رہا؟' جواب دینے والا کوئی عام آدمی یا ٹیچر نہیں، شعبہ صحافت کا نامور استاد، سابق چیئرمین اور گریڈ 20 کا پروفیسر تھا۔ وہ ماتھے پر بل ڈال کر تیز تیز چلتے ہوئے بولے: "سنا ہے کل آپ نے اسرائیل کو بہت پروجیکٹ کیا ہے، اس بات کو ہمارے کئی اساتذہ نے نوٹ کیا۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے کہ آپ نے ہمارے حکومتی موقف سے ہٹ کر بات کی۔ آپ کو چونکہ یونیورسٹی لاء کالج کی دوسری تقریب میں جانا تھا، اس لئے بات نہ ہو سکی۔"

اس بات کو ہوئے کئی سال بیت گئے۔ مگر وہ صدمہ دل کے کسی کونے کھدرے میں موجود رہا کہ کیا یہ واقعی کسی استاد نے کہا تھا کہ سنے بنا اور سوچے بنا، ایک لمحے کے لئے تصور کر لیں کہ ایسا ہی ہوا تو کیا حکومتی موقف کے علاوہ کوئی سچائی نہیں ہوتی؟ حکومتی موقف بدلتے ہیں تو ساری سچائی کیوں بدل جاتی ہے؟ مشرف دور میں اچانک ہی اسرائیل کے حوالے سے ہمارے اخبارات میں مضامین اور کالموں کا ایک اتوار بازار لگ گیا تھا اور اپنی جڑوں سے محروم کئی سارے لوگ اسرائیل کی حمایت میں بھانت بھانت کی بولیاں بول کر اپنا اور حکومت کا دل خوش کرنے میں لگ گئے تھے۔

یہ بھی وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اپنی پوری عمر نہ خود سے کبھی اسرائیل کے بارے میں غور کیا تھا نہ اس کے بارے میں پڑھا، نہ سوچا، نہ جانا اور نہ کبھی رائے قائم کی تھی۔ پاکستانی حکومت کا بدلا ہوا موڈ دیکھ کر یکا یک یوں لکھنے بیٹھ گئے جیسے کوئی اچانک سوتے میں اٹھ کر بولنا شروع کر دے۔ ایک حربی ماہر نے تو یہاں تک لکھ ڈالا کہ: "ہماری تو اس سے براہ راست دشمنی ہی کوئی نہیں۔ ہم اسرائیل سے صحرا کی کاشت اور شتر مرغوں کی افزائش کے طریقے سیکھ سکتے ہیں۔" ایک ڈینٹل سرجن صاحب بھی حکومتی سربراہ کو اسرائیل، اسرائیل کھیلتے دیکھ کر تالیاں بجاتے اور اپنی عجیب وغریب دلیلوں کے ساتھ داد دینے پہنچ گئے...... آپ ذرا بے دھیانی سے بھی اس دور کے ایسے کالموں کو جمع کر لیں تو پریشانی سے سر پھٹنے کو آ جائے گا اور آپ ایک لمحے کو سوچ میں پڑ جائیں گے کہ "فی الواقع ہم بھی کیا بدقسمت لوگ ہیں۔ اسرائیل جیسے "برگزیدہ" ملک سے اتنے سال تعلقات اور دوستی سے محروم رہے۔ اس سے ہماری کون سی سرحدیں ملتی ہیں۔ اس نے تو کبھی ہم پر حملہ بھی نہیں کیا اور ہماری نالائقی ملاحظہ ہو کہ پاسپورٹ تک پر درج کر دیا کہ اسرائیل نہیں جا سکتے اور دنیا کے جس ملک میں چاہے، چلے جاؤ۔"

مرغ باد نما...... یا "چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی" قسم کے لفظ کبھی متروک اور بے معنی نہیں ہوتے، سہاگن وہی، جو پیا من بھائے۔ سو ایک دوڑ تھی جو جاری تھی۔ انھی دنوں اچانک دفتر خارجہ کا شرمناک بیان آیا کہ "غزہ پر اسرائیل کی بمباری پر ہم مذمت نہیں کریں گے۔" یہ اسرائیل اور حماس کا اندرونی معاملہ

ہے۔ دلیل زوردار تھی، رائج ہوگئی بلکہ سکہ رائج الوقت ٹھہری۔ وزیرستان اور شمالی علاقہ جات پر امریکی فوج نے حملہ کیا تو بھی ایسے ہی بیان سوچے گئے جاری کرنے کا حوصلہ البتہ نہ بن پایا۔ انہی دنوں پاکستان نے چار سو سے زائد ہنستے کھیلتے، قہقہے لگاتے، ہندوستانی وا ہگہ پر واپس کیے۔ جواباً جو کٹے پھٹے، پاگل ذہنی معذور اور ادھورے لوگ انڈیا نے دیے، ہم ان کو بھی یہ کہہ کر پی گئے کہ یہ انڈیا اور ان قیدیوں کا باہمی معاملہ تھا۔

بات دور نکل گئی، چونکہ ہر قومی پالیسی پر یوٹرن کے اس موسم میں دلیل اتنی ''شاندار اور زوردار'' تھی کہ دینے والے ذرا نہیں شرمائے تھے۔ اس لئے ضروری ہوگیا تھا کہ تاریخ کے ریکارڈ میں تو اس کی تحسین کر ہی دی جائے۔

مجھے ملتان یونیورسٹی کے وہ پروفیسر صاحب بھی اس طرح یاد آئے کہ، جنھوں نے میرے لیکچر کو اسرائیل کی پروجیکشن قرار دیا تھا، اگر وہ گواہی دینے پر آمادہ ہوں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسرائیل کی سپورٹ میں عوامی سطح پر (ذرا مبالغہ کر لیں تو انٹلکچوئل سطح پر) وہ پہلا اظہار تھا۔

ویسے اللہ معاف فرمائے، اس تہمت سے پہلے، آپ وہ بات پڑھ لیں، جو وہاں کہی تھی اور جس پر یہ الزام سہنا پڑا۔ میں نے کہا تھا: ''دنیا بھر کی یونیورسٹیاں اپنے طلبہ کو سوچنا اور لکھے لفظوں کو چیلنج کرنا سکھاتی ہیں۔ فرائڈ کی تعلیمات کو آپ کے کسی بندے نے نہیں اس کے اپنے شاگرد ''یانگ'' نے چیلنج کیا اور ادھیڑ کر رکھ دیا۔ آپ آج بھی فرائڈ کا نام لیے جاتے ہیں۔ سوچ سمجھے بنا ہر رشتے کو سیکس کی بنیاد پر جانچے جا رہے ہیں یہ پڑھا ہی نہیں کہ اس کے شاگرد نے کس قوت سے تردید کی اور کہا کہ جس لڑکی کو بنیاد بنا کر تھیوری گھڑی گئی۔ وہ اس کی سیکریٹری تھی اور بالکل نارمل تھی کیونکہ سلیبس سے ہٹ کر کچھ پڑھتے سوچتے ہی نہیں۔ ایک چھوٹے سے ملک کی چھوٹی سی یونیورسٹی کے اساتذہ ہی کی مثال لے لیں۔ اسرائیل کی ہیبرو یونیورسٹی کے دو مطالعاتی کیس بہت معروف ہوئے ہیں۔ جس طرح دنیا میں اسرائیلی الیکٹرانک انجینئرز کا بڑا نام ہے اور جہاز چاہے امریکا میں بوئنگ کمپنی بنائے یا کوئی دوسرا، اس کا تکنیکی اور الیکٹرانکس کا سارا کام اسرائیلی مہارت سے مکمل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہیبرو یونیورسٹی کا شعبہ تقابلِ ادیان غور و فکر کے لیے بڑا مشہور ہے۔ کئی سال پہلے جب Comparative Study کے دوران وہاں کے طلبہ اور پروفیسرز قرآن پاک کی اس سورۃ پر پہنچے جس میں حضرت داؤد علیہ کا ذکر ہے تو لحنِ داؤدی کی تاثیر اور قوت کے بارے میں اس بات پر بحث کا آغاز ہوگیا اور یہ کہا گیا ہے کہ ان کی آواز کی خوبصورتی کے باعث چرند پرند بھی مسحور ہو جاتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا علاقہ سرسبز ہوگا۔ سبزے کے لیے پانی ضروری ہے، پانی ہوگا تبھی تو چرند اور پرند بھی ہوں گے اور جو علاقہ حضرت داؤد علیہ السلام کی بعثت کا ہے وہ اسرائیل اور شام کی سرحد کے دونوں طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس بنجر اور بے آب و گیاہ وادی میں سبزہ اور چرند پرند کہاں سے آگئے۔ ماہرین نے انکار کرنے کی بجائے تحقیق و جستجو کے لیے جیالوجی اور سروے آف اسرائیل کے ذمہ دار شعبے کو کیس بھجوا دیا۔ کچھ عرصے بعد متعلقہ محکمے نے اس خطے میں ایک پرانے مٹی کے بند کے آثار ڈھونڈ لیے۔ اسی بند کو دوبارہ سے تعمیر کیا گیا۔ بارش کا پانی اس پورے علاقے میں زراعت اور کاشت کے لیے استعمال

ہونے لگا تو خطے کی شکل ہی بدل گئی۔ سبزہ، خوبصورتی اور پیداوار۔ اس سے متصل فلسطینی پٹی اور شام کی پٹی بالکل ویرانی اور بیابانی کا نظارہ پیش کرتی ہے۔ اسی طرح تقابل ادیان کے شعبے نے دوسرا کیس بھیجا کہ قرآن میں ہے کہ قومِ عاد پر عذاب اس طور پر آیا کہ زمین سے آگ کے بڑے بڑے ستونوں نے انھیں گھیر لیا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ کوئی اور ہوتا تو انکار کر دیتا۔ انھوں نے پھر جستجو کی، قومِ عاد کے علاقے کا تعین کیا گیا۔ اسرائیل انبیاء کی سرزمین رہا ہے۔ جیالوجی والوں نے وہاں سے کئی قسم کی گیس کے ذخائر ڈھونڈ لیے۔ گیس جب زمین سے نکلتی تو فوارے کے پانی کی سی قوت کے ساتھ۔ عراق میں ہم نے تیل کے کنوؤں سے نکلنے والی تیز پھواروں کو آگ لگے، جلتے ستونوں کی طرح کھڑے دیکھا۔ وہاں گیس کو قدرت نے آگ لگا کر عذاب کی شکل دی تھی۔ اب وہاں سے گیس پورے ملک کو سپلائی کی جاتی ہے۔''

یہ واقعات بتا کر میں نے ایک سوال اٹھایا تھا کہ یہ جو ہمارے دشمن اور ناپسندیدہ لوگ ہیں وہ ہماری ہی کتابوں اور احکامات پر ہم سے زیادہ غور کرتے ہیں اور روحانی نہ سہی پوری طرح سے دنیاوی فائدے اٹھاتے ہیں۔ ہمیں انھیں برا کہنے سے ہی فرصت نہیں ملتی یوں سوچنے کا سارا کام رہ جاتا ہے کہ وہ آگے کیسے بڑھ گئے؟ مہارتیں اور علوم ان کے آگے ہاتھ باندھ کر کیوں کھڑے ہو گئے؟ یونیورسٹیاں تو سوچنے اور رہنمائی دینے کے لیے بہترین جگہ ہو سکتی ہیں، ہماری یونیورسٹیوں میں سوچ کا یہ انداز کیوں نہیں رواج پا سکا؟

اس منظر نامے کو یونیورسٹی طلبہ اور اساتذہ کے سامنے اسی لیے رکھا تھا تاکہ وہ اس پر اپنی اپنی سطح پر غور کریں اور اپنی پڑھائی کی مثبت اور مفید جہتوں کو دریافت کریں، مگر استاد محترم نے اسے اسرائیلی پروجیکشن کا عنوان دے دیا۔ کیونکہ تب پوری قوم کا مائنڈ سیٹ یہی تھا کہ اسرائیل کا نام لینا اور تعریف کرنا ہی قریباً حرام تھا حتیٰ کہ دانشور اور استاد تک اپنے طور پر سوچنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس واقعے کے کچھ بعد ہی اسرائیل کی محبت کی سرکاری ہوائیں چلنے لگیں اور پھر ہر طرف سے ایسے ایسے دلائل آنے لگے کہ لکھنے والے تو نہیں پڑھنے والے ضرور کہتے الایمان، الحفیظ۔ خدا جانے ہمیں سوچنے کے لیے ہمیشہ اشاروں اور لائن کی کیوں حاجت رہتی ہے۔

دنیا بھر میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے اور وہاں پڑھانے والے دماغ نہیں شہ دماغ کہلاتے ہیں۔ حکومتوں کی راہنمائی ہی نہیں کرتے۔ مستقبل کی حنا بندی بھی کرتے ہیں۔ نئی سوچ کے سوتے وہاں سے پھوٹتے ہیں۔ علوم وہاں جنم لیتے ہیں، وہاں تحقیق کے پکے اصول ہی نہیں اسے معمول کی سوچ کا حصہ بھی بنایا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد پر فیصلے کئے جاتے ہیں

فیصلے اچھے اور بُرے، نیت، ارادے اور وقت کے بروقت یا بے وقت استعمال سے ہوتے ہیں۔ اسی سے ان کو ثمر لگتے ہیں اور اس سے وہ بے ثمر ہوتے ہیں۔ فیصلوں میں مردہ سوچ کے باعث سارے پھل وہیں، کہیں راستے میں گر جاتے ہیں اور لوگ اپنے ماضی اور حال پر جگ ہنسائیوں اور صفائیوں کے لیے رہ جاتے ہیں۔ کیا ہماری اور ہمارے اساتذہ کی زندگیاں ایسے ہی کچھ کیے بغیر بڑھاپے اور ریٹائرمنٹ کے گھاٹ اتر جائیں گی۔

■■■

باتیں دانش کی

رفیدہ کلیم فاروقی

ابنِ رُشد

ابوالولید محمد بن احمد ابن رُشد 14 اپریل 1126ء کو قرطبہ میں پیدا ہوا اور 10 دسمبر 1198ء کو فوت ہوا۔ والد کا نام ابوالقاسم احمد تھا۔ اس نے امام غزالی اور ان کے پیرو متکلمین کے یونانی فلسفے پر اعتراضات کو رد کیا اور ثابت کیا کہ فلسفے کی گہرائی میں جایا جائے تو فلسفے اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں۔ انھوں نے ارسطو کے فلسفے کی تشریح بھی کی۔ مغربی یورپ میں 11ویں صدی عیسوی میں انھیں ارسطو کے شارح کا مقام دیا گیا۔ ان کے خیالات اور افکار یورپی تحریکِ احیائے علوم (Renaissance) کا باعث بنے۔ 1852ء میں جب ارنسٹ رینان کی Averroes et l'averreisme شائع ہوئی تو انگریزوں سے زیادہ فرانسیسی مفکرین نے ابن رشد کے علمی کام کو سراہا۔ ابن رُشد کے علمی کام کی بدولت اہلِ مغرب کو ارسطو اور دیگر یونانی فلسفیوں کے افکار و خیالات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ابن رُشد نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ عیسائیوں اور یہودیوں کے دلوں میں یونانی فلسفے کے متعلق شکوک و شبہات کو دور کیا۔ بعض مسلمان مفکرین اور علما فلسفیوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے لیکن ابن رُشد نے اس خیال کی مخالفت کی۔ اس نے اشاعرہ، معتزلہ، صوفیا اور ادبا کے نظریات کو رد کیا۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ فلسفہ کے بغیر مذہب کے پیش کردہ الوہی نظریات کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

وہ کہتے تھے کہ اسلام ابدی سچائی ہے اور فلسفہ اسی سچائی کی تلاش کا نام ہے۔ ابن رشد اپنے ہم عصر فلاسفہ کی طرح اس خیال سے متفق ہے کہ انسان سات خصوصیات میں اپنے خالق سے مماثلت رکھتا ہے جیسے: علم، زندگی، قوت، ارادہ، سماعت، بصارت اور گویائی۔ اسے مختلف حکمرانوں کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی، مختلف اوقات میں قاضی کے عہدے پر فائز رہا۔ ابن طفیل کی وفات کے بعد وہ ابو یوسف کا طبیب بھی رہا۔ طب پر اس کی لکھی کتاب یورپ کی یونیورسٹیوں میں طب کے نصاب میں شامل رہی۔

کہا ابنِ رُشد نے

1۔ کتابوں کو اپنا ساتھی بناؤ۔ کتابوں کی الماریاں تمھارے باغات ہوں۔

2۔ دانش کی طلب میں پہلا قدم خاموشی، دوسرا بات کو سننا، تیسرا یاد کرنا، چوتھا اس پر عمل کرنا اور پانچواں دوسروں کو سکھانا ہے۔

3۔ لوگوں کے دل جنگلی جانوروں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ ان کی طرف راغب ہوتے ہیں جو ان سے پیار کریں اور انھیں سدھاریں۔

4۔ جب تک الفاظ بولے نہ جائیں تم ان کے مالک ہو، اور جب تم انھیں بول دو تو وہ تمھارے مالک ہیں۔

5۔ ایک عقل مند کے سوال میں آدھا جواب ہوتا ہے۔

6۔ حسد قبر کی طرح ظالم ہے اور اس کے کوئلے آگ کے کوئلے ہیں۔